And Muhammad Is His Messenger
محمد رسول الله
این میری شمل
ترجمہ
نعیم اللہ ملک

محمد رسول اللہ ﷺ

این میری شمل

ترجمہ
نعیم اللہ ملک

ابوذر پبلی کیشنز 241d جرنلسٹس کالونی، لاہور، پاکستان

سرورق خطاطی : خطاط الملک محمد علی زاہد

کمپوزنگ : محمد اکرام الحق، ظہیر عباس

ٹائٹل کور : مدثر علی بھٹی

پرنٹرز : شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

بائینڈنگ : مشتاق برادرز، لاہور

اشاعت اول : ۲۳ مارچ ۲۰۱۴ء

اشاعت دوم : ۱۴ اگست ۲۰۱۴ء

تعداد : ایک ہزار

قیمت : ۸۰۰ روپے

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب

خدا کا شکر ہے کہ حضور رسالت مآب ؐ کی حیات طیبہ پر مبنی ڈاکٹر این میری شمل کی اس کتاب کا اردو ترجمہ کرنے کی سعادت اس خاکسار کے حصے میں آئی ہے۔ اس سے پہلے میں نے شہرہ آفاق برطانوی مصنفہ کیرن آرمسٹرانگ کی لکھی سیرت پاک پر دو کتابوں کا ترجمہ کیا جنہیں قبول عام حاصل ہوا ہے۔ دنیائے علم و ادب میں این میری شمل کے مقام کا اندازہ صرف اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے صرف ۱۹ سال کی عمر میں برلن یونیورسٹی سے اسلامک اسٹڈیز میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔

اس کتاب کو آپ تک پہنچانے میں ان گنت فاضل شخصیات نے میری رہنمائی کی ہے جن میں سے چند ایک کے اسمائے گرامی یہ ہیں: ڈاکٹر معین نظامی، ڈاکٹر شعیب احمد، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر عبدالکریم خالد، صاحبزادہ محمد عبدالرسول اور میرے گاؤں کے قاری منظور احمد۔ کتاب کے لیے اشاریہ مرتب کرنے پر گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کے چیف لائبریرین عبدالوحید خاص طور پر شکریے کے مستحق ہیں۔

اسی دوران کئی ہم سفر ساتھ چھوڑ گئے، میرا دل ان کے لیے بھی ممنون احسان ہے۔

کتاب کی آخری سطریں لکھ رہا تھا کہ دور افق پر طلوع سحر گاہی کے آثار نمودار ہونے لگے اور گاؤں کی مسجد سے یہ آواز آئی: اک میں ہی نہیں شیدا، مشتاق زمانہ ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری اس کاوش کو قبول کر کے اسے میرے والدین کی نجات اور قیامت کے دن میری شفاعت کا ذریعہ بنائے۔

امیدوار رحمت

نعیم اللہ ملک

مراکیوال سیال کوٹ

موسم خزاں ۲۰۱۱ء

ترتیب

پیش لفظ

یہ کتاب پیغمبر اسلامؐ کی ذات گرامی میں میری گہری دل چسپی کا ثمر ہے جو چار عشروں سے زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ جب میں اوائل عمری میں ڈاکٹر ہینس ایلن برگ کی رہنمائی میں عربی زبان کا مطالعہ کر رہی تھی تو رسول کریمؐ کی صوفیانہ زندگی کا مجھ پر گہرا اثر ہوا۔ ان تشکیلی برسوں کے دوران سید امیر علی کی The Life and Teachings of Muhammad یا The Spirit of Islam اور سیرت النبیؐ کے بارے میں تورآندرے Tor Andrae کی Muhammad: The Man and His Faith میری پسندیدہ کتابیں تھیں۔ تورآندرے کی کتاب آج تک میرے لیے بدستور روحانی فیضان کا سرچشمہ ہے۔ برلن یونیورسٹی میں طالب علمی کے زمانے میں میں نے سلیمان چلیبی کی نظم مولود شریف پڑھی جس میں نہایت سادہ لیکن دل نشین انداز میں عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے متعلق مسیحی گیتوں کے طرز پر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ولادت کے بارے میں معجزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ لیکن اس وقت مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ مجھے انقرہ یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات میں مذاہب عالم کے تقابلی جائزے کے مضمون کی پروفیسر کی حیثیت میں ترکی میں پانچ سالہ قیام کے دوران مولود شریف کی کئی محفلوں میں شرکت کے مواقع دست یاب ہوں گے۔ مجھے اس زمانے میں رسول کریمؐ کے ساتھ ترک مسلمانوں کی گہری عقیدت اور محبت کا بخوبی اندازہ ہوا۔ بعد میں برصغیر ہندوپاکستان کے شعری اور صوفیانہ لٹریچر میں دل چسپی کے نتیجے میں مجھے یہ احساس ہو گیا کہ اس صدی کے فلسفی شاعر محمد اقبالؒ کا کلام نبی کریمؐ کی عقیدت کے کس قدر گہرے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ سندھی زبان کے عوامی ادب کے مطالعے نے اس تصویر میں نئے رنگ بھر دیے۔ میں نے رسول اللہؐ کے ساتھ مسلمانوں کی والہانہ عقیدت اور لٹریچر، خاص طور پر شاعری میں اس کے اثرات پر مبنی کئی آرٹیکل لکھے جن میں حضورؐ کے بارے میں محمد اقبالؒ کے عالمانہ افکار اور فہم و ادراک سے مکمل استفادہ کیا گیا۔ میں نے سندھی شاعری میں رسول کریمؐ سے اظہار عقیدت کے علاوہ اٹھارویں صدی کی دہلی کے صوفی شاعر میر درد اور کئی متعلقہ موضوعات پر بھی اظہار خیال کیا۔ چناں چہ اس طرح جو مواد جمع ہوا، میں نے دوسرے ماخذوں کو اس میں شامل کر کے ۱۹۸۰ء میں American Council of Learned Societies کے سامنے ایک لیکچر دیا جسے بعد میں میری کتاب As Through a Veil کے پانچویں باب کے طور پر شامل کر لیا گیا۔ پھر میرے جرمن پبلشر Ulf Diederichs نے میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے ترغیب دی کہ میں اس باب میں توسیع کر کے رسول کریمؐ

سے مسلمانوں کی دلی عقیدت اور وابستگی کے موضوع کو ایک مکمل کتاب کی صورت میں پیش کروں۔ چناں چہ ۱۹۸۱ء میں یہ کتاب شائع ہوگئی۔ یہی وہ کتاب ہے جسے انگریزی قارئین کے لیے پیش کیا جارہا ہے تاہم اس کی ضخامت جرمن ایڈیشن سے بڑھ گئی ہے۔ ہم نے جرمن ایڈیشن کے تصویری خاکوں کو اس کتاب سے حذف کردیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ ان تصویروں کا تعلق قرون وسطیٰ کی اسلامی روایات سے ہے لیکن رسول کریمؐ کے فرضی خاکوں سے جدید دور کے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے اور وہ حضورؐ کی سوانح حیات کو صرف زبانی سننے یا لفظوں کی صورت میں پڑھنے کے آرزومند ہیں۔

اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں بہت سے لوگوں کا حصہ ہے۔ ان میں بھارت اور پاکستان کے وہ قوال بھی شامل ہیں جنہوں نے ناقابل فراموش دھنوں میں پیغمبر خداؐ کی مدح سرائی کی، ان علمائے دین کا بھی حصہ ہے جنہوں نے بعض اوقات حضور سرور کائناتؐ کی ذات گرامی کی ''صوفیانہ'' تشریح پر اعتراض کیا، ترکی اور پاکستان کے دیہات میں رہنے والی ان معمر خواتین کا بھی اس کتاب کی بڑھوتری میں حصہ ہے جن کی پوری زندگی محبوب خداؐ کے ساتھ بے پایاں محبت اور عقیدت میں گزری ہے اور حضورؐ کا عشق ان کے رگ وپے میں سرایت کر چکا ہے۔ ان کے علاوہ اسلامی ملکوں اور امریکا کے وہ طالب علم بھی شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے ایک ایسے منفرد موضوع کے متعلق، جس کا مغرب کے بہت کم لوگوں کو ادراک ہے، مجھ سے سوالات پوچھے اور اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس ضمن میں مجھے اپنے دوستوں اور ساتھیوں، ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ولیم اے گراہم اور کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر پیٹر جے اون کا خاص طور پر شکریہ ادا کرنا ہے۔ ڈاکٹر گراہم نے کتاب کے پورے مسودے کو پڑھا اور قدیم عہد اور احادیث کے متعلق خصوصی طور پر گراں قدر تجاویز دیں۔ ڈاکٹر اون نے یورپ اور ایشیا کے دوروں میں میری غیر حاضری کے دوران ایڈیٹنگ سے متعلق مسئلوں کو حل کرنے میں مدد دی۔ میرے ریسرچ اسسٹنٹ علی ایس عسانی نے کئی کتابوں اور ان کے مصنفوں کی تاریخ کے سلسلے میں مختلف امور کی نشان دہی کی۔ یونیورسٹی آف نارتھ کیرولینا پریس کی کاپی ایڈیٹر لارا اوکس نے کمال مہارت اور ہنرمندی سے اس مسودے کو شائع کیا جو ہارورڈ اور بون میں لکھا اور ٹائپ کیا گیا۔ انہوں نے کئی متضاد اور بے ربط جملوں کی تصحیح کی اور بعض خامیوں کو نہایت خاموشی سے دور کردیا۔ میں ان تمام لوگوں کی بے حد شکر گزار ہوں۔

این میری شمل

کیمبرج، میسے چوسٹ

موسم بہار ۱۹۸۴ء

تعارف

غالباً بارہویں صدی میں مشرقی ایران میں سادہ خطِ کوفی میں لکھے گئے قرآن کریم کے ایک نسخے میں ایک نمایاں خصوصیت موجود ہے۔ اس نسخے میں قرآن کریم کی ۱۱۲ویں سورہ اخلاص کو غیر معمولی طریقے سے نہایت مربوط انداز میں توانا حروف سے لکھا گیا ہے اور ایک دوسرے صفحے پر ''محمد رسول اللہ'' کے الفاظ کی نہایت دل کش پیرائے میں خطاطی کی گئی ہے جس کی وجہ سے یہ حروف باقی صفحے سے بے حد نمایاں نظر آتے ہیں۔ (قرآن حکیم کا یہ نادر نسخہ نیویارک کے میٹروپولیٹن میوزیم آف آرٹ میں رکھا گیا ہے)۔ اس خوب صورت فن پارے میں نامعلوم خوش نویس نے منفرد طریقے سے اسلام میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مرکزی حیثیت کو بھرپور انداز میں پوری طرح اجاگر کیا ہے۔ اس شاہکار کے لیے کلمہ طیبہ کے دوسرے حصے ''محمد رسول اللہ'' کا انتخاب کیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ سرورکائناتؐ ہی کی ذاتِ گرامی ہے جنھوں نے اسلام کو ایک دین کے طور پر متعارف کرایا اور خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے اسلام کے حدود کا تعین کیا ہے۔

آرتھر جیفرے نے ابن عربی کے فلسفۂ رسالت کے موضوع پر ایک آرٹیکل میں لکھا ہے: ''کئی سال پہلے...... شیخ مصطفیٰ المراغی نے مصر میں چرچ آف انگلینڈ کے دوست بشپ سے ملاقات کے دوران کہا تھا کہ مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کا سب سے بڑا عمومی جرم یہ ہے کہ وہ اس بات کو پوری طرح سمجھ نہیں پائے کہ مسلمان رسول کریمؐ کی شخصیت کے ساتھ کس قدر محبت اور عقیدت رکھتے ہیں۔ (جیفرے: ابن عربی کی شجرۃ الکون صفحہ ۲۔ لاہور ایڈیشن)۔

اس نامور مصری عالم دین کا یہ تبصرہ صحیح نشانے پر بیٹھتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دین مسیح کے پیروکار پیغمبر اسلامؐ کے رول کو ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں سکے اور وہ آج بھی اپنی پرانی روش پر چل رہے ہیں۔ عیسائیوں کا یہ طرزِ عمل اسلامی تاریخ اور کلچر کے بارے میں مسلمانوں کی توضیح وتشریح کی تحسین کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ کسی بھی دوسری تاریخی شخصیت کے مقابلے میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات قرونِ وسطیٰ کی مسیحی دنیا میں سب سے زیادہ خوف، نفرت اور کراہت وناپسندیدگی کا باعث بنی رہی ہے۔ دانتے Dante نے جب ڈیوائن کامیڈی Divine Comedy میں حضورؐ کو (نعوذ باللہ۔ مترجم) دوزخ کے سب سے زیریں حصے میں دیکھا تو اصل میں وہ اپنے عہد کے ان گنت عیسائیوں کے جذبات کی ترجمانی کر رہا تھا جو یہ نہیں سمجھ پار ہے تھے کہ عیسائیت کے عروج کے بعد دنیا میں ایک اور دین کس طرح ظہور پذیر

ہوسکتا ہے اور یہ کہ یہ نیا دین اس دنیا میں سرگرم عمل اور سیاسی اعتبار سے اس قدر کامیاب ہے کہ اس کے پیروکاروں نے بحیرہ روم کے ان وسیع علاقوں پر قبضہ کرلیا ہے جو اس سے پہلے مسیحی سلطنت کا حصہ تھے!

قرون وسطیٰ بلکہ جدید یورپی لٹریچر میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شخصیت کو مسخ کرنے کی جو کوششیں کی گئیں، ان کی تفصیلات پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں۔ مغربی دنیا نے اس بلند مرتبت شخصیت کے بارے میں منفی تصویر کشی کی جس نے کرہ ارض پر دنیا کی کامیاب ترین مذہبی تحریک چلائی۔ مغرب نے تاریخ، ڈرامے اور شاعری میں حضورؐ کی شخصیت کا جو گمراہ کن خاکہ پیش کیا، اس کا ثبوت وہ بے شمار ضخیم کتابیں ہیں جو یورپ میں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔

ہمارے اس عہد میں مسلمانوں میں خود شناسی اور خود آگہی کی جو نئی تحریک پیدا ہوئی ہے، اس پر مغرب میں، جہاں طویل عرصے سے اسلام کو ایک قریب مرگ دین سمجھا جاتا ہے، سخت حیرت کا اظہار کیا جارہا ہے البتہ مسلمانوں میں شعور و آگہی کے اس نئے احساس کی بدولت مغرب اسلام کے بعض بنیادی مذہبی اور سماجی نظریات پر دوبارہ غور کرنے پر مجبور ہوگیا ہے۔ یورپ کی ان کوششوں کا مقصد ان اعلیٰ اقدار کی بہتر تفہیم پیدا کرنا ہے جو مسلمانوں کو دل و جان سے عزیز تھیں اور جن کو مسلمانوں کی زندگی میں اب بھی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس سے ہماری یہ کاوش حق بجانب معلوم ہوتی ہے جس کا مطمح نظر یہ ظاہر کرنا ہے کہ متقی اور پرہیزگار مسلمانوں کو صدیوں سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات گرامی کے ساتھ کس قدر والہانہ عقیدت رہی ہے حالاں کہ ان کی یہ صورت گری تاریخی اعتبار سے مکمل طور پر صحیح نہیں۔ یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ مسلمانوں کی زندگی پر حضورؐ کا گہرا اثر ہے۔ غیر مسلم قارئین کو دنیائے عرب، ایران اور ترکی کے علمائے دین اور شاعروں اور ہندوستان اور افریقا کے مسلمانوں کے ذریعے اس حقیقت کا واضح ادراک ہو جائے گا کہ مسلمانوں کو رسول کریمؐ سے کتنی گہری محبت ہے، انہیں آپؐ کی ذات پر کس قدر بھروسا ہے، کئی زمانوں اور مختلف ادوار سے آپؐ کی شخصیت کی کتنے وسیع پیمانے پر تعظیم و تکریم کی جارہی ہے اور آپؐ کے لیے کس قدر فصیح و بلیغ اوصاف اور القابات استعمال کیے جارہے ہیں۔ غیر مسلموں کو اس بات پر حیرت ہوگی کہ ہر مسلمان کے لیے حضورؐ کی ذات اقدس ہر لحاظ سے کامل نمونہ اور قابل تقلید مثال ہے۔ سب مسلمان زندگی کے تمام شعبوں، اپنے افعال اور عادات و اطوار کے معاملے، غرض چھوٹے چھوٹے معمولات میں بھی آپؐ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غیر مسلموں کو اس بات پر بھی تعجب ہوگا کہ صوفیائے عظام نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور ازلی کے بارے میں اپنا نظریہ قائم کرلیا ہے اور وہ آپؐ کو انسان کامل قرار دے کر آپؐ کو آفاقی حیثیت کی حامل شخصیت سمجھتے ہیں۔ ان کا پختہ ایمان ہے کہ نبی کریمؐ بنی نوع انسان کے جد امجد آدم علیہ السلام سے شروع ہونے والے

پیغمبروں کے طویل سلسلے کے آخری پیغمبر ہیں، خدا کی طرف سے آپ پر آخری وحی نازل ہوئی جس میں پہلے سے نازل ہونے والی تمام الہامی کتابیں شامل ہیں اور اس کے ساتھ ہی قرآن کریم میں ان کتابوں کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے نیز یہ کہ قرآن مجید ہر قسم کی آلائشوں اور آمیزش سے مبرّیٰ اور پاک ہے۔

ولفریڈ کینٹ ویل اسمتھ نے بالکل صحیح لکھا ہے: ''مسلمان اللہ پر حملوں کو برداشت کر لیتے ہیں، دنیا میں بے دین اور ملحد لوگ اور الحاد پرستی پر مبنی مطبوعات اور عقلیت پسند معاشرے موجود ہیں لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا (نعوذ باللہ۔ مترجم) حقارت سے ذکر کرنے سے ملتِ اسلامیہ کے بے حد ''لبرل'' طبقے بھی سخت مشتعل ہو جاتے ہیں اور مذہبی جنون کے نتیجے میں تند و تیز شعلے بھڑک اٹھتے ہیں۔'' (W.C. Smith: Modern Islam in India, pp.69-70)۔

۱۹۷۸ء کے آخر میں جب پاکستان میں زندگی کے تمام شعبوں میں رہنمائی کے لیے نظام مصطفیٰؐ کا اصول نافذ کیا گیا تو اس وقت اس اقدام کے خلاف تنقید کرنے والی بعض آوازیں سننے میں آئی تھیں۔ اس موقعے پر کراچی کے ایک شخص محمد اسماعیل نے ملک کے ایک بڑے اخبار میں اس تنقید کے جواب میں ''ایک نرالا فریب'' کے عنوان سے تقریباً آدھے صفحے کا اعلان شائع کرایا تھا۔ (ڈان اور سیز کراچی نومبر ۱۹۷۸)۔ اشتہار شائع کرنے والے شخص نے ان لوگوں پر نکتہ چینی کی جو رسول کریمؐ کے بتائے ہوئے اصولوں پر بحث کرنے سے پہلے حضورؐ کی حیثیت اور مرتبے کا تعین کرنا چاہتے تھے۔ اس اشتہار کا بنیادی موضوع یہ تھا:

نبی کریمؐ کے مرتبے اور عظمت کو کون ناپ سکتا ہے؟ اگر ایسے گستاخ اور بے ادب لوگ اپنے مذموم مقاصد کے لیے ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کہنے لگیں کہ پاکستان میں اسلام پر گفتگو کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حیثیت کا تعین ہونا چاہیے تو ہمیں ان کی اس بات پر کوئی حیرت نہیں ہوگی۔ ان لوگوں نے پہلے سے یہ مفروضہ قائم کر رکھا ہے کہ پاکستان کے کروڑوں مسلمانوں کو اللہ اور رسول کریمؐ کے بارے میں کچھ پتا نہیں اور وہ اس معاملے میں جاہل اور ناواقف ہیں۔

یہ ایک مسلمہ اور غیر متنازع حقیقت ہے کہ حضورؐ کا مرتبہ خدا کے بعد ہے اور صرف اللہ ہی اپنے پیغمبرؐ کی اس عظمت کو جانتا ہے جو آپ کو خدا کی جانب سے عطا کی گئی ہے۔ نامور شاعر اور عظیم صوفی شیخ سعدیؒ ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر'' کہہ کر اس حقیقت کا برملا اظہار کر چکے ہیں۔

یورپ میں، جہاں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو طویل عرصے سے بت پرست یا تاریکی کی روح سمجھا جاتا رہا ہے، اٹھارویں صدی سے حضورؐ کی سیرت مقدسہ کا مطالعہ شروع ہوا ہے اور اگرچہ آپؐ کو (نعوذ باللہ۔ مترجم) مسیح دشمن یا ایک عیسائی ملحد اور عیار و تفرقہ باز شخصیت کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے، اس کے باوجود روشن خیالی کے دور

کے کئی فلاسفرز آپ کی ذات کو عقلی طور پر ایک معقول مذہب کا نمائندہ، تثلیث اور نجات کے بارے میں قیاس آرائیوں سے مبرّیٰ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپؐ کو ایک ایسے دین کا بانی سمجھتے رہے ہیں جس میں مذہبی پیشواؤں کا کوئی وجود نہیں۔ انیسویں صدی سے مغربی اسکالرز نے عربی کے ان کلاسیکل ماخذوں کا مطالعہ شروع کر دیا جو یورپ میں آہستہ آہستہ دست یاب ہونے لگے تھے۔ اس کے باوجود اس عرصے میں بھی پیغمبر اسلامؐ کی اکثر سوانح عمریاں پرانے تعصّبات سے آلودہ رہیں اور حضورؐ کے پیغمبرانہ رول کے ساتھ انصاف نہ کیا گیا اور متقی مسلمان حضورؐ کے ساتھ جو عقیدت رکھتے تھے، آپؐ کی ذات گرامی کو ان نظروں سے نہ دیکھا گیا۔ یہ بات قابل فہم ہے کہ یورپ نے مسلمانوں کے محبوب پیغمبرؐ کی اس تصویر کشی پر، جس سے وہ ہندوستان میں خاص طور پر برطانوی تعلیمی اداروں اور مشنری اسکولوں کے ذریعے آگاہ ہوئے تھے، مسلمانوں نے شدید غیظ وغضب کا اظہار کیا۔ مسلمان ہونے کے ناتے انہیں عیسائیوں کے اس رویے سے بھی سخت نفرت تھی جو انہوں نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پہلے مبعوث ہونے والے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی کنواری ماں مریمؑ کے بارے میں اپنا رکھا تھا۔ (مسلمانوں میں یہ احساس اب بھی برقرار ہے۔ میں نے جب انقرہ یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات میں اپنی کلاس کے دوران یہ ذکر کیا کہ عیسائیوں کے کئی فرقے اور گروپ حضرت مریمؑ کے بے داغ کردار یا ان کے کنواری اور معصوم ہونے کے نظریے پر یقین نہیں رکھتے تو میرے ایک طالب علم نے غصے سے کہا: ''پھر تو ہم آپ کے مقابلے میں بہتر عیسائی ہیں'') ''مسلمانوں کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھنا ان کے عقیدے کا جز ولاینفک ہے جس کا جرمنی کے رومانوی ادب میں بھی اظہار کیا گیا ہے۔ جرمن مصنف Novalis کے ناول Heinrich Von Ofterdingen میں ایک مسلمان خانہ بدوش عرب خاتون یہ شکایت کرتی ہے: ''میں یہ نہیں سمجھ پائی کہ عیسائی مسلمانوں سے کیوں لڑتے ہیں حالاں کہ مسلمان عیسیٰ علیہ السلام کی قبر کا بے حد احترام کرتے اور انہیں پیغمبر مانتے ہیں۔'' ہندوستان کے مسلمانوں کی انگریزوں سے نفرت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ برطانیہ کے لوگ نبی کریمؐ کی مسخ شدہ تصویر پیش کرتے ہیں۔

اس محاذ آرائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں نے ولیم میور William Muir کی The Life of Mohamet جیسی کتابوں پر شدید ردعمل کا اظہار کیا اور پیغمبر اسلامؐ کے تاریخی کردار کا مطالعہ شروع کر دیا۔ (ولیم میور کی چار جلدوں پر مشتمل سوانح عمری The Life of Mohamet ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۱ء میں منظر عام پر آئی۔ میور نے ۱۸۸۷ء میں مشنری مقاصد کے لیے نویں صدی کے عرب مصنف الکندی (ابو یوسف یعقوب ابن اسحاق الکندی۔ مترجم) کے مسلم دشمن رسالے The Apology of al-kindi کو بھی درست کر کے شائع کیا)۔ اس مدت کے دوران، جو کئی صدیوں پر محیط تھی، رسول کریمؐ کی تاریخی شخصیت روایتی افسانوں اور فرضی داستانوں کے رنگین پردے میں گم ہوگئی، اصل حقائق سے

متعلق تفصیلات کو پر جوش انداز میں بیان کیا گیا لیکن تاریخی تناظر میں ان کا جائزہ لینے کی کوشش نہ کی گئی۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیات مقدسہ کے مطالعے میں ہندوستانی مسلمانوں کی نئی دل چسپی پروٹسٹنٹ مغرب میں عیسیٰ علیہ السلام کی تاریخی حیثیت کے مطالعے کے شانہ بشانہ فروغ پذیر ہوئی ہے،جس کا نتیجہ کئی سنجیدہ لیکن سطحی قسم کی بعض منفعلانہ کتابوں کی صورت میں برآمد ہوا۔ سید امیر علی کی ۱۸۹۷ عیسوی میں شائع ہونے والی کتاب Life and Teachings of Muhammad یا The Spirit of Islam سے رسول کریمؐ کے جدید سوانح نگاروں کے لیے مستقبل کی سمت کا اظہار ہوتا ہے،جس کی طرف وہ اگلے عشروں میں پیش رفت کرنے والے تھے۔

اس وقت مغربی زبانوں میں رسول اللہؐ کی کئی سوانح عمریاں دست یاب ہیں جن میں مسلمانوں کی زندگی اور تہذیب وتمدن میں پیغمبر اسلامؐ کے مرکزی رول کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ کتابیں مسلمان مصنفوں نے لکھی ہیں اوران میں ملت اسلامیہ میں حضورؐ کی حیات طیبہ کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی گئی ہے۔اس کی ایک اہم مثال محمد حمید اللہ کی Le Prophet d' Islam ہے۔ یہ کتاب عربی کے اصل ماخذوں کے بارے میں ان کے عمر بھر کے گہرے مطالعے اورذاتی تقوے اور پرہیزگاری کا حاصل ہے،جس میں مغرب کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے والے اس عابداورزاہد مسلمان نے آں حضرتؐ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔اسی طرح ایمل ایسن Emel Esin کی خوب صورت کتاب Mecca the Blessed, Medinah the Radiant میں رسول کریمؐ کی حیات مقدسہ کا شاندار انداز میں تذکرہ کیا گیا ہے۔اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ ترکی کی اس نہایت مہذب خاتون نے سیرت کی اس کتاب میں مدینہ میں حضورؐ کے روضہ مبارک پر حاضری کے دوران اپنے دلی جذبات کا جس منفرد انداز میں تذکرہ کیا ہے،اس کا کوئی جواب نہیں۔ مارٹن لنگز Martin Lings نے اپنی کتاب Muhammad میں، جو رسول پاکؐ کی سوانح عمری پر مشتمل ہے، قدیم ماخذوں سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے اس موضوع پر بے نظیر الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے۔ حضورؐ کی سیرت مقدسہ پر وسیع تعداد میں شائع ہونے والی کتابوں میں یہ صرف تین مثالیں ہیں۔

اب ہم حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے غیر مسلم سیرت نگاروں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر لوگ وہ یورپی اسکالرز ہیں جنہوں نے سیرت مقدسہ پر حالیہ برسوں میں کتابیں لکھی ہیں۔ سیرت کی ان کتابوں میں پچھلی نسلوں کی طرف سے لکھی گئی کتابوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ معروضی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ ان یورپی مصنفوں نے حضورؐ کی شخصیت کے ساتھ انصاف کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں ڈبلیو منٹگمری واٹ W.Montgomery Watt کی Muhammad: Prophet and Statesman غالباً بہترین کتاب ہے۔ یہاں Gunther Luling کی تازہ ترین اور سب سے متنازع کتاب Die Wielderntdeckung des propheten

Muhammad کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا جس میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ملکوتی صفات کا حامل پیغمبر ظاہر کیا گیا ہے جو یونانی عیسائیت کے برعکس یہود و نصاریٰ کے سامی مذہب پر کاربند تھے۔ مصنف نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ اس وقت مکہ میں یہی مذہب رائج تھا۔ اگرچہ اس کتاب میں عیسائیت کے صدیوں پرانے ناپسندیدہ الزامات کو دہرایا گیا ہے کہ اسلام اصل میں مسیحیت ہی کی مسخ شدہ صورت ہے البتہ اس میں پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں نرم رویہ اختیار کیا گیا ہے۔

چند سال پہلے میکسم روڈنسن نے، جو خود رسول اللہؐ کا سیرت نگار ہے، اسلام کے مغربی طالب علموں میں نبی کریمؐ کی سیرت کے مطالعے کے بارے میں ایک مفید سروے کیا تھا۔ (Rodinson: A Critical Survey of Modern Studies on Muhammad) لیکن ان اسکالروں میں سے صرف ایک محقق نے اسلامی تقوے اور پرہیزگاری میں رسول خداؐ کے رول پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔ تور آندرے Tor Andrae کی کتاب Die Person Muhammad's in Lehre und gloube seiner Gemeinde (1918) آج بھی سیرت طیبہ کے موضوع پر ایک معیاری تصنیف ہے لیکن بدقسمتی سے اسلامی حلقوں کو اس کا بہت کم علم ہے۔ آندرے کی کمال مہارت سے لکھی جانے والی اس کتاب کے شائع ہونے سے تھوڑی دیر پہلے جرمن اسکالر میکس ہورٹن Max Horten نے Die religiose vorstellungswelt des uolkes in Islam شائع کر دی جس میں کلاسیکی اور ہم عصر ماخذوں کی بنیاد پر مقبول دین اسلام میں رسول کریمؐ کے ساتھ عقیدت اور شیفتگی کی کئی تابناک مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ اس کے تقریباً نصف صدی بعد ہرمن اسٹیگ لیکر Hermann Steiglacker نے اپنی کتاب Die Glaubenslehren des Islam (1964) میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے رول کا اجمالی خاکہ پیش کیا ہے۔

انگریزی زبان میں لکھی جانے والی کتابوں میں ای پیڈوک E. Padwick کی Muslim Devotions (1960) میں قارئین کو رسول اللہؐ کے ارفع مقام سے روشناس کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی روحانی زندگی کے موضوع پر یہ ایک بے مثل کتاب ہے جس میں حضورؐ کے ساتھ مسلمانوں کی گہری عقیدت کے ضمن میں بیش بہا مواد موجود ہے اور اس گراں قدر ذخیرے کا انتخاب زہد و تقوے پر مبنی پورے عالم اسلام کے لٹریچر اور دعاؤں، اوراد و وظائف اور حضورؐ پر درود و سلام بھیجنے سے متعلق مناجات کی کتابوں سے کیا گیا ہے۔ میرے خیال میں آں حضرتؐ سے اظہار عقیدت کے موضوع پر یہ ایک بہترین کتاب ہے۔ اسی طرح آرتھر جیفرے Arthur Jaffery نے Reader on Islam میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیات اور کارناموں کے متعلق عربی میں لکھی جانے والی حد درجہ نازک کلاسیکل تفصیلات کا نہایت مہارت اور عمدگی کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔

لیکن ان میں سے کسی بھی مصنف نے مسلمانوں کی فصیح و بلیغ شاعری میں رسول کریمؐ کے ساتھ اظہار عقیدت کے موضوع پر خصوصی توجہ نہیں دی۔ میں نے اس کتاب میں نہ صرف عربی، فارسی اور عثمانی ترکوں کی زبان کی کلاسیکل شاعری بلکہ دنیائے اسلام کی مختلف مقامی زبانوں کے مقبول عام شعروں پر پوری توجہ مرکوز کی ہے۔ یہ وہ نظمیں اور نعتیں ہیں جن کے ذریعے مسلمان بچوں کے ذہن میں حضورؐ کے ساتھ محبت اور عقیدت شروع ہی سے نقش ہو جاتی ہے اور ان کے دل و دماغ میں اپنے محبوب پیغمبرؐ، شافع محشرؐ اور خاتم النبیینؐ کا تصور پوری طرح اجاگر ہو جاتا ہے۔ مسلمان بچے آں حضرتؐ سے اظہار عقیدت کے لیے آج بھی روایتی تشبیہیں اور استعارے استعمال کرتے ہوئے چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھتے ہیں اور ان کے بڑے بوڑھے پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے الفاظ کو سماجی انصاف، جمہوریت اور روشن خیالی کا پیغام سمجھتے ہیں۔

جیسا کہ جیمز رائسٹر James Royster نے اپنے تنقیدی آرٹیکل The Study of Muhammad میں لکھا ہے، پیغمبر اسلام کی مثالی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی بدولت تقابلی موازنے کے لیے مختلف مذاہب کے تاریخ دانوں کو گراں قدر مواد دستیاب ہے، حضورؐ کی حیات مقدسہ کا دنیا کے دوسرے مذاہب کے بانیوں کی زندگی سے موازنہ کیا جا سکتا اور مسیحی یا یونانی نظریات کے مقابلے میں رسول اللہؐ کی شخصیت کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ مذہب کے فلسفے اور نفسیات کے ماہرین پر بھی یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ اسلام میں نبی کریمؐ کی ذات گرامی کے ساتھ اظہار عقیدت کی کئی دل چسپ مثالیں موجود ہیں۔ اس حقیقت کا بھی سب لوگ اعتراف کریں گے کہ ایک مسلمان کی زندگی میں قرآن کریم کے علاوہ رسول اللہؐ کی ذات اقدس کو بھی مرکزی مقام حاصل ہے اور حضورؐ کی حیات مقدسہ تمام مسلمانوں کے لیے اسوہ حسنہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ (یقیناً تمہارے لیے رسول اللہؐ میں عمدہ نمونہ (موجود) ہے ہر اس شخص کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی اور قیامت کے دن کی توقع رکھتا ہے اور بکثرت اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے: سورہ الاحزاب آیت ۲۱۔ مترجم)۔ سرور کائناتؐ کی ذات اقدس ان تمام لوگوں کے لیے مشعل راہ ہے جن کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ آپؐ ''خدا کے پیغمبر'' ہیں۔

پیغمبر اسلامؐ کی حیات مقدسہ کا اجمالی خاکہ

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیات طیبہ کے بارے میں تفصیلات ہمیں مختلف ذرائع سے معلوم ہوئی ہیں۔ قرآن کریم میں حضورؐ کی مقدس زندگی اور نئی مسلم برادری کے ابتدائی برسوں میں رونما ہونے والے واقعات کے سلسلے میں رمز و کنائے سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ظہور اسلام کے بعد شروع کی صدیوں میں رسول کریمؐ کی احادیث اور آپؐ کے حالات زندگی کو نہایت احتیاط کے ساتھ یک جا کر کے انہیں محفوظ کر دیا گیا۔ یہ مواد کا وسیع ذخیرہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امت مسلمہ آپؐ کو کس نظر سے دیکھتی تھی۔ ابتدائی ماخذوں میں حسانؓ ابن ثابت کے قصیدے بھی شامل ہیں۔ انہوں نے مدینہ منورہ میں اسلام قبول کیا تھا۔ حضرت حسانؓ نے اپنے کلام میں ملت اسلامیہ کو پیش آنے والے اہم واقعات کو اجاگر کیا، رسول اللہؐ کی مدح سرائی اور آپؐ کے دشمنوں کی تحقیر اور مذمت کی۔ دوسرے ابتدائی ماخذ آں حضرتؐ کی جنگوں اور مغازی اور جزیرہ نما عرب میں اسلام کی اشاعت پر مبنی تفصیلات پر مشتمل ہیں۔ ان تمام ذرائع نے حضورؐ کی سیرت کے لیے خام مواد بہم پہنچایا ہے۔ محمد ابن اسحاق (وفات ۷۶۸ عیسوی) نے جو سیرت لکھی اور جسے ابن ہشام (وفات ۸۳۰ء) نے بعد میں مرتب کیا، مستقبل میں لکھی جانے والی تمام سوانح عمریوں کی بنیاد بن گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حقیقی اور واقعاتی مواد کے گرد کئی روایتی افسانوں کا ہالہ موجود ہے، اس کے باوجود ایک سچے مذہبی رہنما کی طلسماتی شخصیت کا صحیح ادراک کرنے کے لیے آپؐ کی زندگی کے خشک حقائق کے مقابلے میں ان روایتی قصے کہانیوں کو درست تسلیم کرنا بھی ضروری ہے جن کی تشریح مختلف سیرت نگاروں نے اپنے اپنے نقطہ نظر کی روشنی میں کی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب کے بانیوں کی نسبت حضرت محمدؐ کی حیات مقدسہ کے مہ و سال کے متعلق سب سے زیادہ تاریخی ریکارڈ موجود ہے بلکہ اسلام کے ابتدائی برسوں میں بھی صحابہ کرامؓ کے ذہنوں میں حضورؐ کی ''مقدس سوانح عمری'' کے اہم واقعات اور ان کی تاریخیں پوری طرح نقش تھیں اور آج تک من و عن محفوظ

ہیں۔ یہ واقعات اور سنین مختلف اسلامی زبانوں میں نہایت توجہ اور محنت کے ساتھ شاعری اور نثر میں درج ہیں جنہیں اب تک بار بار دہرایا جاتا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک دشوار کام ہے بلکہ بعض اوقات (جیسا کہ عثمانی ترکوں کے عہد میں ہوا) تصویروں اور نقش و نگار کے ذریعے ان تاریخی واقعات کو منعکس کیا گیا ہے۔ چند سال گزرے ہیں کہ ایک ترک شاعر نے آں حضرتؐ کی حیات مقدسہ کے ۶۳ برسوں کی سادہ شعروں میں تصویر کشی کی ہے۔ (حضورؐ کی ۶۳ سالہ زندگی کے بارے میں ۶۳ نظمیں ترک شاعر Necip Fazil Kisa Kureb نے ۱۹۷۲ء میں جیل میں مکمل کی تھیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ فارسی کے ایک جدید شاعر نے بھی جلاوطنی کے زمانے میں پیامبر کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ یوں لگتا ہے کہ جبر و تعدی کے حالات میں یہ مسلمان مصنف خود کو رسول کریمؐ کے زیادہ قریب محسوس کرتا اور حضورؐ کی مستقل مزاجی کو بہترین نمونہ سمجھتا ہے۔ (اس قسم کے جذبات کا نچلی سطح پر اظہار بھارتی فلم مغل اعظم کی ایک نعت میں اس وقت کیا گیا ہے جب اکبر اعظم انارکلی کو شہزادہ سلیم کے ساتھ عشق کرنے کے جرم میں جیل میں بند کر دیتا ہے۔ اس وقت انارکلی آں حضرتؐ سے یہ التجا کرتی ہے: ''بے کس پہ کرم کیجیے سرکار مدینہ)۔'' جیفرے کی کتاب The Quest for the Historical Muhammad سمیت سیرت کی بے شمار کتابوں میں نبی کریمؐ کی حیات طیبہ پر روایتی افسانوں کے غبار کو ہٹانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ چناں چہ ہم آپؐ کی سیرت کا تاریخی تناظر میں اس طرح اجمالی خاکہ پیش کر سکتے ہیں۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قبیلہ قریش کی ہاشم شاخ میں پیدا ہوئے جو ساتویں صدی (چھٹی صدی مترجم) کے شروع میں عرب میں تجارت کے سب سے بڑے مرکز مکہ پر حکومت کرتی تھی۔ عام طور پر باور کیا جاتا ہے کہ حضورؐ تقریباً ۵۷۰ عیسوی یا ایم حمید اللہ کے مطابق جون ۵۶۹ عیسوی میں پیدا ہوئے۔ (Hamidullah: La date de naissanee du Prophete Muhammad)۔ مسلمانوں کی روایت میں کہا گیا ہے کہ جس سال آپؐ کی ولادت ہوئی، اس سال ایک غیر ملکی فوج نے مکہ کا محاصرہ کر لیا لیکن اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور وہ مکہ سے واپس چلی گئی۔ (کیا تو نے نہ دیکھا کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا ان کے مکر کو بے کار نہیں کر دیا؟ اور ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیے جو انہیں مٹی اور پتھر کی کنکریاں مار رہے تھے۔ پس انہیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر دیا۔ سورہ الفیل آیات ۱ تا ۵۔ مترجم)۔ بعد میں اس واقعے کو ایک معجزہ اور حضورؐ کے ورود کی علامت قرار دیا گیا۔ (ابونعیم: دلائل النبوت، صفحہ ۱۰۰)۔ رسول اللہؐ کے والد گرامی عبداللہ ابن عبدالمطلب آپؐ کی پیدائش سے پہلے وفات پا گئے تھے جب کہ آپؐ کی والدہ ماجدہ کا اس وقت انتقال ہو گیا جب آپؐ کی عمر تقریباً چھ برس تھی۔ عرب کے شہروں میں رہنے والے دوسرے لڑکوں کی طرح شیر خوار محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دایہ حلیمہ کے سپرد کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس ایک لنگڑی گدھی تھی جو مضافات سے بمشکل مکہ پہنچی تھی۔ لیکن جب واپسی کے سفر میں رسول کریمؐ اس گدھی پر سوار ہوئے

تو وہ تیزی سے بھاگنے لگی۔ ننھے حضورؐ کی مستقبل میں عظمت کی یہ پہلی نشانی تھی۔ (محمد ابن اسحاق: سیرت رسول اللہؐ، جلد اول صفحہ ۱۰۴)۔

آں حضرتؐ حلیمہ کے پاس تھے کہ ایک دن آپؐ گم ہو گئے لیکن آپؐ کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ بعد میں صوفی شاعروں نے انسانوں اور جنوں کے رہنما کی حیثیت سے اسے ایک اور نادر اور مافوق الفطرت واقعہ قرار دیا۔

ترجمہ: اے حلیمہ! آپ پریشان نہ ہوں، حضورؐ گم نہیں ہوئے

بلکہ یہ آپؐ کی ذات گرامی ہے جس میں پوری دنیا گم ہو جائے گی (رومیؔ مثنوی جلد چہارم)

شاعر اور صوفی جلال الدین رومیؔ (وفات ۱۲۷۳عیسوی) نے اس واقعے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایک غیر مرئی شخصیت کی آواز سن کر پریشان حال خاتون (حلیمہ) مطمئن ہو گئی تھیں۔ بعض سیرت نگاروں کا کہنا ہے کہ حضورؐ کی اس غیر حاضری کے دوران آپؐ کے سینے کو چاک کرنے کا واقعہ رونما ہوا تھا۔ بعد کی ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ کی والدہ آمنہ نے اپنی وفات سے پہلے چند اشعار کہے تھے جن میں انہوں نے اپنے بیٹے کے شاندار مستقبل کی پیش گوئی کی تھی:

ترجمہ: آپؐ کو جلیل القدر اور مہربان پروردگار نے

بنی نوع انسان کی طرف بھیجا ہے......

آمنہ کی رحلت کے بعد جنوں کو خاتم النبیینؐ کی والدہ محترمہ کے سوگ میں نوحہ خوانی کرتے سنا گیا۔ (ابونعیم: دلائل النبوت، صفحات ۱۲۰، ۱۲۱)۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بچپن سے اپنے دادا عبدالمطلب کی نگرانی اور حفاظت میں تھے۔ حضورؐ کی والدہ ماجدہ آمنہ کی وفات کے دو سال بعد عبدالمطلب بھی انتقال کر گئے۔ اس کے بعد آپؐ کے چچا ابو طالب آپؐ کے سرپرست بن گئے جن کے بیٹے حضرت علیؓ کا شمار اسلام قبول کرنے والے ابتدائی لوگوں میں ہوتا ہے۔ رسول خداؐ یتیم تھے اور قرآن کریم کی سورہ الضحیٰ میں اس کا یوں تذکرہ کیا گیا: ''کیا اس نے تجھے یتیم پا کر جگہ نہیں دی؟ اور تجھے راہ بھولا پا کر ہدایت نہیں دی اور تجھے نادار پا کر تونگر نہیں بنا دیا؟'' بعد میں آنے والے بہت سے شاعروں نے آپؐ کو اسی مناسبت سے در یتیم کے لقب سے موسوم کیا ہے۔ (کئی صوفیہ حضرات نے اس سورہ کی عارفانہ تفسیریں لکھی ہیں۔ مترجم)۔

مکہ کے بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح آں حضرتؐ نے بھی تجارت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ روایت ہے کہ آپؐ بچپن میں اپنے چچا کے ساتھ شام بھی گئے تھے۔ راستے میں بحیرا نامی راہب سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ (Watt: Muhammad, Prophet and Statesman, p.1)۔ بحیرا نے حضورؐ کے دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت کو

پہچان لیا۔اس نے ابو طالب سے کہا کہ آپ مستقبل کے پیغمبر ہیں جن کے ظہور کی بشارت انجیل میں دی گئی ہے۔ پرانی الہامی کتابوں میں آخری پیغمبر کی جن نشانیوں کا تذکرہ ہوا ہے، وہ سب آپ کی ذات میں موجود ہیں۔ (ابونعیم: دلائل النبوت ،صفحات ۱۲۵ تا ۱۳۱)۔اس وقت حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عمر بارہ برس تھی۔آں حضرتؐ نے ابتدائی زندگی میں تجارت کا پیشہ اپنایا جس کی وجہ سے مسلمانوں کی زندگی میں اس پیشے کو باوقار اور اعلیٰ مقام حاصل ہے۔اس صدی کے شروع میں لکھے گئے ایک سندھی گیت میں بچوں کو تجارت کا پیشہ اختیار کرنے کی نصیحت کی گئی ہے۔ چوں کہ خود رسول کریمؐ نے تجارت کا پیشہ اپنایا تھا اور اس کے لیے پوری قوت صرف کر دی تھی ،اس لیے اس پیشے کو حد درجہ اہمیت حاصل ہے۔

جب حضورؐ کی عمر ۲۵ سال ہوئی تو آپؐ جس خاتون کے لیے تجارت کرتے تھے اور جو آپ کی دیانت اور خلوص سے بے حد متاثر تھیں (آپ کو الامین کے لقب سے پکارا جاتا تھا) ان کے ساتھ آپ کی شادی ہوگئی۔ان کا نام خدیجہؓ تھا اور اگر چہ وہ عمر میں آں حضرتؐ سے خاصی بڑی تھیں، اس کے باوجود یہ شادی نہایت پرمسرت ثابت ہوئی۔حضرت خدیجہؓ کے بطن سے چار بیٹیاں اور کمسنی میں وفات پا جانے والے ایک یا دو بیٹے پیدا ہوئے۔ترکی میں لکھی گئی ایک مثنوی، مصر کی ایک جدید نظم اور مختلف زبانوں کی لوک رزمیہ نظموں میں جناب خدیجہؓ کے ساتھ رسول کریمؐ کی شادی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔سنی اور شیعہ دونوں مکاتب فکر کے لوگ حضرت خدیجہؓ کی بے حد تعریف و تحسین کرتے ہیں:

ترجمہ: خدیجہؓ، خدیجہؓ عظیم اور پاک خاتون

وہ ہمیں اپنی ماؤں سے زیادہ عزیز ہیں......(Kisakurek, Es-Salam, p.41)۔

نبی کریمؐ کی زندگی چالیس سال کی عمر میں جب اچانک تبدیل ہوگئی تو جناب خدیجہؓ آپؐ کے لیے سب سے بڑی امداد اور حمایت کا ذریعہ ثابت ہوئیں۔جب حضورؐ روایتی مذہبی طریقوں کو ترک کر کے ایک اعلیٰ اور خالص دین کو تلاش کرنے کے لیے فکر مند تھے، اس وقت آپؐ اکثر مکہ کے قریب غار حرا میں چلے جاتے۔اسی غار میں خدا کی طرف سے آپؐ پر پہلی وحی نازل ہوئی، یہیں آپ کو ''پڑھ'' کا حکم دیا گیا۔ (پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔تو پڑھتا رہ تیرا رب بڑے کرم والا ہے۔جس نے قلم کے ذریعے (علم) سکھایا۔جس نے انسان کو وہ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔سچ مچ انسان تو آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو بے پروا (یا تونگر) سمجھتا ہے۔ یقیناً لوٹنا تیرے رب کی طرف ہے۔ (بھلا) اسے بھی تو نے دیکھا جو بندے کو روکتا ہے جب کہ وہ بندہ نماز ادا کرتا ہے۔ بھلا بتلا تو اگر وہ ہدایت پر ہو۔ یا پرہیز گاری کا حکم دیتا ہو۔ بھلا دیکھو تو اگر یہ جھٹلاتا ہو اور منہ پھیرتا ہو تو کیا اس نے نہیں جانا کہ اللہ تعالیٰ اسے خوب دیکھ رہا ہے۔ یقیناً اگر یہ باز نہ رہا تو

ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے۔ ایسی پیشانی جو جھوٹی خطا کار ہے۔ یہ اپنی مجلس والوں کو بلا لے۔ ہم بھی (دوزخ کے) پیادوں کو بلالیں گے۔ خبردار! اس کا کہنا ہرگز نہ ماننا اور سجدہ کر اور قریب ہو جا۔ سورہ العلق آیات ۱ تا ۹۔ مترجم)۔ پہلی وحی نازل ہونے کے بعد "روحانی تشنگی" کا زمانہ آ گیا۔ بعد میں آنے والے شاعروں نے ڈرامائی انداز میں بیان کیا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کس طرح خود کو کوہ حرا سے نیچے گرانا چاہتے تھے۔ (رومؔی: مثنوی، جلد پنجم)۔ اس کے بعد خدا کی طرف سے دوبارہ وحی نازل ہوئی اور خدا، جو یکتا اور بے مثل ہے، حضورؐ کے ساتھ خود ہم کلام ہوا اور اس نے آپ کو حکم دیا کہ آپؐ اپنے ہم وطنوں سے کہیں کہ وہ خدائے بزرگ و برتر پر مکمل ایمان لے آئیں۔

رسول کریمؐ جب وحی کا مشاہدہ کرتے، اس وقت آپؐ سے مختلف آثار و علامات ظاہر ہوتیں یہاں تک کہ آپؐ کی اونٹنی بھی نزول وحی کے وقت مضطرب ہو جاتی اور گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتی۔ آں حضرتؐ نے وحی کے بارے میں اپنے تاثرات اس طرح بیان کیے: "بعض اوقات زبانی مضمون پوری طرح واضح ہوتا اور میں فرشتے (جبریلؑ) کو انسان کی صورت میں دیکھتا اور اس کے الفاظ سنتا لیکن کئی مرتبہ یہ ایک تکلیف دہ اور نا قابل فہم الہام ہوتا۔ بعض اوقات یہ ایک گھنٹی کی طرح سنائی دیتا ہے جو میرے لیے انتہائی تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن جب میں اس پیغام سے آگاہ ہو جاتا ہوں تو گھنٹیوں کی یہ گونج مدھم پڑ جاتی ہے۔ (بخاری حدیث ۱:۳؛ Lings: Muhammad, pp.44, 45)۔

مکہ کے لوگ کئی دیویوں کی پرستش کرتے تھے جن میں سے بعض دیویوں کے مجسمے اور تصویریں خانہ کعبہ کے اندر آویزاں تھیں۔ بعد میں یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ یہ مورتیاں اور مجسمے عیسائیت کے پیروکاروں نے نصب کیے تھے کیوں کہ بتایا گیا ہے کہ ان میں سے ایک تصویر حضرت مریم علیہا السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کی تھی۔ (Luling: Die Wiederentdec ung des prophete Muhammad)۔ یہاں ہم مکہ اور مغربی عرب کے نظریات پر یونانی مسیحیت کے گہرے اثر و رسوخ کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ظہور اسلام سے پہلے کے دور میں غالباً خانہ بدوشوں کے مذہب میں مورتیوں کا احترام نہیں کیا جاتا تھا بلکہ یہ لوگ پتھروں، درختوں اور دوسری چیزوں کی پوجا کرتے تھے، عقیدہ تقدیر قدیم عرب کے رگ و پے میں رچ بس چکا تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ مقدر بن چکا ہے۔ خانہ کعبہ کی زیارت، جس کا تعلق میلوں اور باہمی میل ملاپ کے موقعوں سے تھا، مکہ کے معاشی نظام کا اہم حصہ تھی لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ اہل مکہ یا خانہ بدوش قبائل سرگرم یا اعلیٰ روحانی مذہبی زندگی بسر کرتے تھے۔ عرب کے بہترین شاعر صحرا کی زندگی اور سخت کوشی سے بے حد متاثر تھے جس کا اندازہ اسلام سے پہلے کے عرب شاعروں کے کلام سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ عقیدہ قضا و قدر پر پختہ یقین بھی اس معاشرے کا لازمی جزو تھا اور ہمیں اس پر حیرت نہیں ہونی چاہیے۔

جزیرہ نما عرب میں یہودیوں کی کئی بستیاں بھی موجود تھیں لیکن یہ سب یہودی کٹر عقاید پر کاربند نہیں تھے بلکہ ان میں سے بعض لوگوں میں ''ملحدانہ'' رجحانات پائے جاتے تھے۔ عیسائیت کا اثر بہت مضبوط تھا کیوں کہ جزیرہ نما سے ملحق علاقوں (شام، عراق اور مصر) میں مختلف فرقوں کے عیسائی آباد تھے اور یہی وجہ ہے کہ عرب کے لوگ عیسائیوں کے مونوفزائٹ، نسطوری اور کئی دوسرے فرقوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ یوں لگتا ہے کہ عرب کے کئی باشندے روایتی مذہب کے بجائے ایک خالص اور اطمینان بخش دین کے متلاشی تھے۔ قرآن کریم ان لوگوں کو حنیف کے نام سے موسوم کرتا ہے اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت خدیجہؓ کے رشتے دار ورقہ بن نوفل کے ذریعے ان لوگوں کے عقاید سے واقف تھے۔ قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ کے پرانے دین پر کاربند لوگوں کو حنیف کہا گیا ہے جس کے بعد یہ دین یہودیت اور عیسائیت میں بٹ گیا تھا۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر تقریباً ۶۱۰ عیسوی کے بعد جو وحی نازل ہوئی، اس میں بنیادی طور پر خدا کی وحدانیت پر زور دیا گیا جو اس کائنات کا خالق اور داور حقیقی ہے۔ خدا نے ہمسایوں کے ساتھ پیار کرنے، عدل وانصاف سے کام لینے اور ایمانداری سے زندگی بسر کرنے کا حکم دیا ہے۔ روز محشر کو فیصلہ کرنے سے پہلے وہ تمام انسانوں کو اکٹھا کرے گا۔ شروع میں نازل ہونے والی مختصر قرآنی آیات میں روز قیامت کی ہولناکیوں کا اجمالی لیکن طاقت ور، مترنم جملوں میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ آیتیں گرج چمک اور دھاڑتے ہوئے طوفان کی مانند یکے بعد دیگرے نازل ہوئی تھیں۔ مکہ کے لوگ اس آفاقی پیغام سے قائل نہ ہوئے، وہ قیامت کے دن مردوں کے دوبارہ جی اٹھنے کے نظریے کو خاص طور پر سمجھ نہ پائے لیکن نبی کریمؐ پر متواتر نازل ہونے والی وحی کے ذریعے ان تمام شکوک وشبہات کو دور کرنے کے لیے یہ استدلال پیش کیا گیا کہ زمین بھی، جو سردیوں کے موسم میں مردہ ہو جاتی ہے، موسم بہار میں کس قدر تازگی وشادابی اور ہریالی سے ہم کنار ہو جاتی ہے۔ چناں چہ انسانی تخلیق اور پیدائش کا معجزہ مردوں کے دوبارہ زندہ ہونے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ لیکن مکہ کے سرکردہ افراد نے اس دلیل کو آسانی سے قبول نہ کیا اور اس طرح ان سرداروں اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیروکاروں کے مختصر گروپ کے درمیان کشیدگی میں ہر سال اضافہ ہوتا گیا۔ ان حالات میں مسلمانوں کا ایک گروپ ہجرت کر کے حبشہ چلا گیا کیوں کہ آں حضرتؐ جن نظریات کا پرچار کر رہے تھے، وہ حبشہ میں رائج مسیحیت سے خاصے قریب تھے۔ (یہ مسلمان مختلف اوقات میں حبشہ سے واپس چلے آئے)۔

۶۱۹ عیسوی میں رسول اللہؐ اپنی وفادار بیوی حضرت خدیجہؓ کو کھو بیٹھے جو دکھ درد اور مایوسیوں کے وقت آپؐ کی مضبوط ترین حمایت کرتی رہی تھیں۔ اسی سال حضورؐ کے چچا ابو طالب بھی وفات پا گئے۔ اگرچہ انہوں نے نئے دین اسلام کو، جو خدائے بزرگ وبرتر پر مکمل اعتماد اور اس کی کامل اطاعت کا علم بردار ہے، قبول نہیں کیا تھا اس کے باوجود وہ

اپنے بھتیجے کی محافظت سے کبھی دست بردار نہیں ہوئے تھے۔

جناب خدیجہؓ اور ابو طالب کی وفات کے دو سال بعد، جب حالات نہایت مخدوش ہو چکے تھے، مکہ کے شمال میں واقع نخلستان کے شہر یثرب سے ایک وفد حج کے لیے مکہ آیا۔ انہوں نے حضورؐ سے درخواست کی کہ آپؐ ان کو درپیش بعض سماجی اور سیاسی مسئلوں کو حل کریں جن کی وجہ سے ان کے شہر میں آباد مختلف گروہوں کے درمیان وسیع اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ غرض آں حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیروکار مسلمان ہجرت کر کے یثرب چلے گئے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے دوست حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ سب سے آخر میں ہجرت کی۔ آں حضرتؐ اور ابوبکرؓ مکہ سے چل پڑے لیکن اہل مکہ انہیں پکڑنے کے آرزومند تھے۔ روایات میں بتایا گیا ہے کہ انہوں نے ایک غار میں کس طرح پناہ لی، مکڑی کے ایک بڑے جالے نے غار کو جانے والے راستے کو ڈھانپ دیا اور کبوتروں نے تیزی کے ساتھ غار کے باہر گھونسلے بنا لیے تاکہ آپؐ کا تعاقب کرنے والے اہل مکہ کو یہ خیال نہ گزرے کہ غار میں کوئی چھپا ہے۔ (اس وقت جب کافروں نے آپؐ کو (دیس سے) نکال دیا تھا، دو میں سے دوسرا جب کہ وہ غار میں تھے، جب یہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ پس جناب باری تعالیٰ نے اپنی طرف سے تسکین اس پر نازل فرما کر ان لشکروں سے اس کی مدد کی جنہیں تم نے دیکھا ہی نہیں۔ سورہ التوبہ آیت ۴۰۔ مترجم)۔ فارسی میں حضرت ابوبکرؓ کے لیے ''یارِ غار'' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے جس سے رسول اللہؐ کے ساتھ ان کا نہایت قریبی تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ نقشبندیہ سلسلے کی روایت کے مطابق نبی کریمؐ نے غار میں حضرت ابوبکرؓ کو خاموشی سے خدا کا ذکر کرنے کے اسرار یعنی ذکر خفی کا طریقہ سکھایا تھا۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ستمبر ۶۲۲ عیسوی میں یثرب پہنچے چناں چہ مسلمانوں کے عہد کا آغاز حضورؐ کی ہجرت سے ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے مہ و سال کی تقویم جون ۶۲۲ عیسوی میں عربی کے قمری سال کے پہلے مہینے سے ہوتی ہے۔ یہ قمری سال ۳۵۴ دنوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

یثرب شہر جلد ہی مدینۃ النبیؐ، نبی کریمؐ کے شہر کے نام سے موسوم ہو گیا۔ آں حضرتؐ کو یثرب میں گروہی کشیدگیوں کا حل تلاش کرنے کے لیے مدینہ آنے کی دعوت دی گئی تھی چناں چہ آپؐ ایک ایسا دستور تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کا نہ صرف مدینہ میں رہنے والے مختلف قبائل (جن میں سے بیشتر قبیلوں کا تعلق انصار یا مسلمانوں کے ''مددگاروں'' سے تھا) بلکہ آپؐ کے ساتھ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آنے والے مہاجرین پر بھی اطلاق ہوتا تھا۔ یہ دستور صرف مختصر مدت کے لیے نافذ رہا لیکن یہ دستاویز بعد میں مسلمانوں کی گروہی تنظیم کے لیے ایک بنیاد اور نمونہ بن گئی۔

مارچ ۶۲۴ عیسوی میں مسلمانوں اور اہل مکہ کے درمیان مدینے کے قریب بدر کے مقام پر ایک بڑی جنگ ہوئی۔ اگرچہ مسلمانوں کو اچانک ایک بڑی فوج کا سامنا کرنا پڑا، اس کے باوجود اس لڑائی میں انہیں زبردست فتح حاصل ہوئی۔ معرکہ بدر میں فتح ایک نئی مسلم برادری کے لیے اہم معجزہ تھی۔۔۔ایک ایسا معجزہ جس کی بدولت مسلمانوں کو نیا تشخص ملا اور یہی وجہ ہے کہ مسلمان اس فتح کو ایک ایسے واقعے کے طور پر یادرکھتے ہیں جس نے اسلام کی ابتدائی تاریخ کا رخ موڑ دیا تھا۔ روایات کے مطابق رسول اللہؐ نے اہل مکہ پر علامتی طور پر مٹھی بھر کنکریاں پھینکیں جنھوں نے فتح میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ قرآن کریم نے اس واقعے کو یوں بیان کیا ہے: ''سو تم نے انہیں قتل نہیں کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو قتل کیا۔ اور آپؐ نے خاک کی مٹھی نہیں پھینکی بلکہ اللہ تعالیٰ نے وہ پھینکی اور تاکہ مسلمانوں کو اپنی طرف سے ان کی محنت کا خوب عوض دے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔'' (سورہ الانفال آیت ۱۷)۔ حضورؐ کی جانب سے کفار پر مٹھی بھر کنکریاں پھینکنے کے واقعے سے متعلق قرآن حکیم کی یہ آیہ مبارکہ رسول کریمؐ کے بارے میں مختلف صوفیانہ قیاس آرائیوں کی بنیاد بن گئی جن کا ہاتھ خدا کا ہاتھ تھا۔ چناں چہ بدر کے نام نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت اور خدا کی طرف سے اپنے بندوں کی دائمی امداد پر مہر تصدیق ثبت کردی۔

ایک سال بعد ۶۲۵ عیسوی میں فریقین کے درمیان احد پہاڑ کے قریب اسی قسم کی ایک اور جنگ ہوئی لیکن اس میں مسلمانوں کو بہت کم کامیابی ملی۔ اس لڑائی میں نبی کریمؐ کے چچا حضرت حمزہؓ سمیت، جن کا نام پورے مشرق کی لوک داستانوں میں مشہور ہے، کئی بہترین جنگجو مسلمان شہید ہو گئے۔ دشمن کی طرف سے پتھر برسانے کے نتیجے میں حضورؐ ایک پہلو پر گر پڑے، آپؐ کے سامنے والے دو دانت شہید ہو گئے، چہرہ مبارک خون آلود ہو گیا اور لب مبارک پر بھی زخم آیا۔ آپؐ کے دندان مبارک کے شہید ہونے کا واقعہ بعد میں آنے والے شاعروں کے لیے تحریک کا سبب بنا اور انہوں نے اسے ''موتیوں'' کے ''یاقوت'' میں تبدیل ہونے سے تعبیر کیا (کیوں کہ آں حضرتؐ کے سفید موتیوں جیسے دانت سرخ خون کے باعث لعل یاقوت بن گئے تھے)۔

۶۲۷ عیسوی میں اہل مکہ نے مدینہ کو فتح کرنے کی کوشش کی اور روایات میں کہا گیا ہے کہ ایران کے مسلمان سلمان فارسیؓ نے مدینہ کے باشندوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنے دفاع کے لیے ایک خندق کھودلیں چناں چہ مکہ کے قریش نے، جو محاصرے کی جنگ لڑنے کے عادی نہیں تھے، کوئی واضح کامیابی حاصل کیے بغیر مدینہ کا محاصرہ اٹھالیا۔

اگلے سال حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حج کرنے کی غرض سے مکہ روانہ ہو گئے جسے ہجرت کے تھوڑی دیر بعد آپؐ کے مذہبی وجدان، امنگوں اور خواہشات کے محور کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ مدینہ کے مسلمان اصل میں بیت المقدس کی جانب منہ کرکے نماز پڑھتے تھے جو اس سے پہلے دو الہامی مذہبوں کا مقدس مقام تھا۔ لیکن ۶۲۳ یا ۶۲۴

عیسوی میں کعبۃ اللہ کو مسلمانوں کا قبلہ بنانے کی ہدایت کردی گئی۔ (ہم آپ ؐ کے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، اب ہم آپ ؐ کو اس قبلے کی جانب متوجہ کریں گے جس سے آپؐ خوش ہو جائیں، آپؐ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور آپ ؐ جہاں کہیں ہوں اپنا منہ اسی طرف پھیرا کریں۔ اہل کتاب کو اس بات کے اللہ کی طرف سے برحق ہونے کا قطعی علم ہے اور اللہ تعالیٰ ان اعمال سے غافل نہیں جو یہ کرتے ہیں۔ اور آپ ؐ اگر چہ اہل کتاب کو تمام دلیلیں دے دیں لیکن وہ آپ ؐ کے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے اور نہ آپ ؐ ان کے قبلے کو ماننے والے ہیں اور نہ یہ آپس میں ایک دوسرے کے قبلے کو ماننے والے ہیں اور اگر آپ ؐ باوجودیکہ آپ ؐ کے پاس علم آ چکا پھر بھی ان کی خواہشوں کے پیچھے لگ جائیں تو بالیقین آپ ؐ بھی ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔ سورہ البقرہ آیات ۱۴۴، ۱۴۵۔ مترجم)۔ اس وقت سے لے کر آج تک دنیا بھر کے مسلمان اس کعبے کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں جسے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے مل کر تعمیر کیا تھا۔ غرض خانہ کعبہ کو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حکمت عملی میں اہم مقام حاصل ہو گیا۔ اگر چہ قریش مکہ نے ۶۲۸ عیسوی میں حضورؐ کو اپنے آبائی شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی، اس کے باوجود آپ ؐ اہل مکہ کے ساتھ ایک معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو گئے جس میں آپ ؐ نے مدینہ کو مکہ کے برابر مقام دلا دیا۔ معاہدے میں یہ ضمانت بھی دی گئی کہ اگلے سال آپ عمرہ ادا کر سکیں گے۔

مدینہ منورہ میں قیام کے برسوں میں یہودیوں کے ساتھ آپ کا رویہ سخت ہو گیا۔ یہود نے آپ ؐ پر نازل ہونے والی وحی کو ماننے اور قرآن کریم کو تورات کی تکمیلی شکل تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور یوں لگتا ہے کہ ان میں سے بعض یہودیوں کا تعلق منافقین سے تھا جن کے سرد مہری پر مبنی رویے کی وجہ سے بعض اوقات ملت اسلامیہ کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔ کئی موقعوں پر مختلف وجوہ کی بنا پر مدینہ کے قرب و جوار میں رہنے والے یہودی قبائل کو مدینے سے چلے جانے پر مجبور کر دیا گیا جب کہ شمال مغربی عرب میں آباد یہود ہتھیار ڈال کر جزیہ ادا کرنے پر رضامند ہو گئے۔ یہودیوں کے گڑھ خیبر کی فتح کا واقعہ، جس میں رسول کریمؐ کے چچا زاد بھائی اور آپؐ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کے شوہر حضرت علیؓ ابن ابی طالب نے بنیادی کردار ادا کیا، بعد کی مذہبی شاعری کا مستقل موضوع بن گیا اور اسے بعض اوقات رمز و کنائے کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

قریش مکہ نے محسوس کیا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قوت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے چناں چہ ۶۳۰ عیسوی میں جب آپ ؐ نے اپنے آبائی شہر کو فتح کیا تو اس موقعے پر کوئی مزاحمت نہ کی گئی بلکہ آپ ؐ کے کئی سخت مخالفین نے اسلام قبول کر لیا اور انہیں کشادہ دلی کے ساتھ نوازا گیا، خانہ کعبہ کو بتوں اور مورتیوں سے مکمل طور پر پاک کر دیا گیا اور اس وقت سے لے کر آج تک اسے مسلمانوں کے دین میں مقدس مقام کی حیثیت حاصل ہے اور وہاں کوئی مورتی اور

کوئی شبیہ موجود نہیں۔ دنیا بھر کے مسلمان آج بھی دن میں پانچ مرتبہ خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے اور زندگی میں کم سے کم ایک مرتبہ قمری سال کے آخری مہینے میں حج کے دوران خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں۔

مکہ کو فتح کرنے کے بعد رسول کریمؐ نے زیادہ عرصے تک وہاں قیام نہ کیا اور واپس مدینہ چلے گئے جہاں آپؐ کے اہل خاندان قیام پذیر تھے۔ جناب خدیجہؓ کی وفات کے بعد حضورؐ نے کئی شادیاں کیں۔ ان میں صرف آپؐ کے دوست حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی حضرت عائشہؓ کنواری تھیں جو شادی کے وقت کم سن اور اپنی گڑیوں کے ساتھ کھیلتی تھیں۔ آں حضرتؐ کو حضرت عائشہؓ کے ساتھ بہت انس تھا۔ دوسری ازواج مطہراتؓ ان مجاہدوں کی بیوائیں تھیں جو مختلف جنگوں میں شہید ہو گئے تھے۔ ان کے علاوہ حضرت زینبؓ بھی امہات المومنین میں شامل تھیں جو حضورؐ کے متبنیٰ بیٹے حضرت زیدؓ کی سابق بیوی تھیں۔ آپؐ کی قبطی لونڈی کے بطن سے، جسے مصر کے مقوقس نے آپؐ کو عطیے میں دیا تھا، آپؐ کے ایک صاحبزادے پیدا ہوئے لیکن وہ دو سال سے بھی کم عمر میں انتقال کر گئے۔ اگرچہ قرآن نے قانونی بیویوں کی تعداد کو چار تک محدود کر دیا ہے لیکن خود حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کا حق دے دیا گیا تھا۔ قرآن کریم کی بعض سورتوں سے آں حضرتؐ کے ازدواجی مسئلوں اور ازواج مطہراتؓ کے درمیان پائی جانے والی کشیدگیوں کا عندیہ ملتا ہے۔ حضورؐ کی ازواج مطہراتؓ کو امہات المومنینؓ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ (اور پیغمبر کی بیویاں مومنوں کی مائیں ہیں۔ سورہ الاحزاب آیت ۶۔ مترجم)۔ امہات المومنینؓ پر بعض خصوصی پابندیاں عاید تھیں، مثال کے طور پر رسول کریمؐ کی رحلت کے بعد انہیں دوبارہ شادی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ (اے ایمان والو! جب تک تمہیں اجازت نہ دی جائے تم نبیؐ کے گھروں میں نہ جایا کرو کھانے کے لیے ایسے وقت میں کہ اس کے پکنے کا انتظار کرتے رہو بلکہ جب بلایا جائے اور جب کھا چکو نکل کھڑے ہو، وہیں باتوں میں مشغول نہ ہو جایا کرو۔ نبیؐ کو تمہاری اس بات سے تکلیف ہوتی ہے تو وہ لحاظ کر جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ (بیان) حق میں کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ جب تم نبیؐ کی بیویوں سے کوئی چیز طلب کرو تو پردے کے پیچھے سے طلب کرو، تمہارے اور ان کے دلوں کے لیے کامل پاکیزگی یہی ہے، نہ تمہیں یہ جائز ہے کہ تم رسول اللہؐ کو تکلیف دو اور نہ تمہیں یہ حلال ہے کہ آپؐ کے بعد کسی بھی وقت آپؐ کی بیویوں سے نکاح کرو۔ (یاد رکھو) اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑا (گناہ) ہے۔ سورہ الاحزاب آیت ۵۳۔ مترجم)۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر وحی کے نزول کا سلسلہ عمر بھر جاری رہا۔ اپنے پیغمبرانہ کیریئر کے ابتدائی برسوں میں آپؐ پر جو سورتیں نازل ہوئیں، ان میں روز قیامت کی ہولناکیوں، خدا کی وحدانیت اور اس کائنات کی تخلیق اور اسے قائم رکھنے کے کام کو حیرت انگیز واقعہ قرار دیا گیا ہے۔ بحرانوں اور جبر و تعدی کی درمیانی مدت میں ان مصائب اور آلام کا تذکرہ کیا گیا ہے جو ماضی کے پیغمبروں کو برداشت کرنا پڑے تھے اور جنہیں رسول کریمؐ کی طرح

اپنے ہم وطنوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا، ان نبیوں کو بھی سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا لیکن آخر خدا نے انہیں دشمنوں پر فتح دلا دی۔ وحی الٰہی نے اہل مکہ کی بڑھتی ہوئی جارحیت کے باوجود اپنے منتخب راستے پر بدستور گامزن رہنے میں حضورؐ کی یقیناً مدد کی۔ مدینہ میں اسلام کے لیے باضابطہ طور پر ایک دستورالعمل تیار کرلیا گیا تھا چناں چہ اس زمانے میں نازل ہونے والی سورتوں اور آیات میں عام طور پر شہری مسائل کا حل پیش کیا گیا اور ایسے متعلقہ سیاسی اور سماجی سوال زیر بحث لائے گئے جو رسول کریمؐ کی طرف سے ایک سیاسی برادری کی قیادت کرنے کے نتیجے میں پیدا ہو گئے تھے۔ اس وقت جو قرآنی آیات نازل ہوئیں، ان میں حضورؐ کو ''اسوہ حسنہ'' کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ (یقیناً تمہارے لیے رسول اللہؐ میں عمدہ نمونہ (موجود) ہے ہر اس شخص کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی اور قیامت کے دن کی توقع رکھتا ہے اور بکثرت اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے۔ سورہ الاحزاب آیت ۲۱۔ مترجم)۔ خدا نے مسلمانوں کو رسول کریمؐ کی پیروی کرنے اور آپؐ کے اسوہ حسنہ پر چلنے کی ہدایت کی ہے کیوں کہ ''اس رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جو اطاعت کرے اسی نے اللہ کی فرماں برداری کی اور جو منہ پھیر لے تو ہم نے آپؐ کو کچھ ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔ سورہ النسا آیت ۸۰)۔ مسلمانوں کو یہ بھی بتایا گیا کہ نبی کریمؐ کو رحمت للعالمینؐ بنا کر بھیجا گیا ہے۔ (اور ہم نے آپؐ کو تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے۔ سورہ الانبیا آیت ۱۰۷)۔ اور یہ کہ خدا اور اس کے فرشتے حضورؐ پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ (اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اس نبیؐ پر رحمت بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم (بھی) ان پر درود بھیجو اور خوب سلام (بھی) بھیجتے رہا کرو۔ سورہ الاحزاب آیت ۵۶)۔

مغربی اسکالرز اکثر یہ سوال کرتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ کی وحی کے ذرائع کیا تھے اور قرآن کریم کا بظاہر بے ربط مواد کہاں سے نازل ہوا تھا؟ وہ اس بات پر بھی تعجب کا اظہار کرتے ہیں کہ قرآن میں موسیٰؑ، عیسیٰؑ، یوسفؑ اور سلیمانؑ جیسی شخصیات کا ذکر کیوں ہوا ہے حالاں کہ ان پیغمبروں کا تعلق یہودیوں اور عیسائیوں کی روایات سے ہے اور یہ کہ قرآن میں بیان کیے گئے واقعات تورات اور انجیل کے قصوں سے خاصے مختلف ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن حکیم میں اسرائیل کے عظیم پیغمبروں کا کوئی تذکرہ نہیں ہوا۔ پچھلے ۱۲۵ برسوں سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے مسیحی (نسطوری یا مونوفزائٹ) اور ربی یا یہودی ذرائع سے ارادی یا غیر ارادی طور پر مواد کو ''مستعار لینے'' پر مبنی خاصا لٹریچر لکھا جا رہا ہے جس سے مختلف اور جزوی طور پر متضاد نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ بہت سے اسکالرز Johann Fuck کے ساتھ اتفاق کریں گے کہ ''عقلی اور استدلالی سائنس کے ذرائع اس شخصیت کے اسرار کی پردہ کشائی کے لیے ناکافی ہیں اور ہم یہ تجزیہ نہیں کر سکتے کہ آپؐ کی روح کو کس شے سے مہمیز ملی جس کے ذریعے آپؐ ایک تکلیف دہ جدوجہد کے بعد ایمان و ایقان کی دولت سے بہرہ مند ہوئے اور آخر کار خدا نے انسانیت کو شعور و آگہی بخشنے کی غرض

سے آپؐ کو اپنا رسول منتخب کر لیا۔'' (Fuck: Die Originalitat des arabischen Propheten. p.145)۔

مسلمانوں کے نزدیک تورات وانجیل اور قرآن میں بیان کیے گئے بعض قصوں میں موجود تفاوت اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ قرآن کریم واقعی خدا کا کلام ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) امی (اسلامی روایت میں امی کا لفظ عام طور پر ناخواندہ اور ان پڑھ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے) ہونے کے ناتے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اس لیے آپؐ کو تورات اور انجیل میں بیان کیے گئے مضامین کا علم نہیں تھا لہٰذا اگر آپؐ پر خدا کا کلام براہ راست نازل نہ ہوا ہوتا تو آپؐ ان قصے کہانیوں کو کس طرح استعمال کر سکتے تھے؟ لیکن آں حضرتؐ کے لکھنے پڑھنے کے متعلق مسلمانوں کی روایات کے برعکس جرمن اسکالر Gunther Luling کا دعویٰ ہے کہ حضورؐ یہودیوں اور عیسائیوں کے آسمانی صحیفوں سے اچھی طرح واقف تھے اور آپؐ ان صحیفوں کے مندرجات کو بے تکلفی کے ساتھ استعمال کیا کرتے تھے۔ آں حضرت کی اس خصوصیت کی جو بھی تشریح کی جائے، واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں حضرت آدمؑ سے لے کر سابق پیغمبروں کے تمام قصے رسول کریمؐ کی حیات طیبہ کے لیے ایک نمونہ ثابت ہوئے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس بات پر آپ کا یقین پختہ ہو گیا کہ جس طرح پہلی قومیں اپنے پیغمبروں پر ایمان نہ لانے اور انہیں ایذائیں پہنچانے کے باعث تباہ ہو گئی تھیں، اسی طرح اگر اہل مکہ نے حضورؐ کے ذریعے بھیجے جانے والے خدائی پیغام کو قبول نہ کیا تو ان کا بھی یہی انجام ہو گا۔

۶۳۲ عیسوی میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دوبارہ حج کیا اور آپؐ نے جو مناسک ادا کیے، وہ حج کرنے والے تمام مسلمانوں کے لیے دائمی طور پر واجب قرار دیے گئے ہیں۔ مسلمانوں کی روایت کے مطابق اسی ''حجۃ الوداع'' کے موقعے پر خدا کی طرف سے یہ آخری وحی نازل ہوئی: ''آج میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا اور تم پر انعام بھرپور کر دیا اور تمہارے لیے اسلام کے دین ہونے پر رضامند ہو گیا۔'' (سورہ المائدہ، آیت ۳)۔

چند ہفتوں کے بعد ۸ جون ۶۳۲ عیسوی (گیارہ ہجری) کو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت عائشہؓ کے حجرے میں، جن کی عمر اس وقت تقریباً اٹھارہ برس تھی اور جو حضورؐ کی متعدد احادیث اور سرگزشتوں کی راوی ہیں، انتقال کر گئے۔ رسول کریمؐ اپنی ذات پر، جیسا کہ Fuck نے اپنے ناصحانہ مضمون میں لکھا ہے، قرآن کریم کی چھٹی سورہ الانعام کی آیت ۱۶۲ کا صحیح اطلاق کر سکتے تھے: ''آپؐ فرما دیجیے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب خالص اللہ ہی کا ہے جو سارے جہانوں کا مالک ہے۔''

گو کہ چودھویں صدی میں ابن تیمیہ جیسے بعض متشدد علما اور اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے وہابیوں نے مدینہ منورہ میں رسول کریمؐ کے روضہ اقدس پر مسلمان زائرین کی حاضری کے خلاف احتجاج میں آوازیں اٹھائی ہیں، اس کے باوجود رسول اللہؐ کی آخری آرام گاہ کو مقدس اور قابل احترام مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔

ہر زائر نبی کریمؐ کے آخری خطبے کی مناسبت سے روضہ مبارک کے سامنے کھڑے ہو کر یہ الفاظ کہتا ہے:

میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ اللہ کے نبیؐ ہیں۔ آپؐ نے ہمیں خدا کا پیغام پہنچا دیا ہے۔ خدا نے آپؐ پر جو اعتماد کیا، آپؐ اس پر پورا اترے ہیں۔ آپؐ نے امت مسلمہ کے ساتھ صلاح مشورہ کیا، اندھیروں کو دور کیا، تیرہ و تار دنیا کو منور کیا اور حکمت و دانائی کی باتیں کیں۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی جانشینی کے لیے کوئی قوانین مقرر نہیں کیے تھے۔ آپ کی چار صاحبزادیوں زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ اور فاطمہؓ میں سے صرف حضرت فاطمہؓ، جنہیں الزہرا یعنی روشن و تاباں اور تابندہ و فروزاں کہا جاتا تھا، حضورؐ کی وفات کے بعد زندہ رہیں۔ ان کی شادی آں حضرتؐ کے چچا زاد حضرت علیؓ کے ساتھ ہوئی تھی۔ وہ نبی کریمؐ کی رحلت کے تھوڑی دیر بعد وفات پا گئیں۔ اس علیل خاتون کی افسانوی شخصیت سے جلد ہی کئی معجزے منسوب ہو گئے اور شیعہ روایات میں خاص طور پر یہ کہا گیا کہ حضرت فاطمہؓ کی پیدائش کے وقت نور کا ایک ہالہ بن گیا تھا۔ وہ کلی طور پر معصوم اور مخصوص ایام سے مبرّی تھیں اور ان کے بیٹے ان کی بائیں ران کے ذریعے پیدا ہوئے تھے۔ چناں چہ حضرت فاطمہؓ کو بتول ''کنواری'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے چھوٹے صاحبزادے امام حسینؓ کی شہادت کے بعد انہیں حقیقی معنوں میں Mater Dolorosa کا درجہ مل گیا۔ حضرت فاطمہؓ کو ''ام ابیہاؓ''، یعنی اپنے باپ کی ماں کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات کے بعد پیدا ہونے والی افراتفری کی فضا میں حضورؐ کے سسر حضرت ابوبکرؓ نے سوگوار مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے یہ سخت جملے کہے: ''لوگو! جو لوگ محمدؐ کی عبادت و پرستش کرتے تھے تو سن لیں، محمدؐ تو مر چکے ہیں اور جو لوگ اللہ کی عبادت کرتے ہیں تو اللہ بے شک زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں۔'' حضرت ابوبکرؓ کو، جنہیں ''الصدیق'' کے لقب سے پکارا جاتا تھا، رسول اللہؐ کا پہلا خلیفہ منتخب کر لیا گیا۔ ۶۳۴ عیسوی میں ان کی وفات کے بعد آں حضرتؐ کے ایک اور سسر حضرت عمرؓ ابن الخطاب خلیفہ چن لیے گئے۔ جناب عمرؓ کو الفاروق ''سچ اور جھوٹ کے درمیان امتیاز کرنے والا'' کہا جاتا تھا۔ انہوں نے ظہور اسلام کے شروع میں قرآن کریم کو سن کر اسلام قبول کر لیا تھا۔ طلوع اسلام کے ابتدائی دور میں وہ غالباً مسلمانوں کی سب سے رعب دار شخصیت تھے۔ شروع میں وہ رسول کریمؐ کے سب سے کٹر دشمن تھے لیکن جب وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تو دین حق کی شمشیر برہنہ اور اسلام کے نہایت سرگرم اور فعال حامی بن گئے۔ لٹریچر اور پرہیز گاری میں ان کا شمار عدل و انصاف کے زمرے میں ہوتا ہے جو اپنے خاندان والوں کو بھی معاف نہیں کرتے تھے۔ امت مسلمہ کو منظم کرنے اور امن و امان قائم کرنے کے ضمن میں مغربی مسیحیت میں ان کا موازنہ سینٹ پال سے کیا جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرآنی احکام پر

عمل درآمد کے سلسلے میں وہ سینٹ پال سے بھی سخت گیر واقع ہوئے تھے۔ شیعہ حضورؐ کی وفات کے بعد حضرت فاطمہؓ کے ساتھ ان کے فرضی سخت رویے کی بنا پر حضرت عمرؓ سے شدید نفرت کرتے ہیں۔

جناب عمرؓ کو ایک ایرانی غلام نے ۶۴۴ عیسوی میں شہید کر دیا اور مکہ کے قدیمی اعلیٰ طبقے کے ایک فرد حضرت عثمانؓ ابن عفان حضرت عمرؓ کے جانشین بن گئے۔ ان کا انتخاب متنازع تھا کیوں کہ بہت سے متقی مسلمانوں کو ابتدائے اسلام میں حضرت عثمانؓ کے خاندان کی طرف سے رسول کریمؐ کی مخالفت ابھی یاد تھی۔ رسول اللہؐ کی دو صاحبزادیوں حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ کے ساتھ حضرت عثمانؓ کی یکے بعد دیگرے شادیاں ہوئی تھیں اس لیے انہیں ذوالنورین ''دونوروں کے مالک'' کہا جاتا تھا۔ (ترک عثمانی عام طور پر عثمان کے نام کے ساتھ نورالدین کے لقب کا اضافہ کرتے ہیں جس کا مخفف نوری یا نور ہے)۔ حضرت عثمانؓ ابن عفان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کو، جو ۱۱۴ سورتوں پر مشتمل ہے، موجودہ شکل میں ترتیب دیا تھا۔ پہلی سورہ فاتحہ ایک مختصر دعا ہے۔ ۱۱۲ ویں سورہ الاخلاص میں خدا کی وحدانیت کے اقرار کے بعد دو مختصر سورتیں المعوذتین آتی ہیں جن میں انسانوں اور جنوں کی نظر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی گئی ہے۔

۶۵۶ عیسوی میں حضرت عثمانؓ کو بھی شہید کر دیا گیا جن کے بعد رسول اللہؐ کے چچازاد اور داماد حضرت علیؓ ابن ابوطالب ان کے جانشین بن گئے جو مسلمانوں کے ایک گروہ کے نزدیک پیغمبر اسلامؐ کے جائز قائم مقام تھے۔ جو لوگ حضرت علیؓ کے ساتھ رہے اور جن کا دعویٰ تھا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو پہلا خلیفہ ہونا چاہیے تھا، انہیں شیعان علیؓ یا صرف شیعہ کہا جاتا ہے۔ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ اور ان کے دو بیٹوں امام حسنؓ اور حسینؓ کو شیعوں میں مرکزی حیثیت حاصل ہے اور واقعہ یہ ہے کہ شیعہ اسلام کے بعض طبقوں میں یہ شخصیات حقیقی معنوں میں افسانوی حیثیت کی حامل ہیں بلکہ بعض اوقات تو حضرت علیؓ کو خود رسول کریمؐ سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور ان کے دو صاحبزادوں کو حضورؐ کے ساتھ شامل کر کے پنجتن یا چادر والے لوگ اہل الکسا کہا جاتا ہے جن کے بارے میں روایت ہے کہ آں حضرتؐ نے ایک مرتبہ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ آپؐ ان شخصیات کا خصوصی لحاظ کرتے ہیں، انہیں اپنی چادر میں لے لیا تھا۔ انہیں عام طور پر رسول اللہؐ کے انتہائی قریبی اہل خاندان کے برابر سمجھا جاتا ہے جن کا ذکر قرآن حکیم میں کیا گیا ہے۔

نبی کریمؐ کے اہل خاندان کے ساتھ عقیدت اور شیفتگی کا اظہار مذہبی نقطہ نظر سے نہیں کیا جاتا (اگرچہ شیعوں کا اظہار عقیدت ''سنی'' طبقے کے مقابلے میں مجموعی اعتبار سے کہیں زیادہ متنوع اور رنگین ہوتا ہے) بلکہ اس عنصر نے اسلام کی تاریخ میں فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ شیعہ فرقے کا شروع ہی سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ صرف حضرت علی کرم اللہ

وجہ ہی جائز خلیفہ تھے چناں چہ وہ پہلے تینوں خلفا، خاص طور پر حضرت عثمانؓ کی خلافت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے اور کھلے بندوں ان کی مذمت کرتے ہیں البتہ سنی مسلمان خلفائے راشدینؓ کی یا جیسا کہ فارسی میں انہیں ''چار یار'' کہا جاتا ہے، بزرگی اور فضیلت کا ہمیشہ اعلان کرتے ہیں لیکن ان کے دلوں میں حضرت علیؓ کا بھی خصوصی مقام ہے۔ شیعہ فرقے کے پیروکاروں کا کہنا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے زندگی کے آخری برس میں ۱۸ ذی الحج کو خم غدیر پر اجتماع کے دوران حضرت علیؓ کو اپنا جانشین بنانے کا اعلان کیا تھا۔ ۶۶۱ عیسوی میں جب مخالف باغی فرقے کے ایک شخص نے حضرت علیؓ کو شہید کر دیا تو حضورؐ کی جانشینی کے سوال پر دو انتہا پسند گروپوں کے درمیان تصادم ہو گیا۔ اس مرتبہ بھی جائز وارث کے حامی شیعوں اور ''جمہوریت پسند'' خارجیوں نے اس نظریے کا دفاع کیا کہ ملت اسلامیہ کی قیادت کرنے کا اہل صرف معزز ترین مسلمان ہے ''خواہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو۔'' لیکن مسلمانوں کی اکثریت نے، جو خود کو اہل السنہ والجماعۃ یعنی ''جو لوگ رسول کریمؐ کی سنت پر کاربند ہیں اور جن کا تعلق امت مسلمہ سے ہے، انتہا پسند خارجیوں پر جلد ہی قابو پا لیا۔ خارجی مسلمانوں کے مختصر اور منتشر گروپ عبادی کے نام سے آج بھی شمالی افریقا میں موجود ہیں۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد مکہ کے حکمران خاندان کے جانشین بنو امیہ، جو انتہا پسند شیعوں کے لیے قابل قبول نہیں تھے، برسراقتدار آ گئے اور انہوں نے دمشق کو اپنا دارالحکومت بنا لیا۔ پہلے اموی خلیفہ معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے بڑے بیٹے حضرت حسنؓ کو خلافت سے دست بردار ہونے پر آمادہ کر لیا اور وہ کچھ دیر بعد انتقال کر گئے (شیعہ روایت کے مطابق انہیں زہر دیا گیا تھا)۔ ان کے چھوٹے بھائی حضرت حسینؓ نے، جو حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ کے بعد شیعوں کے تیسرے امام (لفظ امام کے لغوی معنی نماز کی پیشوائی کرنے والا شخص اور عمومی معنی ملت اسلامیہ کا مذہبی رہنما ہے) ہیں، ۶۸۰ عیسوی کے موسم خزاں میں معاویہؓ کی وفات کے بعد بنو امیہ کے ساتھ ایک اور جنگ لڑنے کی کوشش کی۔ امام حسینؓ اور آپ کے پیروکار اپنے صدر مقام کوفہ (عراق) سے کربلا پہنچے جہاں ۱۰ محرم (۱۰ اکتوبر ۶۸۰ء) کو لڑائی میں ان کی اکثریت کو شہید کر دیا گیا۔ (فاضل مصنفہ سے اس جگہ غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت امام حسینؓ پہلے مدینہ سے مکہ پہنچے جہاں چند ماہ قیام کے بعد آپ کوفہ روانہ ہو گئے لیکن کربلا کے مقام پر انہیں روک لیا گیا۔ مترجم)۔ کربلا کا واقعہ شیعہ حلقوں کے خصوصی تقوے کا نقطہ آغاز ثابت ہوا اور اس کی وجہ سے رقت انگیز شاعری اور دل فگار نثر معرض وجود میں آئی، خاص طور پر ایران میں امام حسینؓ اور آپ کے اہل خاندان کے مصائب کو ڈرامائی انداز میں پیش کرنے کا رجحان فروغ پذیر ہوا۔ فارسی اور اردو لٹریچر میں ایک نئی صنف مرثیہ نگاری وجود میں آ گئی جس میں شہدائے کربلا کے المناک انجام کو مخصوص انداز میں پیش کیا گیا اور یہ تاثر دیا گیا کہ اس واقعے نے عالمی تاریخ کا رخ موڑ دیا ہے، امام حسینؓ کے لیے آنسو بہانے سے جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ حضرت مریم

کی طرح حضرت فاطمہؓ بھی ان لوگوں کی شفاعت کریں گی جو ان کے بیٹے کے لیے آنسو بہاتے ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شیعوں میں کئی شاخیں بن گئیں۔ اثنا عشریہ اماموں کے سلسلے کو بارہویں امام تک پہنچایا جاتا ہے جو ۸۷۳ عیسوی میں پراسرار طور پر غائب ہو گئے تھے اور اس وقت سے ایک غیر مرئی مقام سے دنیا پر حکومت کر رہے ہیں۔ اس شاخ کو ۱۵۰۱ عیسوی سے ایران کا سرکاری مذہب بنا دیا گیا ہے۔ ہندوستان، خاص طور پر لکھنو اور حیدر آباد دکن کے علاقوں میں بھی اس شاخ کے بہت سے پیروکار موجود ہیں۔ ایک اور شاخ کے مطابق پانچویں امامت کا سلسلہ پانچویں امام حضرت زیدؓ پر ختم ہو جاتا ہے جو کربلا کی لڑائی کے بعد امام حسینؓ کے زندہ بچ جانے والے واحد صاحبزادے کے بیٹے تھے۔ یہ شاخ ۱۹۶۴ عیسوی تک یمن پر حکومت کرتی رہی ہے اور قرون وسطٰی کے ایران میں بھی اس کی کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں موجود تھیں۔

ساتویں امام اسماعیل کے پیروکار شیعہ گروپ مختلف ناموں سے موسوم ہیں۔ ان میں سے ایک شاخ نے مصر میں فاطمی سلطنت کی بنیاد رکھی جہاں ۱۰۹۴ عیسوی کے بعد اس شاخ میں پھوٹ پڑنے کے نتیجے میں موجودہ گروپ بن گئے جن میں آغا خان کے پیروکار نزاری اور بوہرے شامل ہیں۔ ایران اور مشرق قریب میں قرون وسطٰی کے دوران اسماعیلی خوف اور دہشت کی علامت بن کر ''قاتل'' کے نام سے مشہور ہو گئے۔ یہ فرقہ حال ہی میں ایک ترقی پسند اور ماڈرن جماعت میں تبدیل ہو گیا ہے اور ان کا بے حد دلچسپ، مخفی اور دقیق مذہبی لٹریچر آہستہ آہستہ منظر عام پر آ رہا ہے، جس سے ہندوستان میں خاص طور پر ان کے فلسفیانہ افکار اور شاعرانہ رجحانات کی عکاسی ہوتی ہے۔

لیکن نہ صرف شیعہ بلکہ سنی بھی، جو رسول اللہؐ کی سنت پر کار بند ہیں، حضورؐ کے اہل بیت کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے ہیں کیوں کہ جیسا کہ عظیم صوفی حلاج نے کہا ہے: ''خدا نے ایسی کوئی چیز تخلیق نہیں کی جو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) اور آپؐ کے اہل بیت سے زیادہ عزیز ہو۔'' حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی اولاد، خاص طور پر امام حسینؓ کے بچوں کو سید کہا جاتا ہے اور ان کی بڑی عزت اور تکریم کی جاتی ہے، ایک سید کی غیر سید کے ساتھ کیسے شادی ہو سکتی ہے؟ بہت سے عارفوں اور صوفیوں کا تعلق سید گھرانوں سے ہے تاہم کئی دقیقہ شناس اسکالرز یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیے۔ مسلمان غریب سید خاندانوں کے ساتھ بھی گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ مجھے حال ہی میں دکن میں یہ بتایا گیا ہے کہ سید گھرانوں کی نوکرانیوں سے گھروں میں کوئی گندہ یا نیچ درجے کا کام نہیں کرایا جاتا۔ ان لوگوں سے اظہار عقیدت کے پیچھے یہ نظریہ کارفرما ہے کہ رسول کریمؐ کی بعض برکات آپؐ کی اولاد میں بھی پائی جاتی ہیں اس لیے حضورؐ کی نسبت سے ان کا بھی احترام کرنا چاہیے۔

سید خاندانوں کا اہم سیاسی رول آج تک جاری ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے قریبی

اہل خاندان بعض روحانی رویوں کی علامت بن گئے ہیں یا ان کا کردار مختلف نظریات کی نمائندگی کرتا ہے۔ حضورؐ کے چچا اور پکے دشمن ابولہب پر قرآن کریم میں خدا کی طرف سے لعنت بھیجی گئی ہے۔ (ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ (خود) ہلاک ہو گیا۔ نہ تو اس کا مال اس کے کام آیا اور نہ اس کی کمائی۔ وہ عنقریب بھڑکنے والی آگ میں جائے گا۔ اور اس کی بیوی بھی (جائے گی) جو لکڑیاں ڈھونے والی ہے، اس کی گردن میں پوست کھجور کی بٹی ہوئی رسی ہوگی ــــ سورہ تبت۔ مترجم)۔ چناں چہ ابولہب اور اس کی بیوی (ام جمیل بنت حرب۔ مترجم) کافروں کی نظیر اور نمونہ بن گئی جنہوں نے پوری قوت کے ساتھ نئے دین کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور رسول اللہ کا راستہ روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ابولہب کو آں حضرتؐ کی حیات مقدسہ کی تمثیل میں ایک مثالی دشمن کی حیثیت حاصل ہے۔ مولانا رومی شعلہ فروزاں کے باپ ابولہب کے نام سے یہ مطلب اخذ کرتے ہیں کہ غالباً وہ واحد شخص ہے جسے ربانی محبت کے شعلے نے کبھی نہیں چھوا۔

مثبت علامتی شخصیتوں میں حبشی موذن بلالؓ بن رباح شامل ہیں جنہیں حضورؐ اکثر فرمایا کرتے تھے: ''بلال! ہمیں اذان کے ذریعے مسرور اور شاداب کرو۔'' اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معراج کے سفر کی یاد تازہ کرتی ہے جب آں حضرتؐ کسی پردے کے بغیر خدا کے ساتھ براہ راست ہم کلام ہوئے تھے۔ حضرت بلالؓ حبشہ کے غلام تھے جنہوں نے ابتدائی مرحلے پر ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ مکہ میں ان کا مالک انہیں سخت ایذائیں پہنچاتا یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ نے انہیں خرید کر آزاد کر دیا۔ عوامی روایت میں وہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے والے سیاہ فام لوگوں کی علامت بن گئے جنہیں کسی تذبذب کے بغیر امت مسلمہ میں شامل کر لیا گیا کیوں کہ اسلام رنگ و نسل کی بنیاد پر کسی کے ساتھ امتیاز نہیں کرتا۔ سنائی نے تقریباً ۱۱۰۰ عیسوی میں یہاں تک کہہ دیا تھا:

ترجمہ: بلالؓ کی چپل دو ہزار رستموں سے بہتر ہے

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سیاہ فام غلام، جسے اسلام قبول کرنے پر آزادی دلا دی گئی تھی، ایرانی تاریخ کے ظہور اسلام سے پہلے کے سب سے بڑے افسانوی ہیرو کے مقابلے میں کہیں زیادہ افضل اور بہتر ہے۔ حضرت بلالؓ افریقا اور حبشہ کے بہت سے مسلمان گروپوں کے لیے خدا رسیدہ شخص بن گئے اور انہیں عموماً تقوے اور پرہیز گاری کا نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ چناں چہ پورے عالم اسلام، خاص طور پر بھارت اور پاکستان میں والدین اکثر اپنے بچوں کا نام بلال رکھتے ہیں۔ محمد اقبالؒ نے حضرت بلالؓ کے متعلق دو نظمیں لکھ کر ان کے نام کی مقبولیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ اب سیاہ فام مسلمان اپنے لیے Bilalian کی اصطلاح استعمال کرنے لگے ہیں، ان کے جریدے کا نام Bilalian News رکھ دیا گیا ہے۔ ایک Bilalian College اور Bilalian Journalists کے نام بھی سننے میں آ رہے ہیں۔

رسول کریمؐ کے ایک اور صحابی حضرت ابوذرؓ تھے۔ وہ دولت مند لوگوں کو قرآن حکیم کی یہ تعلیم بار بار یاد دلاتے کہ وہ اپنے خزانوں سے دست بردار ہو کر خدا اور دوسری دنیا پر اپنی توجہ مرکوز کریں۔ غرض ابوذرؓ ابتدائی زہد و فقر کا اولیں نمونہ بن گئے۔ لوئیس میسینیون Louis Massignon نے حضرت ابوذرؓ کو اس زمانے کا سوشلسٹ قرار دیا ہے جب سوشلسٹ کی اصطلاح ایجاد نہیں ہوئی تھی۔

حضرت سلمان فارسیؓ کا رول بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے جنہیں ایرانی روایت میں سلمان پاک کہا جاتا ہے۔ مغربی اسکالروں نے سلمان فارسیؓ پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ وہ ایران کے ایک حجام تھے جنہوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ بعد میں وہ اسلام کی ابتدائی تاریخ کے اہم ماخذ ثابت ہوئے۔ وہ مسلمان ہونے والے تمام غیر ملکیوں کے لیے ایک نمونہ تھے۔ یہ سب غیر ملکی باشندے اپنا علم اور ہنر بھی اپنے ساتھ لائے جس سے مسلمانوں نے اپنی عملی زندگی میں بھر پور استفادہ کیا۔ یاد رہے کہ یہ سلمان فارسیؓ ہی تھے جنہوں نے قریش مکہ کی طرف سے مدینہ کے محاصرے سے پہلے مدینہ کے دفاع کے لیے حضورؐ کو خندق کھودنے کا مشورہ دیا تھا۔ ایک حجام ہونے کے ناتے انہیں رسول کریمؐ کے بالوں کو چھونے کا اعزاز حاصل تھا۔ بعد میں وہ حجاموں اور دوسرے ہنر مند طبقوں کے ولی اور سرپرست بن گئے۔ غرض سلمان فارسیؓ کو اسلام میں ارباب فن کا پہلا بزرگ کہا جا سکتا ہے۔

آخر میں اویس قرنیؓ کا تذکرہ ضروری ہے کیوں کہ ان کے نام کو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تصوفانہ زندگی میں زبردست اہمیت حاصل ہے۔ حضرت اویسؓ یمن میں رہتے تھے اور وہ آں حضرتؐ کے ساتھ ملاقات کے بغیر ہی مسلمان ہو گئے تھے۔ ایک روایت کے مطابق نبی کریمؐ نے اویس قرنیؓ کے بارے میں کہا تھا: ''میں یمن سے آنے والے نفس الرحمٰن (خدا کے تنفس) کو محسوس کر رہا ہوں۔'' تصوف کی روایت میں اویسؓ ان لوگوں کے لیے بہترین نمونہ ہیں جو کسی زندہ یا کبار ہستی کے ساتھ ملاقات کے بغیر تصوف کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ اویسی طریقے (ترکی میں ویسی) پر کاربند لوگوں کا کوئی مخصوص استاد نہیں ہوتا بلکہ خود خدا یا خضرؑ تصوف کی راہ میں ان کی براہ راست رہنمائی کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہؐ کے بہت سے ایسے صحابہ کرامؓ موجود ہیں جو جنگجو، محدث اور وفادار ساتھی ہیں۔ ان میں عشرہ مبشرہ (وہ دس خوش نصیب صحابیؓ جنہیں نبی کریمؐ نے جنت کی بشارت دی تھی) بھی شامل ہیں جو تمام اسلامی ملکوں میں آج تک زندہ ہیں یہاں تک کہ ہماری صدی میں اردو کا ایک شاعر پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ ساتھ بلالؓ اور اویسؓ کا ذکر بھی نہایت عقیدت و احترام سے کرتا ہے۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، اُسوہ حسنہ

اس حقیقت کو ہمیشہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ آپؐ غیر معمولی خوبیوں سے متصف ہیں۔ آپؐ صرف خدا کے بندے تھے جن پر وحی نازل ہوتی تھی۔ (آپؐ کہہ دیجیے کہ میں تو تم ہی جیسا انسان ہوں، مجھ پر وحی نازل کی جاتی ہے کہ تم سب کا معبود ایک اللہ ہی ہے سو تم اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور اس سے گناہوں کی معافی چاہو، اور ان مشرکوں کے لیے (بڑی ہی) خرابی ہے۔ سورہ حم السجدہ آیت ۶۔ مترجم)۔ اور جب قریش مکہ رسول اللہؐ سے کہتے کہ آپؐ معجزے دکھائیں تو حضورؐ فرمایا کرتے تھے کہ آپ کی زندگی میں واحد معجزہ یہ ہے کہ آپؐ پر صاف عربی زبان میں قرآن کریم نازل ہوا ہے جس کی نقل کرنا ممکن نہیں ہے (کہہ دیجیے کہ اگر تمام انسان اور کل جن مل کر اس قرآن کی مثل لانا چاہیں تو ان سب سے اس کی مثل لانا ناممکن ہے گو وہ (آپس میں) ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔ سورہ بنی اسرائیل آیت ۸۸۔ مترجم)۔ آں حضرتؐ جانتے تھے کہ آپؐ خدا اور انسانوں کے درمیان محض واسطہ ہیں۔ جب حضورؐ کے ہم وطنوں نے آپؐ سے کہا کہ آپؐ اپنے پیغام کے ثبوت میں معجزے دکھائیں تو آپؐ پر یہ وحی نازل ہوئی:

''اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان پر کوئی معجزہ کیوں نازل نہیں کیا گیا ان کے رب کی طرف سے، آپؐ فرما دیجیے کہ اللہ تعالیٰ کو بے شک پوری قوت ہے اس پر کہ وہ معجزہ نازل فرما دے لیکن ان میں سے اکثر بے خبر ہیں۔'' (سورہ الانعام، آیت ۳۷)۔ عرب جس قدر فصیح و بلیغ ہوں اور اپنی اعلیٰ روایتی شاعری پر انہیں کتنا ہی عبور کیوں نہ حاصل ہو، وہ ایسا ایک جملہ بھی تخلیق نہیں کر سکتے جو اسلوب اور نفسِ مضمون کے اعتبار سے قرآن کریم کا مقابلہ کر سکے۔

مسیحیت میں جو مقام عیسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا ہے، وہی مرکزی پوزیشن قرآن مجید کو دین اسلام میں حاصل ہے۔ حضرت عیسیٰؑ الہامی کلام کی انسانی شکل جب کہ قرآن (ہیری وولف سن کی اصطلاح میں) ربانی کلام کی مخفی صورت

ہے۔لیکن اس کے برعکس حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور عیسائیت کے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے درمیان کوئی مماثلت نہیں پائی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان عیسائیوں کی طرح اپنے لیے ''محمڈن'' کی اصطلاح استعمال کرنے سے گریز کرتے ہیں۔مسلمانوں کا استدلال یہ ہے کہ چوں کہ وہ ''طریقہ محمدی'' پر کاربند ہیں، اس لیے وہ ''محمدی'' کہلانا پسند کرتے ہیں۔صوفیائے کرام نے بھی یہی طرزِ عمل اختیار کیا ہے اور وہ زندگی کے ہر شعبے میں رسول اللہؐ کی سنت کی پیروی کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ چناں چہ قرونِ وسطیٰ کے ایک صوفی شمس تبریزؒ نے کہا ہے:

''محمدی وہ ہے جو دل شکستہ ہو...... جسے دل کی اتھاہ گہرائیوں تک رسائی حاصل ہو اور جو ناحق محمدی کے الفاظ کہہ سکے۔''

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جانتے تھے اور قرآن کریم میں آپؐ کو بار بار یاد دلایا گیا ہے کہ آپؐ صرف ایک انسان ہیں اور اللہ نے آپؐ کو یہ خصوصی امتیاز بخشا ہے کہ آپؐ پر وحی نازل ہوتی ہے: ''آپؐ کہہ دیجیے کہ نہ تو میں تم سے کہتا ہوں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف جو کچھ میرے پاس وحی آتی ہے، اس کا اتباع کرتا ہوں۔آپؐ کہیے کہ اندھا اور بینا کہیں برابر ہوسکتا ہے۔سو کیا تم غور نہیں کرتے۔سورہ الانعام آیت ۵۰)۔حضورؐ کو یہ یاددہانی بھی کرائی گئی کہ صرف خدا ہی بنی نوع انسان کی رہنمائی کرسکتا ہے: ''آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں کرسکتے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی جسے چاہے ہدایت کرتا ہے، ہدایت والوں سے وہی خوب آگاہ ہے۔'' (سورہ القصص آیت ۵۶)۔خدا نے وحی کے ذریعے رسول کریمؐ کو آگاہ کیا کہ ''یقیناً تم سب کا معبود ایک ہی ہے۔'' (سورہ الصفّٰت آیت ۴)۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ہدایت کی کہ آپؐ تبلیغ اسلام کے دوران خدا کی وحدانیت پر کوئی سودے بازی نہ کریں اور بندوں سے کہیں کہ وہ ایک خدا کی کامل اطاعت کریں جو خالق، انسانوں کی دست گیری کرنے والا اور منصف ہے۔

نبی کریمؐ نے محسوس کیا کہ آپؐ کو جو بھی انعام واکرام ملا ہے، وہ خدائی نوازشات ہیں جس کے آپؐ مستحق نہیں تھے لیکن خدا نے اپنے فضل وکرم سے آپؐ کو اپنی نمائندگی کے لیے منتخب کیا ہے کیوں کہ خدا آپؐ کی رہنمائی کرتا ہے: ''اور اگر ہم چاہیں تو جو وحی آپؐ کی طرف ہم نے اتاری ہے سب سلب کرلیں پھر آپؐ کو اس کے لیے ہمارے مقابلے میں کوئی حمایتی میسر نہ آسکے۔'' (سورہ بنی اسرائیل آیت ۸۶)۔رسول اللہؐ جانتے تھے کہ آپ کو ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ آپؐ پر ایسا قرآن نازل ہوگا: ''آپؐ کو تو کبھی اس کا خیال بھی نہ گزرا تھا کہ آپؐ کی طرف کتاب نازل فرمائی جائے گی لیکن یہ آپؐ کے رب کی مہربانی سے اترا۔اب آپؐ کو ہرگز کافروں کا مددگار نہ ہونا چاہیے۔(سورہ القصص آیت ۸۶)۔اور جب اہل مکہ نے آپؐ کا تمسخر اڑایا اور بار بار حضورؐ سے یہ استفسار کیا کہ قیامت کب آئے گی ـــ وہ ہولناک گھڑی جس کا اظہار آپؐ خوفناک لفظوں میں تسلسل کے ساتھ کرتے رہے ہیں تو نبی کریمؐ کو پھر یہ دہرانا پڑا کہ قیامت کے

بارے میں تو آپ کو بھی مطلع نہیں کیا گیا اور یہ کہ آپ تو محض کھلم کھلا آگاہ کر دینے والے ہیں: "انہوں نے کہا کہ اس پر کچھ نشانیاں (معجزات) اس کے رب کی طرف سے کیوں نہیں اتاری گئیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ نشانیاں تو سب اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں، میں تو صرف کھلم کھلا آگاہ کر دینے والا ہوں۔" (سورہ العنکبوت آیت ۵۰)۔ "لوگ آپؐ سے قیامت کے واقع ہونے کا وقت دریافت کرتے ہیں۔ آپؐ کو اس کے بیان کرنے سے کیا تعلق۔ اس کے علم کی انتہا تو اللہ کی جانب ہے۔ آپؐ تو صرف اس سے ڈرتے رہنے والوں کو آگاہ کرنے والے ہیں۔" (سورہ النزٰعت آیات ۴۲ تا ۴۵)۔

اس کے باوجود قرآن حکیم میں کئی ایسی آیتیں موجود ہیں جن سے آں حضرتؐ کے غیر معمولی منصب کا عندیہ ملتا ہے۔ جس طرح خدا نے آدم علیہ السلام کو تمام نام سکھائے (اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام نام سکھا کر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا، اگر تم سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ سورہ البقرۃ آیت ۳۱) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قرآن پڑھایا۔ (تو پڑھتا رہ تیرا رب بڑے کرم والا ہے۔ سورہ العلق آیت ۳)۔ خدا نے حضورؐ کو رحمت للعالمین بنا کر بھیجا ہے (اور ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے۔ سورہ الانبیا آیت ۱۰۷)۔ اور خدا اور اس کے فرشتے رسول کریمؐ پر درود و سلام بھیجتے رہتے ہیں (اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اس نبیؐ پر رحمت بھیجتے ہیں اور اے ایمان والو! تم (بھی) ان پر درود بھیجو اور خوب سلام بھیجتے رہا کرو۔ سورہ الاحزاب آیت ۵۶)۔ اور بے شک تو بہت بڑے (عمدہ) اخلاق پر ہے۔ (سورہ القلم آیت ۴)۔ خدا نے قرآن پاک میں کئی مرتبہ یہ حکم دیا ہے: "اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔" یہ قرآنی آیات حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ گہری عقیدت کی بنیاد بن گئیں اور جلد ہی دوسرے پیغمبروں کے مقابلے میں آپؐ کی کہیں زیادہ توقیر ہونے لگی بلکہ آج بھی دنیا بھر کے مسلمان نبی کریمؐ کی کسی چیز یا آپؐ سے منسوب کسی بھی شے کے نام کے ساتھ شریف کے لفظ کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم کی مختصر آیات کی تفسیر کے دوران طویل افسانوی داستانوں کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس طرح رسول کریمؐ کے گرد قوس قزح کا ہالہ بن گیا۔

حضورؐ کی اطاعت اور فرماں برداری کو اسلامی تقوے اور روحانی زندگی میں نہایت اہم بلکہ مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ کیا سورہ آل عمران کی ۲۹ ویں آیت میں یہ نہیں کہا گیا: "کہہ دیجیے! اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو، خود اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرما دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔"

کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ (اللہ کے سوا پرستش کے لائق کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں) دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کے دوسرے حصے محمد رسول اللہ کی بدولت اسلام کو ایک امتیازی دین کا مرتبہ حاصل ہے۔

Nathan Soderblom کے مطابق پیغمبر اسلامؐ کی شخصیت خدا کی سرگرمی کا ایک حصہ ہے۔ خدا نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دوسرے تمام پیغمبروں پر فضیلت دی ہے اور حضورؐ حقیقی معنوں میں خدا کے منتخب پیغمبر (المصطفیٰ) ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ؐ کی سنت مسلمانوں کے لیے بہترین نمونہ ہے اور جیسا کہ نبی کریمؐ نے فرمایا ہے: ''جو میری اتباع کرے، اسے مجھ سے محبت ہے اور جو میری سنت سے محبت نہیں کرتا، اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔'' قرآن کریم میں بھی آں حضرتؐ کے اسوہ حسنہ کو ایک خوب صورت نمونہ قرار دیا گیا ہے: یقیناً تمہارے لیے رسول اللہؐ میں عمدہ نمونہ (موجود) ہے۔ (سورہ الاحزاب آیت ۲۱)۔

دین اسلام کے کلاسیکل نظریے کا ادراک حاصل کرنے کے لیے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت، آپ ؐ کے فعل اور قول کے علاوہ بعض حقائق کی خاموش منظوری شامل ہے۔ ابتدائے اسلام ہی سے آپ ؐ کے طرزِ عمل کی تاریخی تناظر میں تصدیق کرنے کی پوری کوشش کی گئی، اس عمل کا آغاز ظہورِ اسلام کے بعد دوسری صدی ہجری سے ہو گیا اور آنے والی نسلوں پر سنت رسول اللہؐ کی اہمیت پوری طرح واضح تھی۔ آں حضرتؐ کے اسوہ حسنہ کی اہمیت کے پیش نظر حدیث کے علم کو اسلامی کلچر میں بتدریج مرکزی مقام حاصل ہو گیا۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حدیث مبارکہ آپ ؐ کے اس قول و فعل پر مبنی ہے جسے حضورؐ کے کسی با اعتماد صحابیؓ نے اگلی نسل کے کسی شخص کے سامنے بیان کیا ہو چناں چہ آں حضرتؐ کے صحابہ کرامؓ نبی کریمؐ کی روایات کا سب سے اہم ذریعہ ہیں۔ حضورؐ کی حدیث مبارکہ کا تعلق عبادات کے ضمن میں کسی مسئلے، ایمان اور نظریات کی تفصیلات، اگلی دنیا میں ملنے والی سزاؤں یا آں حضرتؐ کے کھانے پینے، سونے یا صحابہؓ کو دی جانے والی ہدایات سے ہو سکتا ہے۔ حدیث کے راویوں کا سلسلہ (اسناد) نسل در نسل آگے بڑھتا جاتا ہے اور یہ کام نہایت منظم انداز میں باہم مربوط ہے۔ اسلام کی تیسری صدی (نویں صدی عیسوی) کے دوران، جب احادیث کے سب سے ضخیم مجموعے مرتب ہوئے، ایک مثالی حدیث کا نمونہ اس طرح ہے: اے نے کہا: میں نے بی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اس نے سی سے یہ سنا کہ ڈی نے اسے بتایا کہ ای نے بیان کیا۔ ایف نے کہا کہ جی نے اس طرح روایت بیان کی: میں نے ابوہریرہؓ سے سنا ہے کہ رسول اللہؐ نے یہ کیا یا وہ کیا۔

احادیث کی جانچ پڑتال کرنے کے فن کو علوم اسلامی کی نہایت اہم شاخ کی حیثیت حاصل ہے کیوں کہ ان احادیث میں رسول اللہؐ کے طرزِ عمل کی وضاحت کی گئی ہے۔ چناں چہ یہ احادیث انسانی رویے کے تمام پہلوؤں کے بارے میں معلومات کا اہم ذریعہ ہیں۔ لیکن حدیثوں کی چھان بین کے ضمن میں کسی حدیث کے متن کے مقابلے میں اس حدیث کے راویوں کے قابل اعتماد ہونے کے معاملے پر زیادہ توجہ دی جاتی۔ اس بات کی تصدیق کرنے کے لیے

کہ راوی واقعی معتبر شخص ہے، اس کے کردار کا نہایت احتیاط کے ساتھ جائزہ لیا جاتا نیز یہ تحقیق بھی کی جاتی کہ جس شخص کے حوالے سے وہ حدیث کی روایت کر رہا ہے، اس کے ساتھ اس کا رابطہ تھا یا نہیں یا یہ کہ جب اس کا انتقال ہوا تو وہ کمسن تو نہیں تھا یا وہ اس کے آبائی شہر یا قصبے میں کبھی گیا تھا؟ جب کسی راوی کے قابل اعتماد ہونے کے بارے میں اس قسم کی تمام شرطیں پوری ہو جاتیں تو متعلقہ حدیث کو صحیح تصور کیا جاتا۔ سب سے اچھی اور قابل اعتماد حدیثیں، جن کی تعداد میں مکمل تحقیق اور جانچ پڑتال کے باوجود وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نمایاں اضافہ ہوتا گیا، ان دینی اور عملی مسئلوں کی عکاسی کرتی ہیں جن سے ملت اسلامیہ اپنی تاریخ کی ابتدائی صدیوں میں دوچار تھی۔ نویں صدی عیسوی کے وسط میں مختلف اسکالروں نے قابل اعتماد حدیثوں کے کئی ضخیم مجموعے مرتب کیے جن میں امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کی تصانیف کو عام طور پر ''الصحیحین'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ احادیث کے چار اور مجموعوں کو بھی سند کا درجہ حاصل ہے۔ مسلمانوں کے حلقوں میں صحیحین کا اس قدر احترام کیا جاتا ہے کہ صحیح بخاری کو قرآن حکیم کے بعد سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ احادیث کے ان مجموعوں سے مسلمانوں کو رسول کریمؐ کے عادات واطوار، آپؐ کے ظاہری حسن و جمال اور اخلاقی نصب العین کے بارے میں ضروری معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ بعد میں آنے والی صدیوں میں صحیح بخاری کو، جو سات ہزار حدیثوں پر مشتمل ہے، رمضان المبارک کے دوران پڑھا جاتا۔ (مملوک مصر کے زمانے میں بھی اس روایت پر عمل کیا جاتا)۔ اسی طرح ختم بخاری کا نہایت عقیدت اور احترام کے ساتھ اہتمام کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات بخاری شریف کو مکمل کرنے والا اسکالر اس مبارک موقعے پر اپنے دوستوں کو دعوت دیتا ہے۔

متاخر اسکالروں نے احادیث کی ان چھ کتابوں ''صحاح ستہ'' کی بنیاد پر حدیثوں کے کئی اور مجموعے تیار کیے جن میں راویوں کے سلسلے کو عموماً چھوڑ دیا گیا۔ ان مجموعوں کو پورے عالم اسلام میں پڑھا گیا کیوں کہ کالجوں اور مدرسوں میں دینیات کے مطالعے کے ضمن میں قرآن کریم کے ساتھ ساتھ ان احادیث کو بھی نصاب میں شامل کر لیا گیا۔ اگلے برسوں میں احادیث کے جو مجموعے مرتب ہوئے، ان میں امام بغویؒ کی مصابیح السنہ شامل ہے جس میں ۴۷۱۹ احادیث جمع کی گئی تھیں۔ ان کے بعد امام تبریزیؒ کی مشکوٰۃ المصابیح کو قبول عام حاصل ہوا جسے ہندوستان میں مشکوٰۃ شریف کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا نام قرآن کریم کی سورہ نور کی ۳۵ ویں آیت سے منسوب ہے (اللہ نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا، اس کے نور کی مثال مثل ایک طاق کے ہے جس میں چراغ ہو اور چراغ شیشے کی قندیل میں ہو اور شیشہ مثل چمکتے ہوئے روشن ستارے کے ہو، وہ چراغ ایک بابرکت درخت زیتون کے تیل سے جلایا جاتا ہو جو درخت نہ مشرقی ہے، نہ مغربی، خود وہ تیل قریب ہے کہ آپ ہی روشنی دینے لگے اگرچہ اسے آگ نہ بھی چھوئے، نور پر نور ہے، اللہ تعالیٰ اپنے نور کی طرف رہنمائی کرتا ہے جسے چاہے لوگوں (کے سمجھانے) کو یہ مثالیں اللہ تعالیٰ بیان فرما رہا ہے،

اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کے حال سے بخوبی واقف ہے۔۔مترجم)۔اس آیہ کریمہ کو عام طور پر رسول اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جن کی ذات پاک کے ذریعے خدائی نور دنیا میں منعکس ہوتا ہے (دیکھیے ساتواں باب)۔ بعد میں ان مجموعوں کے فارسی اور اردو میں ترجمے کیے گئے اور انہیں اسلامی حلقوں میں بے حد پذیرائی حاصل ہوئی۔ ہندوستان میں شائع ہونے والی اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتابیں تھیں۔ سولہویں صدی میں برہان پور وسطی ہندوستان کے ایک اسکالر علی المتقی نے مکہ میں قیام کے دوران سب سے اہم مستند حدیثوں پر مشتمل کتاب کنز العمال لکھی۔ اس کتاب کی علمی افادیت کے پیش نظر اسے بڑی شہرت ملی۔

دوسرے متقی اور پرہیز گار اسکالروں اور شاعروں نے قضا وقدر یا ہفتے کے دنوں کی انفرادی اہمیت جیسے کئی متعلقہ مسئلوں یا روزوں اور حج کے بارے میں رسول کریمؐ کے فرمودات کو یکجا کر دیا۔ کئی دوسرے لوگوں نے ایسی چالیس حدیثوں (اربعین) کو اکٹھا کرنے کا فریضہ انجام دیا جن کے ساتھ انہیں خصوصی انس تھا یا ان کی نظروں میں وہ بہت اہم تھیں۔ پھر ان اربعین کو فارسی اور ترکی زبانوں میں شاعری کے قالب میں ڈھالا گیا۔ پندرھویں صدی کے آخر میں فارسی کے عظیم شاعر اور تصوف کے اسکالر مولانا جامیؒ نے ان احادیث کو شاعری کا جامہ پہنایا اور نامور خطاطوں نے ان کے مشہور شعروں کو اپنے فن کے ذریعے حسین مرقعوں کی صورت دے دی، بعد میں خاص طور پر ترک روایات میں، ایک حدیث مبارکہ کو ایک ہی صفحے پر لکھنے کا طریقہ رائج ہو گیا جس میں نسخ اور ثلث دونوں رسم الخط استعمال کر کے خطاطی کے لافانی شاہکار تیار کر لیے گئے۔

قرون وسطیٰ کے پاکباز اسکالرز کسی نئی قابل اعتماد حدیث ملنے یا کسی نامور راوی کی زبانی کوئی نئی حدیث سننے کی آرزو میں ہزاروں میل کا سفر طے کرتے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں حدیث یعنی ''علم کی تلاش'' میں سفر کرنا ایک اچھے راوی کے لیے بے حد ضروری تھا۔ علم حدیث سیکھنے کے لیے کسی ماہر فن کے سامنے زانوے ادب تہ کرنا لازم تھا چناں چہ حدیث کی تلاش میں سرگرداں اسکالرز قابل اساتذہ کے قدموں میں بیٹھے رہتے۔ اگر چہ ابتدائے اسلام سے ہی احادیث کے مجموعے تحریری شکل میں وجود میں آ گئے تھے، اس کے باوجود اس استاد کے منہ سے حدیث سننا بے حد اہم تھا جس نے کسی اور مستند شخص سے یہ حدیث سن رکھی تھی۔ اس طرح حدیث کے راویوں کا ایک طویل سلسلہ معرض وجود میں آ گیا جن میں سب سے پہلی راوی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہؓ تھیں۔ ان عالم فاضل خواتین میں مکہ کی ایک خاتون کریمہ (وفات ۱۰۶۹ء) شامل ہیں جو صرف پانچ دن میں صحیح بخاری پڑھا دیتی تھیں۔

حدیث پڑھنے کے لیے اس قسم کی جن نشستوں کا اہتمام کیا جاتا، انہیں زبردست اہمیت حاصل تھی۔ جس طرح

ایک مسلمان قرآن کریم کی تلاوت سنتے ہوئے یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ خدا سے اس کا کلام سن رہا ہے، ٹھیک اسی طرح وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ رسول کریمؐ کی احادیث مبارکہ کو پڑھنے سے اسے نبی پاک کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ چناں چہ اس طرح وہ حضورؐ کو دیکھتا اور آپؐ کی آواز کو سنتا ہے۔ اسی بنا پر آں حضرتؐ کی احادیث کو پڑھانا بہت بڑی ذمے داری سمجھی جاتی تھی۔ علم حدیث کے اساتذہ حدیث کے درس کے موقعے پر نہایت احتیاط سے تیاری کرتے تھے۔ محدثین مبتدیوں کو درس دیتے وقت خوف زدہ رہتے اور ارکان عبادت کی طرح اس کا اہتمام کرتے۔ فقہ مالکی کے بانی اور عظیم محدث مالک بن انسؓ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حدیث کا درس دینے سے پہلے وہ غسل کر کے اچھی طرح وضو کرتے، نئے کپڑے اور نئی پگڑی پہنتے اور نہایت عزت و تکریم اور سنجیدگی کے ساتھ منبر پر بیٹھتے۔ جب تک حدیث کا درس جاری رہتا، عود جلا کر فضا کو مسلسل معطر رکھا جاتا۔ وہ حدیث مبارکہ کا اس قدر احترام کرتے کہ ایک مرتبہ درس حدیث کے دوران ایک بچھو نے انہیں سولہ مرتبہ ڈنک مارا لیکن انہوں نے گھبراہٹ یا پریشانی کی کوئی علامت ظاہر نہ کی۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حدیث مبارکہ کو قرآن حکیم کی تفسیر و تشریح کے ضمن میں پہلے قدم کی حیثیت حاصل ہے کیوں کہ حضورؐ کی حدیث سے اس بات کی عکاسی ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی ابتدائی نسلوں نے آپؐ کے قول و فعل کی تفصیلات کو کس قدر عقیدت سے محفوظ رکھا تھا اور یہ کہ آپؐ پر خدا کی جانب سے جو وحی نازل ہوئی، خود نبی پاکؐ نے اس کی کیا شرح کی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ احادیث کی باضابطہ تدوین سے بہت پہلے رسول کریمؐ کی ذات پاک صحابہ کرامؓ کے لیے ایک مثالی نمونہ تھی جیسا کہ فضل الرحمٰن نے لکھا ہے: ''جس قدر نیا مواد دست یاب ہوا ہے، وہ محض قرآن حکیم کے اصولوں اور سنت نبویؐ کی توضیح و تشریح ہے۔'' ملت اسلامیہ میں حضورؐ کے اسوہ حسنہ اور احادیث سے استفادہ کرنے کا عمل جاری و ساری ہے اور امت مسلمہ کی روحانی نشوونما کی بنیاد ان ہی ماخذوں پر استوار ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی زندگی میں سنت نبویؐ اور احادیث مبارکہ کو زبردست اہمیت حاصل ہے چناں چہ اسلام کے ایک جدید شارح نے حضورؐ کی سنت کی اہمیت کو درج ذیل لفظوں میں بیان کیا ہے:

> ''یہ بات فہم و ادراک سے ماورا ہے کہ سنت نبویؐ کے محاسن پر صدیوں سے لے کر خود ہمارے زمانے تک پوری عقیدت اور احترام کے ساتھ کس طرح عمل ہو رہا ہے؟ اگر بانی اسلامؐ میں یہ اعلیٰ اوصاف موجود نہ ہوتے اور وہ ان اعلیٰ اقدار پر خود عمل نہ کرتے تو مسلمانوں کو یہ اقدار دوسری اقوام سے مستعار لینا پڑتیں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ دوسری قوموں میں یہ محاسن موجود بھی تھے یا نہیں کیوں کہ یہ قدریں خاص طور پر اسلام کے ساتھ وابستہ ہیں۔ مسلمانوں کے نزدیک

رسول کریمؐ جن اعلیٰ اخلاقی اور روحانی قدروں پر کاربند تھے، وہ کوئی فرضی یا قیاسی نہیں، زندہ حقیقت ہیں اور ان کے صحیح ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہوسکتا۔'' (Schuon: Islam and - Perennial Philosophy, p.29)

لیکن رسول اللہؐ کی سنت کے ساتھ گہری عقیدت اور شغف کے باوجود حدیث کے مطالعے کے دوران کئی مسئلے بھی جنم لے چکے ہیں۔ کیا رسول کریمؐ سے منسوب متضاد حدیثیں درست ہیں؟ کیا اسلام میں موجود ہر سیاسی اور مذہبی گروپ نے متعلقہ حدیثوں کو اپنے اپنے رویے کے دفاع کے لیے استعمال نہیں کیا؟ کیا مسلمانوں کے لیے صحاح ستہ کی تمام کتابوں، خاص طور پر بخاری اور مسلم میں درج تمام حدیثوں پر عمل کرنا ضروری ہے؟ یہ مسئلے صدیوں سے زیر بحث چلے آرہے ہیں اور ظہور اسلام کے تھوڑی دیر بعد ایسے کئی لوگ پیدا ہوگئے تھے جو صرف قرآن کریم پر انحصار کرنے میں ہی عافیت سمجھتے تھے۔

احادیث نبویؐ کے مستند ہونے کے معاملے نے موجودہ دور میں، جب عالم اسلام کو مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی کے ساتھ مغرب کی عادات ورسوم کا بھی مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے، مزید شدت اختیار کر لی ہے۔ چناں چہ گولڈزیہر Goldziher اور کئی دوسرے یورپی اسکالروں نے احادیث پر شدید نکتہ چینی شروع کر دی ہے تاہم متقی اور پرہیزگار مسلمانوں نے اس تنقید کو مسترد کر دیا ہے۔ مسلمانوں کا استدلال ہے کہ مغربی اسکالرز اسلام کو تباہ کرنے اور اسلامی عقاید پر مسلمانوں کے ایمان کو متزلزل کرنے کی غرض سے اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال کررہے ہیں۔ ہمارے عہد کے نامور مسلمان مفکر اور ہارورڈ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل سید حسین نصر نے اپنی فکر انگیز کتاب Ideals and Realities of Islam کے باب The Prophet and Prophetic Tradition میں لکھا ہے:

خود کو سائنسی نقطہ نظر کا حامل ظاہر کرنے اور تاریخی اسلوب کے مشہور بلکہ بدنام حربے استعمال کرنے کا مقصد تمام مذہبی صداقتوں کی اہمیت کم کر کے انہیں تاریخی حقائق کے تابع بنانا ہے۔ حدیث کے نکتہ چینوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس لٹریچر کا تعلق پیغمبر اسلامؐ سے نہیں ہے بلکہ بعد میں آنے والی نسلوں نے جعل سازی کر کے یہ حدیثیں رسول کریمؐ کے ساتھ منسوب کر دی ہیں۔ ان حملوں کا تمام تر مقصد اس مفروضے کو درست ثابت کرنا ہے کہ اسلام آسمانی وحی کے نتیجے میں ظہور پذیر نہیں ہوا۔ لیکن حضورؐ پر تنقید کرنے والوں کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ آپؐ خدا کے پیغمبر ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بیشتر احادیث کے خلاف کوئی سائنسی استدلال پیش نہیں کیا جاسکتا۔ (Nasr: Ideals and Realities -of Islam, p.80)

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جدید عالم اسلام میں احادیث کے معاملے میں وسیع اختلافی رویے پائے جاتے ہیں۔

انیسویں صدی کے پانچویں عشرے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان موجود کٹر اہل حدیث فرقے نے کسی اختلاف رائے کے بغیر حدیثوں کے تمام کلاسیکل مجموعوں کو بلا چون و چرا قبول کر لیا جب کہ اسی زمانے میں جدت پسندوں نے سرسید احمد خان کی قیادت میں حدیثوں کے استعمال کے سلسلے میں زیادہ محتاط طریق کار اختیار کرنے کی وکالت شروع کر دی اور یہ موقف پیش کیا کہ مذہبی معاملوں میں تمام احادیث کی پیروی کرنی چاہیے لیکن سماجی طرز عمل اور سیاسی یا دوسرے دنیاوی کاموں میں ان کا اتباع ضروری نہیں۔ اس کے باوجود ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ سید احمد نے اس سے پہلے جو کتاب لکھی اور جو بعد میں ان کی فکری اساس بن گئی، رسول کریمؐ کے ان الفاظ پر گہرا غور وخوض کیا ہے: ''اے میرے بیٹے! جس کسی نے شک وشبہے کے بغیر میری سنت کو عزیز جانا، وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور جو کوئی مجھ سے محبت کرتا ہے، وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔'' چناں چہ سید احمد خان لکھتے ہیں:

> اے مسلمانو! ذرا غور کرو۔ اگر ایک ہزار جانیں بھی حضورؐ کے اس لفظ ''میرے ساتھ'' پر قربان کر دی جائیں تو بھی یہ جانیں بہت تھوڑی ہیں، رسول اللہؐ کے ساتھ جنت میں اکٹھے ہونا اس قدر بڑا مژدہ جاں فزا ہے کہ اس حقیقت کے مقابلے میں دو جہاں کی کوئی قدر و قیمت نہیں! وہ شخص، جسے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا قرب نصیب ہو، وہ کس قدر خوش قسمت انسان ہے، افسوس! تم کہاں بھٹکے ہوئے ہو؟ یہ بخشش اور جود وسخا صرف آں حضرتؐ کی سنت کی اتباع کے طفیل ملتی ہے، دنیا کی کسی اور چیز کے صدقے نہیں مل سکتی، نہیں مل سکتی، نہیں مل سکتی!''۔(Troll: Sayyid Ahmad Khan, p.45)۔

لیکن بعد میں آنے والے دنوں میں سرسید کے پیروکاروں اور ساتھیوں نے احادیث کے معاملے میں سخت رویہ اپنالیا اور ان کے ایک دوست چراغ علی نے ہنگری کے گولڈزیہر Goldziher کی کتاب کے مقابلے میں زیادہ شدت پسندی کا مظاہرہ کیا۔ چراغ علی کی رائے یہ تھی کہ احادیث کے دور تک پھیلے ہوئے سیلاب نے ایک متلاطم سمندر کی صورت اختیار کر لی ہے۔ سچ اور جھوٹ، حقیقت اور افسانہ آپس میں اس طرح خلط ملط ہو گئے ہیں کہ ان کے درمیان امتیاز کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

یہ صورت حال آج بھی مختلف نہیں ہے۔ پاکستان میں راسخ العقیدہ مسلمانوں کا ایک طبقہ رسول کریمؐ کی تمام احادیث پر ثابت قدمی اور سختی سے کاربند ہے لیکن اسی ملک میں ایک جدت پسند مفکر غلام احمد پرویز نے حدیث کو مکمل طور پر مسترد کر دیا ہے، وہ صرف قرآن کو تسلیم کرتا ہے اور قرآن کو ہی تمام اخلاقی قدروں کا سرچشمہ تصور کرتا ہے۔ فضل الرحمٰن نے ''زندہ سنت'' کی جو تشریح کی ہے، اس پر بھی بحث مباحثوں اور تلخ محاذ آرائی کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔

اس سے پہلے قرون وسطیٰ میں بھی یہ سوال اٹھایا گیا تھا (اشعری عالم دین الباقلانی) کہ آیا نبی کریمؐ کے اسوہ کی مکمل پیروی کرنا ضروری ہے؟ کیا یہ محض ایک مستحسن اقدام ہے یا دینی نقطہ نظر سے بھی اس کی کوئی اہمیت ہے؟ مسلمانوں کے نزدیک احادیث کو نہ صرف مذہبی اہمیت حاصل ہے بلکہ آپؐ کے کھانے پینے، لباس پہننے اور روزمرہ کے دوسرے معمولات کو رہنما اصول مانا جاتا ہے اور مسلمانوں کی اکثریت پہلے خلیفہ حضرت ابوبکرؓ کے اس اصول کی پیروی کرنے کو ترجیح دیتی ہے جنہوں نے کہا تھا: ''میں رسول خداؐ کے کسی فعل کو ترک نہیں کرتا کیوں کہ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے آپؐ کے کسی کام کو نظرانداز کر دیا تو میں گمراہ ہو جاؤں گا۔'' (Andrae: Die Person Muhammads, p.192)۔ حضرت ابوبکرؓ رسول کریمؐ کے ساتھ گہری عقیدت کی بنا پر آپؐ کے ہر فعل کی اتباع کو لازم سمجھتے تھے چناں چہ مسلمان ابوبکرؓ کے اس طرز عمل کو صحیح معنوں میں دین محمدی سمجھتے ہیں، خاص طور پر صوفیائے عظام سنت نبویؐ کے پہلو پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے قرب کا یہ انداز حضورؐ کے ساتھ گہری عقیدت کی اساس ہے جس سے آں حضرتؐ کی پدرانہ شخصیت کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے اور جس کا اظہار خود رسول کریمؐ نے ان لفظوں میں کیا ہے: ''بے شک تمہارے لیے میں باپ کی مانند ہوں۔'' حضورؐ کی حیثیت ایک باپ یا خاندان میں سب سے معتبر اور مکرم شخصیت کی سی ہے جس پر گھرانے کے تمام افراد مکمل اعتماد کا اظہار کرتے ہیں کیوں کہ انہیں پورا یقین ہوتا ہے کہ اس میں تمام سوالوں کا جواب دینے اور اپنے تمام عزیز و اقارب کو درپیش مسئلوں کو حل کرنے کی استعداد موجود ہے۔ یہ صورت حال اس بات کی متقاضی ہے کہ زندگی کے تمام معمولات اور جزئیات میں نبی کریمؐ کے طرز عمل کی پیروی کی جائے۔ چناں چہ قرون وسطیٰ کے نامور عالم دین اور مفکر امام غزالیؒ اپنی عظیم تصنیف احیا علوم الدین کے بیسویں باب میں، جو کتاب کے وسط میں ہے، لکھتے ہیں:

ہر شخص کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ رسول اللہؐ کی سنت پر کاربند رہنے اور آپؐ کی آمدورفت، نقل وحرکت، آرام کرنے، کھانے پینے، آپؐ کے رویے، سونے اور گفتگو کرنے کے انداز کی کامل اتباع ہی مسرت و انبساط کی کنجی ہے۔ میری مراد دینی معاملوں میں حضورؐ کی تقلید کرنے سے نہیں کیوں کہ ان امور میں آپؐ کی احادیث کو نظرانداز کرنے کی کوئی وجہ نہیں بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ رسوم ورواج اور تمام معاملات میں آں حضرتؐ کی اتباع لازم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام امور میں حضورؐ کی پیروی کرنے سے ہی کامیابی اور کامرانی ممکن ہے۔ خدا نے کہا ہے: ''کہہ دیجیے! اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو، خود اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔'' (سورہ آل عمران آیت ۳۱)۔ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''تمہیں رسولؐ جو کچھ دے لے

لو، اور جس سے روکے رک جاؤ۔'' (سورہ الحشر آیت ۷)۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جب آپ پاجامہ پہنیں تو بیٹھ جائیں اور جب پگڑی پہنیں تو کھڑے ہو جائیں۔ اسی طرح جوتے پہنتے وقت پہلے دائیں پاؤں میں جوتا پہنیں۔

اس کے باوجود مولانا رومیؒ جیسے صوفی امام غزالیؒ پر، جو دنیا جہان کے لوگوں میں اسکالر ہیں، یہ الزام لگاتے ہیں کہ ان میں محبت کے جوہر کا فقدان تھا (اس کا اظہار ان کے چھوٹے بھائی احمد غزالی نے بھی کیا ہے) اور یہ کہ امام غزالیؒ کو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا قرب نصیب نہیں ہوا تھا اور وہ حضورؐ کے مقام اور اسرار و رموز سے واقف نہیں تھے۔ (بعد کے کئی عرفانی منابع میں بھی یہ تذکرہ ملتا ہے۔ مترجم)۔

رسول کریمؐ کی سنت کا اتباع، جیسا کہ Armand Abel نے لکھا ہے، دراصل پیغمبر اسلامؐ کے افعال اور سرگرمیوں کی تقلید جب کہ عیسیٰ علیہ السلام کی اطاعت حضرت عیسیٰؑ کے رنج و آلام کی پیروی کرنے کے مترادف ہے۔ یہ حضورؐ کے افعال و کردار ہی کا معجزہ ہے جو حدیث کے ذریعے مسلمانوں تک پہنچا جس کے نتیجے میں آج دین اسلام کے پیروکاروں کی زندگی اور ان کے سماجی رویے میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے عالم اسلام کے تمام علاقوں کی سیاحت کرنے والے لوگ بے حد متاثر ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسی مشابہت ہے جو ہر کسی کو نظر آتی ہے، مثال کے طور پر مسلمان صوفیا کی سوانح عمریوں میں اس کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔ Frithjof Schuon نے لکھا ہے:

محمدی کردار کی اس اخلاقی خوبی سے صوفیائے عظام کے نفی ذات کے منفرد انداز کی وضاحت ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مقابلے میں کسی اور شخص میں اعلیٰ اخلاقی محاسن موجود نہیں چناں چہ ان خوبیوں کا اظہار صرف ان لوگوں میں ہوتا ہے جو حضورؐ کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے ذریعے نبی کریمؐ ملت اسلامیہ میں زندہ و پائندہ ہیں۔ ایک حدیث کے مطابق کسی اچھی سنت کو رائج کرنا ایک مستحسن فعل ہے اور اس سنت کو متعارف کرانے والے شخص کو اس سنت پر عمل کرنے والے کے برابر اجر ملے گا۔ اسی طرح کسی ناقص سنت کو رائج کرنے والا شخص سزا کا مستوجب ہوگا۔ جو مسلمان نور الہدیٰ یعنی رسول کریمؐ کی دل و جان سے اطاعت کرتے ہیں، وہ درج ذیل دعا کے ذریعے اپنے قلبی جذبات کا اظہار کر سکتے ہیں:

خدایا! ہم تم سے وہی مانگتے ہیں جو تیرے بندے اور رسول محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تجھ سے مانگا تھا، ہم اس چیز سے تیری پناہ مانگتے ہیں جس سے تیرے بندے اور رسولؐ نے تجھ سے پناہ مانگی تھی۔

شمائل اور دلائل پر مبنی لٹریچر

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رسول اللہؐ کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت اور دلچسپی بڑھتی گئی اور حضورؐ کے

طرز عمل اور ذاتی زندگی کی تفصیلات میں مسلمانوں کے انہاک میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ مسلمان اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ وہ آں حضرتؐ کی صحیح اتباع کر رہے ہیں، رسول کریمؐ کی شخصیت، شکل وصورت اور آپؐ کے الفاظ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے، ان کے ہر دل عزیز مبلغ حضورؐ کی شخصیت کو نہایت عمدہ رنگوں سے مزین کر کے پیش کرتے بلکہ ان میں حد درجہ غیر اہم تفصیلات کا بھی اضافہ کرتے۔ (مثال کے طور پر یہ بھی بیان کیا گیا کہ نبی پاکؐ کے سر مبارک میں سترہ سفید بال تھے) لیکن زیادہ متین اور سنجیدہ مزاج علما اس قسم کی مبالغہ آرائیوں کو سن کر زیادہ مسحور نہ ہوتے۔ بعد میں قوت العاشقین پر مشتمل صحیفوں کی بنیاد پر لٹریچر کی ایک نئی صنف معرض وجود میں آ گئی۔ ٹھٹھہ کے مخدوم محمد ہاشم نے بھی رسول اللہؐ کی احادیث اور روایات کے مجموعے کو منظوم شکل میں پیش کیا اور اس کا نام قوت العاشقین رکھا۔ ان کا یہ منظوم کلام قارئین اور سامعین دونوں میں یکساں مقبول ہے۔ قوت العاشقین اٹھارویں صدی کے شروع میں سندھی زبان میں لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے جو ۱۸۲۸عیسوی میں بمبئی سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کو عوام میں زبردست پذیرائی ملی، اس سے لوک شاعروں کو مہمیز ملی اور وہ حضورؐ کی حیات مقدسہ کی تخیلاتی جزئیات پر طبع آزمائی کرنے لگے۔

اسلام کے ابتدائی عہد میں اس صنف کے ادبی مجموعوں کو ''دلائل النبوۃ'' کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ بعد میں دلائل النبوۃ کے ساتھ ''شمائل النبوۃ'' کا اضافہ کر دیا گیا جن میں رسول کریمؐ کے اعلیٰ محاسن اور ظاہری حسن و جمال کا تذکرہ کیا گیا۔ دلائل اور شمائل کے ابتدائی دو مجموعے نامور صوفی اور مورخ ابونعیم الاصفہانیؒ (وفات ۱۰۳۷عیسوی) اور البیہقیؒ (وفات ۱۰۶۶عیسوی) نے مرتب کیے۔ یہ دونوں تصانیف حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سوانح عمریاں ہیں جن میں حضورؐ کی پیدائش اور آپؐ کی بعثت سے پہلے اور بعد کے زمانوں میں رونما ہونے والے معجزوں اور خدا کے آخری پیغمبر کے منصب پر سرفراز ہونے سے متعلق دلائل اور شواہد کا احاطہ کیا گیا ہے۔ دونوں مصنفوں نے رسول اللہؐ کے اعلیٰ حسب نسب اور بہترین اوصاف کا ذکر کیا ہے اور ایسے کئی معجزے بیان کیے ہیں جن کے ذریعے انسان اور جانور نبی کریمؐ کو خدا کے خصوصی پیغمبر کی حیثیت سے بخوبی پہچانتے ہیں۔ یہ داستانیں ان روایتی افسانوں اور نظموں کی اساس بن گئیں جن سے آنے والی صدیوں میں آں حضرتؐ کی شخصیت کے متعلق مقبول عام خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے۔

البیہقیؒ سے کوئی دو سو سال پہلے نامور محدث ابوعیسیٰ الترمذیؒ (وفات ۸۹۲عیسوی) نے شمائل المصطفیٰؐ کے بارے میں پہلی بنیادی کتاب مرتب کی جس میں رسول خداؐ کے ظاہری حسن اور آپؐ کی اخلاقی برتری کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا۔ یہاں حضورؐ اخلاقی کاملیت کا جامع نمونہ نظر آتے ہیں اور اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ قرون وسطیٰ

کے مصنف قاضی عیاضؒ نے رسول کریمؐ کی عظمت اور برتری کے بارے میں اپنی جامع کتاب میں امام ترمذیؒ کی تصنیف کو اہم ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ قاضی عیاضؒ فقہ مالکی کے کٹر پیروکار، صوفیوں کے مشہور دشمن اور سبت غرناطہ کے سخت گیر قاضی (جج) تھے البتہ صوفی اور غیر صوفی دونوں طبقے ان کی کتاب الشفا فی تعریف حقوق مصطفیٰؐ سے یکساں استفادہ کرتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب کو موضوع کے اعتبار سے بنیادی حقائق پر مبنی معلومات کے ضمن میں منفرد مقام حاصل ہے جس میں رسول کریمؐ کی حیات طیبہ، آپؐ کے اوصاف حمیدہ اور معجزوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ قرون وسطیٰ کے اسلامی دور میں الشفا کی اس طرح داد و تحسین کی گئی کہ اسے جلد ہی مقدس درجہ حاصل ہو گیا بلکہ یہ کتاب اپنے مالک کے گھر کی حفاظت کرنے والے طلسماتی شخص کے طور پر استعمال ہونے لگی: ''جس گھر میں یہ کتاب موجود ہوگی، اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، جس کشتی میں یہ کتاب ہوگی، وہ ڈوبے گی نہیں۔ جب کوئی بیمار شخص اسے پڑھے یا اس کے لیے یہ کتاب پڑھی جائے، خدا اسے صحت یاب کر دے گا۔'' اس میں کوئی شک نہیں کہ جس کتاب میں رسول کریمؐ کی تعریف و توصیف پر مبنی تفصیلات درج ہوں، اس کے قاری کو حضور سرور کائناتؐ کے فیوض و برکات سے یقیناً حصہ ملتا ہے۔ کتاب کے نام شفا سے اس کی صحت یاب کرنے کی طاقت کا عندیہ ملتا ہے۔

قاضی عیاضؒ کی کتاب کے بعد اس موضوع پر زیادہ تفصیل سے جو کتاب لکھی گئی، وہ قسطلانیؒ (وفات ۱۵۱۷عیسوی) کی المواھب اللدنیہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس موضوع پر لکھے جانے والے لٹریچر میں اضافہ ہوتا گیا چناں چہ دلائل اور شمائل اور حضورؐ کے متعلق نعتیہ کلام کو اکٹھا کرنے والے یوسف النبہانی (اوائل بیسویں صدی) نے ایک جگہ پر شمائل کی پچیسویں جلد کا ذکر کیا ہے جسے انہوں نے اپنا مجموعہ مرتب کرنے کے لیے استعمال کیا تھا۔

نبی کریمؐ کا جسمانی حسن و جمال

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جسمانی حسن و جمال کا تذکرہ ابتدائی روایات میں ایک جگہ نہیں، مختلف مقامات پر منتشر صورت میں پایا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ام معبدؓ نے حضورؐ کی پرشکوہ موجودگی کے بارے میں جو قصہ بیان کیا ہے، وہ آپؐ کی صداقت کا واضح ثبوت ہے۔ (دیکھیے چوتھا باب)۔ جس طرح رسول کریمؐ کا اخلاق اور کردار بنی نوع انسان میں سب سے زیادہ خوب صورت تھا، اسی طرح آپؐ جسمانی حسن و جمال میں بھی بے مثل تھے۔ ترمذیؒ نے کتاب الشمائل المصطفیٰؐ میں حضرت علیؓ کی زبانی رسول کریمؐ کا سراپا اس طرح بیان کیا ہے:

نبی کریمؐ کا بدن مبارک نہایت متوازن تھا۔ آپؐ نہ دراز قامت تھے، نہ زیادہ پست قامت، آپؐ میانہ قامت لوگوں میں سے تھے۔ نہ آپؐ بہت گھنگریالے بالوں والے تھے نہ سیدھے بالوں والے بلکہ چمک دار، سیدھے اور گھنگریالے بالوں والے تھے۔ گھنی داڑھی سینے پر سایہ کیے ہوئے تھی۔ نہ بہت فربہ تھے، نہ بہت دبلے پتلے، سفید رنگ

میں گلابی جھلک پائی جاتی تھی ۔ سرگیں آنکھیں، پپوٹوں کے کنارے دراز، بڑے بڑے جوڑ بند، شانوں کے درمیان کا حصہ بڑا۔ سینے سے ناف تک بالوں کی باریک لکیر، سارا جسم بالوں سے خالی، ہتھیلیاں اور تلوے پر گوشت ۔ رفتار میں قدم مبارک زمین پر نہ ٹکتے تھے (یعنی تیز رفتار تھے)۔ معلوم ہوتا تھا نشیب کی طرف چل رہے ہیں ۔ جب کسی جانب توجہ فرماتے تو فوراً توجہ فرماتے ۔ دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت تھی اور آپؐ خاتم النبیین تھے ۔ سخاوت میں سب سے زیادہ سخی، جرأت میں سب سے زیادہ قوی دل، گفتگو میں سب سے زیادہ سچے، معاہدوں کو سب سے زیادہ پورا کرنے والے، سب سے زیادہ نرم طبیعت والے اور معاشرت میں سب سے زیادہ کریمانہ اخلاق ۔ پہلے پہل جس نے آپ کو دیکھا، مرعوب ہو گیا اور جس نے آپؐ کے ساتھ میل ملاپ رکھا، آپؐ سے محبت کرنے لگا۔ چہرہ مبارک چودھویں کے چاند کی طرح روشن و تاباں، دونوں پپوٹوں کے درمیان ایک رگ تھی جو غصے کے وقت پھول جاتی تھی ۔ جس وقت میں بھوک محسوس کرتا، حضورؐ کی ایک جھلک بھوک کا احساس ختم کر دیتی تھی ۔ آپؐ کے سامنے آ کر سارے غم اور تکلیفیں بھول جایا کرتی تھیں ۔

''مہر نبوت'' حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا خصوصی نشان تھی جس سے آپؐ کے متعلق الہامی کلام کے آخری پیامبرؐ کی شہادت ملتی ہے (لوگو! محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن آپؐ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور تمام نبیوں کے ختم کرنے والے، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا (بخوبی) جاننے والا ہے۔ سورہ الاحزاب آیت ۴۰ ۔ مترجم)۔ تمام ماخذوں نے مہر نبوت کا متفقہ طور پر ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ حضورؐ کے جسم اطہر پر نمایاں طور پر ابھرا ہوا گوشت یا کبوتری کے انڈے کے حجم کا تل موجود تھا، اس کا رنگ زردی مائل سیاہ تھا اور یہ مہر نبوت آپؐ کے دونوں شانوں کے درمیان تھی ۔ کہا جاتا ہے کہ شام کے عیسائی راہب بحیرا نے مہر نبوت سے ہی رسول اللہؐ کو اس وقت پہچان لیا تھا جب حضورؐ ابھی بچے تھے ۔ بحیرا کو اس علامت سے پتا چل گیا کہ آپؐ خدا کے آخری پیغمبر ہیں جنہیں انجیل میں فارقلیط کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔

روایت ہے کہ نبی کریمؐ کے ہاتھ ٹھنڈے اور معطر و خوشبودار تھے: ''برف سے زیادہ ٹھنڈے اور ریشم سے زیادہ نرم و ملائم!'' تمام روایات میں کہا گیا ہے کہ آپؐ کے جسم مبارک سے بہنے والا پسینہ نہایت خوشبودار ہوتا اور کئی قریبی خواتین آپؐ کا پسینہ اکٹھا کر کے اسے عطر کے طور پر استعمال کرتی تھیں ۔

رسول کریمؐ کے معطر پسینے سے یہ مسرور کن روایتی داستان منسوب ہے: شب معراج کے دوران آپؐ کے جسم اطہر سے پسینے کے چند قطرے زمین پر گر گئے جن سے گلاب کا خوشبودار پھول پیدا ہو گیا چناں چہ حضورؐ کے عقیدت مند گلاب کے پھول کی خوشبو کو رسول کریمؐ کا عطر سمجھتے ہیں ۔ مولانا رومؒ اپنی ایک عظیم نظم میں گلاب کے پھول کا اس طرح

ذکر کرتے ہیں:

ترجمہ: گلاب کے پھولوں کی جڑیں اور شاخیں

مصطفیؐ کا معطر پسینہ ہیں

آپؐ ہی کی قوت سے گلاب کا ہلال

اب مکمل چاند کی صورت اختیار کر گیا ہے

دوسری طرف پشتو کی لوک شاعری میں کہا گیا ہے کہ جب تاباں و درخشاں، حسین و جمیل پیغمبر خداؐ باغ میں داخل ہوئے تو گلاب کے پھول کی پتیاں شرم سے گلنار ہو گئیں، گلوں کے یہ رنگ حضورؐ ہی کے حسن و جمال کا پرتو ہیں۔ بعد میں اس قسم کی حکایتوں میں کئی اضافے کیے گئے، مثال کے طور پر یہ کہا گیا کہ آپؐ کے جسم مبارک پر مکھیاں نہیں بیٹھتی تھیں یا یہ کہ حضورؐ کا سایہ نہیں تھا۔ چناں چہ حضرت عائشہؓ کو بتایا گیا کہ ''زمین پیغمبروں کے بول و براز کو نگل جاتی ہے تا کہ وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہے۔''

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام انسانی حسن و جمال کا حقیقی نمونہ بن گئے کیوں کہ آپؐ کی ذات اقدس میں اعلیٰ ترین روحانی محاسن موجود تھے۔ اردو کے ایک ہم عصر شاعر (ساغر نظامی) نے حضورؐ کو اس طرح ہدیہ عقیدت پیش کیا ہے:

حسن سراپا عشق مجسم صلی اللہ علیہ وسلم

روئے منور گیسوئے پرخم صلی اللہ علیہ وسلم

اسی طرح عہد حاضر کے ایک جدید ماخذ نے بیان کیا ہے کہ کامل ایمان اس یقین پر مبنی ہے کہ ''خدا نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جسم مقدس کو ایسا بے مثل حسن دے کر پیدا کیا ہے جو کسی انسان میں نہ کبھی پہلے دیکھنے میں آیا اور نہ بعد میں! اگر حضورؐ کا مکمل حسن و جمال ہماری آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہو جائے تو آنکھیں اس جلوے سے خیرہ ہو جائیں۔'' تمام اسلامی زبانوں کے شاعروں نے رسول کریمؐ کی بے نظیر خوب صورتی کی تعریف و توصیف کے لیے نئی نئی تشبیہیں اور استعارے ایجاد کیے ہیں چناں چہ اردو کے شاعر داغؔ نے انیسویں صدی کے آخر میں کہا تھا:

حسنِ یوسف میں ترا نور تھا، اے نورِ خدا

چارۂ دیدۂ یعقوبؑ ہوا، خوب ہوا

داغؔ نے قدیم مصنفوں کے پسندیدہ موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و

آلہ وسلم) کو نہ صرف تمام پیغمبروں کی عقل ودانش بلکہ ان کا حسن و جمال بھی عطا ہوا ہے۔ یوسف علیہ السلام کو عام طور پر انسانی حسن کا کامل نمونہ تسلیم کیا جاتا ہے لیکن رسول کریمؐ کی ایک حدیث مبارکہ میں ہے: ''یوسفؑ خوب صورت تھے لیکن میں ان سے زیادہ حسین وجمیل ہوں۔'' ہمیں اس مشہور حدیث کو بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے: ''خدا خوب صورت ہے اور وہ خوب صورتی کو پسند کرتا ہے۔'' اس حدیث سے کئی فن کاروں کو مہمیز ملی ہے اور انہوں نے خدا کے محبوب پیغمبر علیہ السلام کے حسن و جمال کے سلسلے میں لطیف خیالات کا اظہار کیا ہے۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ دین اسلام میں، جو زندہ چیزوں، خاص طور پر بزرگان دین کی صورت گری کی ممانعت کرتا ہے، نبی کریمؐ کی قانوناً کوئی تصویر نہیں بنائی جا سکتی۔ (قرون وسطیٰ کے عیسائیوں کے مکمل طور پر غلط نظریات کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو قدیم بت پرستی کے ساتھ گڈمڈ کرتے ہوئے اپنی شاعری اور رجزیہ گیت Chansons Le Geste میں پیغمبر اسلامؐ کی ''سنہری تصویروں اور مجسموں کا تذکرہ کیا ہے)۔ اس کے باوجود ترکی اور ایران بلکہ ہندوستان میں حضورؐ کی کئی منقش تصویریں موجود ہیں۔ بعد میں آں حضرتؐ کے چہرے کو عام طور پر چھپا دیا گیا لیکن چودھویں صدی کے شروع میں بنائی گئی تصویروں میں آپؐ کے چہرے پر کوئی نقاب نہیں ڈالا گیا تھا۔ آج بنیاد پرست مسلمان بلکہ دانشور طبقہ بھی آپؐ کی تصویر بنانے پر سخت ناراضی کا اظہار کرتا اور اسے خلاف شرع، بدعت اور کفر قرار دیتا ہے البتہ مسلمانوں نے حضورؐ کو اپنی نظروں کے سامنے حاضر رکھنے کے لیے حِلیہ لکھنے کا طریقہ دریافت کرلیا ہے۔

امام ترمذیؒ نے نویں صدی کے آخر میں ایک حدیث مبارکہ کا حوالہ دیا ہے جس میں رسول خداؐ نے وعدہ کیا ہے: ''میری وفات کے بعد جو کوئی میرا حِلیہ دیکھتا ہے، وہ ایسا ہی ہے گویا اس نے خود مجھے دیکھا ہے اور جو کوئی میری آرزو اور تمنا کی خاطر اسے دیکھتا ہے، خدا اس پر دوزخ کی آگ حرام کر دیتا ہے اور قیامت کے دن خدا اسے ننگا نہیں اٹھائے گا۔'' حِلیہ میں، جس کا لغوی معنی زیور ہے، عربی کے ابتدائی ماخذوں سے نبی کریمؐ کے ظاہری اور باطنی محاسن کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے بھاری معاوضہ دے کر ایک جہاں گرد درویش سے ایک حِلیہ خریدا تھا جس سے اگلی رات اسے خواب میں حضورؐ کی زیارت ہوئی اور آپؐ نے اس سے ابدی بخشش اور نجات کا وعدہ کیا۔ ایک اور مقبول روایت کے مطابق رسول کریمؐ نے وفات سے پہلے اپنے ''چار دوستوں''، یعنی ابتدائی چار خلفاؓ کو اپنے ظاہری حسن و جمال اور اوصاف حمیدہ پر مشتمل شمائل نامہ یاد کرنے کی تلقین کی تھی۔ جو شخص حِلیہ شریف کو اپنے کفن کے ساتھ ٹانک دیتا ہے، سفر آخرت کے دوران ایک ہزار فرشتے اس کے ہمراہ ہوں گے، وہ اس کی نماز جنازہ پڑھیں گے اور قیامت کے دن تک اس کی مغفرت کے لیے دعا کرتے رہیں گے۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اعلیٰ خصائص اور اوصاف کو سادہ مگر پرشکوہ عربی الفاظ میں لکھنے کی زیادہ فنی کاوشوں کا سلسلہ بدستور فروغ پذیر رہا اور یوں لگتا ہے کہ عثمانی ترکوں کے عہد میں حِلیہ شریف کے ساتھ خاص طور پر گہری عقیدت پائی جاتی تھی چناں چہ سولہویں صدی کے دوران ترکی کے خطاطوں نے حِلیہ لکھنے کے لیے خوش نویسی کا ایک مخصوص فن ایجاد کر لیا تھا۔ سترہویں صدی کے آخر میں استاد خطاط حافظ عثمان نے اس فن کو اوج کمال تک پہنچا دیا۔ یہ حِلیہ شریف، جن کی اکثر نقل کی جاتی ہے، گول ہوتے ہیں۔ شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے الفاظ اور اس کے بعد ایک گول دائرے میں حضورؐ کے اوصاف حمیدہ لکھے جاتے ہیں۔ بعد میں قرآن کریم کی یہ آیت جلی حروف میں لکھی جاتی ہے: وما ارسلناک الا رحمة للعالمین (اور ہم نے آپؐ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے)۔ حافظ عثمان اور ان کے شاگردوں نے جو حِلیہ شریف لکھا تھا، اسے آج بھی عموماً اسی نمونے کے مطابق پرنٹ کیا جاتا ہے اور جس طرح کیتھولک عیسائی حضرت مریمؑ کی تصویر کو مکانوں میں سجاتے ہیں، اسی طرح مسلمان بھی خیر و برکت کے لیے حِلیہ شریف کو گھروں میں رکھتے ہیں۔ عمدہ خطاطی میں حِلیہ شریف لکھنا بہت بڑی فضیلت سمجھا جاتا ہے۔ ایک بیوہ اور بے اولاد ترک خاتون نے بتایا کہ اس نے اپنی پوری زندگی میں ۹ حِلیہ شریف لکھے جنہیں وہ اپنے ۹ بچوں کا متبادل سمجھتی ہے اور اسے امید ہے کہ وہ قیامت کے دن اس کی شفاعت کریں گے۔

شاعروں نے بھی نبی پاکؐ کی شان میں عربی میں لکھے گئے مختصر، پرمعنی فقروں کو طویل نظموں کے قالب میں ڈھال لیا۔ سولہویں صدی کے آخر کے شاعر خاقانی نے ترکی زبان میں جو حِلیہ لکھا، وہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ شاعر نے حِلیہ شریف کی برکات کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ جس کسی کے پاس حِلیہ شریف ہوگا، وہ نہ صرف آخرت میں سزا سے محفوظ رہے گا بلکہ شیطان اس کے گھر میں داخل نہیں ہوگا، اسے ایک غلام کو آزاد کرنے اور مکہ معظّمہ کے حج کے برابر ثواب ملے گا نیز اس کے بدن کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور نہ ہی اسے کوئی جسمانی عارضہ لاحق ہوگا۔ اس کے بعد شاعر نے نہایت خوب صورت پیرائے میں رسول کریمؐ کے حسن و جمال کی مدح سرائی کی ہے۔ خاقانی نے حضورؐ کی سفید رنگت کی اس طرح تصویر کھینچی ہے:

ترجمہ: آپؐ کا دل سمندر کی مانند تھا، آپؐ ایک بے نظیر موتی تھے
آپؐ کی رنگت سفیدی مائل تھی

آں حضرتؐ کے خمدار ابرو خوب صورت محراب مسجد سے گہری مماثلت رکھتے ہیں اس لیے وہ پوری دنیا کا قبلہ ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ دیکھنے والوں پر آپؐ کے ابرو قاب قوسین (دو کمانیں) کا راز فاش کرتے ہیں۔ (پس دو کمانوں کے بقدر فاصلہ رہ گیا بلکہ اس سے بھی کم۔ سورہ النجم آیت ۹۔ مترجم)۔ اس سے معراج کی رات کو رسول کریمؐ

کی خدا سے انتہائی قربت کی ترجمانی ہوتی ہے۔اسی طرح آپ کی ناک ایسی تھی جیسے گلاب کے سفید پھول کی کلی!

(فارسی شاعر) خاقانی نے رسول اللہؐ کے لباس کے بارے میں تفصیلات بھی بیان کی ہیں کیوں کہ محدثین اور شاعروں نے نہ صرف آپؐ کے جسم مبارک اور چہرہ انور کو موضوع سخن بنایا ہے بلکہ آپ کی پوشاک کی جزئیات بھی بیان کی ہیں تاکہ عقیدت مند مسلمان لباس کے معاملے میں آپ کی پیروی کرسکیں۔ نبی کریمؐ سفید یا سبز رنگ کے لباس کو ترجیح دیتے تھے!البتہ قدیم مستند روایات کے مطابق آپؐ کے پاس ایک وقت میں کپڑوں کا صرف ایک جوڑا ہوتا تھا۔اس کے بعد خاقانی نے ان مختلف رنگوں کا ذکر کیا ہے جن میں حضورؐ ظاہر ہوتے تھے،ان میں سے ہر رنگ آپ کی حیات طیبہ کے کسی ایک پہلو کے لیے موزوں تھا:

ترجمہ: سفید رنگ میں آپؐ موتی دکھائی دیتے اور سرخ رنگ میں گلاب کا پھول!

ایک پٹھان لوک مغنی اس ذات کے لیے جو ''گلاب کے پھول کی طرح خوب صورت ہے'' اپنی جان تک کا نذرانہ پیش کرنے کو تیار ہے البتہ حضورؐ نے سرخ رنگ کو کبھی کبھار ہی استعمال کیا ہے۔

یہ ایک دل چسپ حقیقت ہے کہ مصر کی ایک جدید رزمیہ نظم میں نبی کریمؐ کے ایک کرتے سے متعلق واقعے کا ذکر کیا گیا ہے۔ چوں کہ آپؐ کے پاس ایک فاقہ کش بھکاری کو دینے کے لیے کوئی نقد رقم موجود نہیں تھی،اس لیے آپؐ نے اسے اپنا واحد کرتا دے دیا۔اس کرتے کو بعد میں نیلام کیا گیا تو ایک یہودی نے بھاری رقم کے عوض یہ کرتا خریدلیا۔ اس یہودی نے ،جو اندھا تھا،حضورؐ کے کرتے کو اپنی آنکھوں سے لگایا تو اس کی بینائی لوٹ آئی۔ یہ واقعہ حضرت یوسفؑ کے اس کرتے کے قصے سے گہری مماثلت رکھتا ہے جس سے ان کے والد کی آنکھیں ٹھیک ہوگئی تھیں۔سندھی کی عوامی شاعری میں بھی اس موضوع پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

حضرت محمد(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے چوغے خرقہ شریف یا بردہ کو نہایت قیمتی تبرک کی حیثیت حاصل ہے اور یہ خرقہ شریف کئی مسجدوں میں اب بھی موجود ہیں۔ان میں سے ایک خرقہ شمالی دکن خلد آباد اور دوسرا استنبول میں رکھا گیا ہے۔ایک اور خرقہ شریف افغانستان کے شہر قندھار کی ایک عمارت میں موجود ہے لیکن غیر مسلموں کو اس کی زیارت کرنے کی اجازت نہیں۔قندھار میں حضورؐ کے خرقہ شریف کی زیارت کے بعد ہی محمد اقبالؒ نے ۱۹۳۳ءعیسوی میں ایک پرسوز نظم لکھی تھی۔(اس نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے: از دیر مغاں آیم بے گردشِ صہبا مست۔۔مترجم)۔

رسول کریمؐ پاؤں میں خاص قسم کی چپل پہنتے جن کی دو ڈوریاں پنجوں کے درمیان بندھی ہوتیں۔ان چپلوں یا نعلین کو برکت کے لیے تعویذ کا درجہ مل گیا اور وہ نظر بد سے بچنے کے لیے خصوصی طور پر استعمال ہونے لگے۔ان نعلین کے ساتھ اس وجہ سے بھی خاص عقیدت کا اظہار کیا گیا کیوں کہ ان نعلین نے معراج کی رات کو عرش پر خدا کے تخت کو

چھوا تھا چناں چہ انہیں ''تخت خداوندی کے تاج کے بلند ترین حصے کو چھونے'' کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ مختلف اسلامی زبانوں کی شاعری میں نعلین شریف کے اس پہلو کے ذکر کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر فارسی کے پندرہویں صدی کے عارف شاعر مولانا جامیؒ لکھتے ہیں کہ عرش پر تمام فرشتوں نے اپنی جبینوں کو حضورؐ کے نعلین کے ساتھ رگڑا تھا۔ جامیؒ کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ جنت کے درخت طوبیٰ نے اپنا سر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نعلین سے رگڑا تھا اس لیے وہ سب سے زیادہ سر بلند ہو گیا ہے۔ شاعر نے بار بار یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ روح کا دھاگا حضورؐ کے نعلین کی ڈوری کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور یہ کہ عاشق کا رخسار طائف کے اس عمدہ چمڑے سے گہری مماثلت رکھتا ہے جس سے آں حضرتؐ کے یہ چپل تیار کیے گئے تھے۔ کیا عاشق کے گال نبی کریمؐ کے قدموں کو چھونے کی امید نہیں کر سکتے؟ کیا انہیں کامل مسرت اور شادمانی حاصل نہیں ہو گی؟

رسول کریمؐ کے نعلین شریف کا تذکرہ پہلی مرتبہ تیرہویں صدی میں دمشق میں ہوا۔ بعد میں قرون وسطیٰ کے دوران مغربی اسلامی دنیا میں خاص طور پر آپؐ کے چپلوں کی تصویریں عام ہو گئیں اور اس نسبت سے شاعری کی ایک نئی صنف وجود میں آ گئی۔ شاعروں نے، جن میں سے بیشتر کا تعلق شمالی افریقا اور اسپین سے تھا، نعلین شریف کا ذکر اور انہیں دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ چناں چہ اندلس کی شاعرہ سعدونہ ام سعد بنت عصام الحمیریہ (وفات ۱۲۴۲ عیسوی) نے اپنی ایک نظم کا آغاز ان لفظوں سے کیا ہے:

ترجمہ: اگر میں نعلین کو نہ پا سکی تو میں ان کی شبیہ کو چوم لوں گی
حضورؐ کے چپلوں کو چومنے کا یہ بھی ایک انداز ہے
انہیں آنکھوں سے لگانے کی سعادت غالباً جنت میں حاصل ہو گی
اس جنت میں جو روشن و تاباں ہے
میں اپنے دل کو نعلین سے رگڑتی ہوں
شاید اسی طریقے سے میری جان لیوا پیاس بجھ جائے

شمالی افریقا کے مورخ المقریؒ (وفات ۱۶۴۴ عیسوی) نے رسول اللہؐ کے نعلین کے موضوع پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ پانچ سو سے زیادہ صفحوں پر مشتمل نظم اور نثر کی اس کتاب میں حضورؐ کے ان چپلوں کا خاکہ بھی درج کیا گیا ہے جسے عقیدت مند مسلمان طلسماتی محافظ سمجھتے ہیں کیوں کہ آں حضرتؐ کے نعلین شریف کا نقش گھر کو آگ، کاروانوں کو جارحانہ حملوں، بحری جہازوں کو سمندر میں ڈوبنے اور جائیداد کو نقصان سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس صدی کے شروع میں سرور کائناتؐ کی شان میں کہے گئے قصیدوں کے جامع یوسف النبہانیؒ نے اپنی ایک نظم میں نعلین شریف کے فیوض و

برکات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

ترجمہ: میں مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نعلین کے نقش کی رکھوالی کرتا ہوں

تا کہ میں دونوں جہانوں میں اس کی محافظت میں رہوں

نعلین شریف کی برکتوں کے بارے میں عوامی گیت لکھنے کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے اور بغداد میں مقیم میرے ایک عراقی دوست کا کہنا ہے کہ اسے بچپن سے ایسی کئی نظمیں یاد ہیں جن میں نعلین پاک کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

حضورؐ کے نعلین کے علاوہ آپؐ کی ایک اور متبرک چیز، جسے مسلمانوں میں زبردست پذیرائی حاصل ہوئی، وہ آپؐ کے قدم مبارک کا نقش ہے۔ روایات کے مطابق رات کو معراج کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے بیت المقدس میں قبۃ الصخریٰ پر براق سے اترتے وقت آپؐ کے قدموں کا نشان پڑ گیا تھا۔ یہ قبۃ الصخریٰ قدم شریف کے نشان کی حفاظت کے لیے تعمیر کیا گیا اور مسلمان اس کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ مختلف اوقات اور مختلف مقامات پر کئی بڑے بڑے پتھر دریافت ہوئے ہیں جن پر رسول اللہؐ کے قدموں کے نشان موجود ہیں۔ جب کوئی مسلمان ایسے کسی پتھر کی زیارت کے لیے جاتا ہے جس پر نبی کریمؐ کے نقش پا موجود ہیں تو وہ اس پتھر کو چھو کر سر سے لے کر اپنے جسم کے بالائی حصے پر ہاتھ پھیرتا ہے تا کہ اس پتھر کی برکات سے بہرہ مند ہو سکے۔ یہ رسم ابتدائے اسلام سے چلی آ رہی ہے جس کا اندازہ اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ ۱۳۰۴عیسوی میں اصلاح پسند عالم دین ابن تیمیہ نے جب دمشق میں موجود ایک ایسے پتھر کو ہٹانے کی کوشش کی تا کہ اس پتھر سے وابستہ اوہام پرستانہ معمولات کو ختم کیا جا سکے تو ایک غضبناک ہجوم نے انہیں پکڑ کر نہ صرف جبراً وہاں سے نکال دیا بلکہ ان پر کفر والحاد کا الزام بھی عاید کیا گیا۔ جن پتھروں پر قدم رسولؐ کے نقش تھے، برکت حاصل کرنے کے لیے ان پر پانی بھی گرایا جاتا۔

قرون وسطیٰ کے بعد کئی خوش اعتقاد حاجی ایسے پتھروں کو حجاز سے ہندوستان لے آتے۔ اس نوع کا پہلا معلوم واقعہ سہروردی سلسلے کے بزرگ اوچ کے مخدوم جہانیاں سے منسوب ہے جو قدم رسولؐ کو دہلی لے آئے تھے۔ یہی وہ قدم شریف ہے جسے سلطان فیروز تغلق نے اپنے بیٹے کے مقبرے پر رکھ دیا تھا۔ انیسویں صدی کے شروع میں ۱۲ ربیع الاول کو، جو حضورؐ کی پیدائش مبارک کا دن ہے، اس جگہ پر سالانہ میلہ منعقد ہوا تھا۔ ۱۸۴۰عیسوی میں ایک عقیدت مند نے بتایا کہ اس موقعے پر ہزاروں ملنگ فقیر مزار کے سامنے جمع ہو کر رقص کرتے ہیں۔ اس کے فوراً بعد نارائن گنج (بنگلہ دیش)، گور (مغربی بنگال) اور گجرات کے درمیان مختلف مقامات پر ایسے پتھر اکٹھے کر لیے گئے جن پر قدم شریف کے نقش موجود تھے۔ (شیعوں کے بعض متبرک مقامات پر پتھروں پر حضرت علیؓ کے نقش پا موجود ہیں جس کی ایک مثال حیدر آباد دکن میں مولا علیؓ کی درگاہ ہے)۔

مسلمانوں میں قدم رسولؐ کے ساتھ اس قدر عقیدت کا اظہار کیا جاتا ہے کہ مغل بادشاہ اکبر نے اس قدم شریف کی زیارت کی تھی جو اس کا ایک جاگیر دار ۱۵۸۹عیسوی میں حج بیت اللہ کے بعد عرب سے ہندوستان لے آیا تھا۔ چوں کہ یہ واقعہ اکبر کی طرف سے دین الٰہی رائج کرنے کے بعد ہوا، اس لیے مغل فرماں روا کا ناقد مورخ بدایونی اس واقعے پر نہایت حیرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اگر چہ اکبر کا رویہ ''غیر اسلامی'' تھا، اس کے باوجود اسے نبی کریمؐ کے قدم شریف کے ساتھ گہری عقیدت اور محبت تھی۔

بعد میں اردو کے شعرا نے حضورؐ کے قدم مبارک کی عظمت پر شعر لکھے کیوں کہ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ آپؐ کے قدم شریف کے نقش کا درجہ کوہ سینا سے بھی بلند ہے۔

قدم رسولؐ سے بھی بڑھ کر حضورؐ کی داڑھی مبارک کے بالوں کو سب سے قیمتی تبرک کا درجہ حاصل ہے۔ آپ کی داڑھی کی خوب صورتی پر ہمیشہ زور دیا گیا ہے اور چوں کہ آپؐ کے بالوں اور داڑھی کو خصوصی قوت حاصل ہے، اس لیے مسلمانوں کے نزدیک نبی کریمؐ کی داڑھی مبارک کی قسم کو انتہائی طاقت ور تصور کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہؐ نے کئی مخلص صحابہؓ کو اپنے موئے مبارک دیے تھے اور ظاہر ہے کہ ہر پاکباز صحابیؓ حضورؐ کے چند بال حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتا تھا۔ جنگ یرموک کے فاتح ہیرو خالدؓ بن الولید ہمیشہ آں حضرتؐ کے چند موئے مبارک اپنے خود میں رکھا کرتے تھے اور روایات کے مطابق ان کا دعویٰ تھا کہ جو کوئی حضورؐ کے موئے مبارک اپنے پاس رکھے گا، فتح یاب ہوگا۔ اسلامی ملکوں کے کئی مقدس مقامات پر صدیوں سے رسول کریمؐ کے موئے مبارک رکھے گئے ہیں اور انہیں عام طور پر کسی چھوٹے قیمتی برتن میں محفوظ کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو آج بھی ان بالوں سے گہری عقیدت ہے۔ حال ہی میں سری نگر میں رسول کریمؐ کے موئے مبارک (حضرت بل) کو شایان شان عمارت میں رکھنے کے لیے پرانی مسجد کی جگہ ایک شاندار نئی حضرت بل مسجد تعمیر کی گئی ہے۔ غیر مسلموں کو ان متبرک موئے مبارک کی زیارت کی شاذ ہی اجازت دی جاتی ہے البتہ ایک مرتبہ قونیہ (اناطولیہ) کی Alaettin مسجد میں مجھے اور میری والدہ کو وہاں ایک بلوریں بوتل میں رکھے گئے مقدس موئے مبارک کی زیارت کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ رسول اللہؐ کے موئے مبارک کو عموماً سخت پہرے میں رکھا جاتا ہے اور صرف چند مخصوص دنوں میں ان کی زیارت کرائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر روہڑی پاکستان میں جواہرات سے مزین برتن میں رکھے گئے موئے مبارک کو ہر سال مارچ میں عام زیارت کے لیے رکھا جاتا ہے۔ بعض اوقات صرف مردوں کو اس بیش بہا نایاب تبرک دیکھنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ یہ باتیں ہمیں ۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۰عیسوی میں بیجاپور (دکن) کے اطہر محل میں معلوم ہوئیں۔ حضورؐ کے موئے مبارک کی چوری کی صورت میں شدید ہنگامے ہوتے ہیں جس کا مظاہرہ چند برس پہلے کشمیر میں ہوا تھا۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے جسمانی تبرکات کے علاوہ مسلمان آپؐ کے صحت وصفائی کے معمولات کا بھی نہایت توجہ کے ساتھ مطالعہ کرتے رہے ہیں کیوں کہ اس سلسلے میں بھی آپؐ کے طرز عمل کو مثالی نمونہ تصور کیا جاتا ہے۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ حضورؐ نیند سے بیدار ہوتے ہی مسواک کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مسواک کو مسلمانوں کی روزمرہ زندگی میں حد درجہ اہمیت حاصل ہے یہاں تک کہ ہندوستان کے اٹھارویں صدی کے صوفی مصنف ناصر محمد عندلیبؔ نے مسواک کے استعمال کو رحمت خداوندی کی مخصوص علامت قرار دیا ہے جس کے ذریعے مسلمانوں کو دنیا کی دوسری تمام قوموں پر امتیاز حاصل ہے۔ کیا حضورؐ آنکھوں کو سیاہ کرنے کے لیے سرمہ لگاتے تھے یا نہیں؟ کیا آپؐ بالوں اور داڑھی کے لیے حنا استعمال کرتے تھے؟ پرہیز گار مسلمان ان تمام جزئیات کی تحقیق کو آنے والی نسلوں کے لیے بے حد اہم سمجھتے ہیں جنھوں نے حضورؐ کو جسمانی صورت میں کبھی نہیں دیکھا لیکن وہ اپنی عملی زندگی میں آپؐ کی سنت پر کاربند رہنے کی آرزومند ہیں۔

ان تمام چیزوں کے علاوہ رسول کریمؐ کے روزمرہ معمولات کو بھی زبردست اہمیت حاصل ہے۔ حضورؐ کا معمول تھا کہ آپؐ صرف دائیں ہاتھ سے کھاتے تھے، آپؐ ہر کام کا آغاز دائیں ہاتھ (یا دائیں پاؤں) سے کرتے، آپؐ دائیں ہاتھ کی پہلی تین انگلیوں سے کھانا کھاتے تھے۔ آپؐ کا معمول تھا کہ بائیں ہاتھ کو صرف قضائے حاجت سے فراغت کے بعد طہارت کے لیے استعمال کرتے۔ ایک روایتی مسلمان آج بھی کھانے کو بائیں ہاتھ سے کبھی نہیں چھوتا۔ انیسویں صدی کے آخر میں، جب پاکباز حلقوں میں کھانے کے کانٹے اور چھری کے استعمال کے مسئلے پر گرماگرم بحث شروع ہوئی تو یہ معلوم ہوا کہ مسلمان کھانے کے دوران کانٹے کو دائیں اور چھری کو بائیں ہاتھ سے پکڑنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

احادیث میں نہایت احتیاط کے ساتھ حضورؐ کے معمولات کے ضمن میں یہ باتیں قلم بند کی گئی ہیں کہ آپؐ کن چیزوں کو پسند اور کن کو ناپسند کرتے تھے۔ تمام ذرائع اور ماخذ آں حضرتؐ کی عاجزی اور انکسار کی عادت پر زور دیتے ہیں، آپؐ عموماً روزے رکھتے اور کئی مرتبہ آپؐ کو فاقہ کرنا پڑتا۔ روایات کے مطابق رسول اللہؐ کھانے کی بعض چیزوں کو دوسری چیزوں کے مقابلے میں زیادہ پسند کرتے تھے۔ مثال کے طور پر دنبے کی دستی کا گوشت، دودھ اور کھجوریں آپؐ کی مرغوب غذا تھیں۔ میٹھی چیزیں، خاص طور پر شہد بھی آپؐ کو پسند تھا۔ آپؐ کے لیے لکھے جانے والے نعتیہ کلام میں یہ باتیں پوری طرح تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ موجودہ صدی کے آخری حصے میں یوسف النبہانیؒ نے ہمزہ میں، جو رسول پاکؐ کی سوانح حیات کے بارے میں سیکڑوں شعروں پر مشتمل ہے، نہ صرف حضورؐ کی روحانی عظمت اور معجزوں کا تذکرہ کیا ہے بلکہ یہ بھی بیان کیا ہے:

ترجمہ: آپؐ کو تمام حلال چیزیں پسند تھیں
خاص طور پر حلوہ آپؐ کو بہت مرغوب تھا
آپؐ مکھن اور کھجوروں کو بہت زیادہ پسند کرتے اور دوسری چیزوں کو بھی
تربوز اور کدو بھی آپ کو بہت پسند تھے

انس بن مالکؓ، جو کئی برسوں تک حضورؐ کی خدمت پر مامور رہے، آپؐ کی عادات سے واقف ہو گئے تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں: ''ایک مرتبہ میں نے رسول اللہؐ کو دیگچی سے کدو کے ٹکڑے نکالتے ہوئے دیکھا۔ اس دن سے مجھے کدو سے بے پناہ محبت ہے۔'' بہت سے پرہیزگار مسلمان سید احمد خان کی مثال کو نمونہ سمجھتے ہیں جنہوں نے ۱۸۵۰ عیسوی میں، جب ان کی عمر ۳۰ سال تھی، دہلی کے (صدرالدین۔ مترجم) مفتی آزردہ کے ساتھ آم کھانے کے مسئلے پر تبادلہ خیالات کیا تھا۔ انہوں نے گفتگو کے آخر میں زور دے کر کہا تھا: ''خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر کوئی شخص صرف اس نیت سے آم کھانے سے اجتناب کرے کہ نبی کریمؐ نے آم نہیں کھائے تھے تو فرشتے بستر مرگ پر آ کر اس کے پاؤں چومیں گے۔'' ان کا خیال تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے پسندیدہ پھل آم کو کھانا ''مشکوک'' ہے اس لیے بہتر ہے کہ اسے ترک کر دیا جائے۔ سید احمد نے، جنہیں بعد میں ہندوستانی اسلام کا مصلح بننا تھا، ایک ہزار برس پہلے کے عظیم صوفی بایزید بسطامیؒ کی تقلید کی تھی جنہوں نے ساٹھ سال تک صرف اس لیے خربوزے نہیں کھائے تھے کیوں کہ انہیں یہ پتا نہیں تھا کہ حضورؐ نے خربوزے کو کس طرح کاٹا تھا؟

(میرے مرشد محمد اقبالؒ نے بایزید بسطامیؒ کے اس واقعے کو مندرجہ ذیل شعر میں بیان کیا ہے:

کاملِ بسطام در تقلید فرد
اجتناب از خوردنِ خربوزہ کرد

حضرت بایزید بسطامیؒ نے خربوزہ کھانے سے محض اس بنا پر اجتناب کیا تھا کہ انہیں معلوم نہ تھا کہ نبی کریمؐ نے یہ پھل کس طرح کھایا ہے۔ اسی کامل تقلید کا نام عشق ہے۔ مترجم)۔

مسلمان کھانے کے سلسلے میں آں حضرتؐ کی پسندیدہ خوراک کو عقیدت کی بنا پر ترجیح دیتے ہیں لیکن وہ لہسن اور پیاز سے گریز کے ضمن میں حضورؐ کی پیروی کرنے کے پابند نہیں۔ مسجد میں جانے سے پہلے انہیں لہسن اور پیاز نہیں کھانا چاہیے۔ رسول اللہؐ ان سبزیوں کی بدبو کو ناپسند کرتے تھے اور آپؐ کا خیال تھا کہ اللہ کی طرف سے حضورؐ کے لیے وحی لانے کے وقت لہسن اور پیاز کی بدبو جبریل امینؑ پر گراں گزر سکتی ہے۔

یہاں ہمیں دوائیوں کے بارے میں نبی کریمؐ کے رویے کا بھی مختصر ذکر کرنا چاہیے۔ حضورؐ نے فرمایا: ''خدا نے

کوئی بھی مرض ایسا نہیں بھیجا جس کے علاج کے لیے اس کی دوائی نہ بھیجی ہو۔'' آپؐ جس پانی سے غسل کرتے، صحابہ کرامؓ برکت کے پیش نظر اسے ایک دوائی کے طور پر دوبارہ استعمال کرتے۔ یہ ایک ایسی روایت ہے جس کا ادیانِ عالم کی تاریخ میں خصوصی تذکرہ ہوا ہے۔ اسی طرح آپؐ کے لعاب دہن کو شفایابی کے لیے استعمال کیا جاتا۔ ایک روایت کے مطابق رسول اللہؐ نے آشوب چشم کے مرض میں مبتلا حضرت علیؓ کی آنکھوں میں اپنا لعاب دہن ڈال کر ان کا علاج کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ آپؐ جسم کو پچھنے لگانے کے عمل کو خاص اہمیت دیتے تھے اور دست آور دوائیاں استعمال کرنے کا مشورہ دیتے تھے کیوں کہ آپؐ پیٹ کو کئی بیماریوں کا اہم ذریعہ قرار دیتے تھے۔ بیماریوں کے متعلق آپؐ کے مختصر اور سرسری ریمارکس کی بنیاد پر مسلمانوں نے طب نبویؐ کے نام سے خصوصی سائنس کو فروغ دیا اور آج بھی کئی مقامات پر مختلف بیماریوں کے متعلق حضورؐ کی ہدایات پر عمل کیا جاتا ہے۔ نبی کریمؐ نے کئی صحابہؓ کا کامیاب علاج کیا جس کی مثالیں مختلف روایات میں ملتی ہیں۔ مریضوں کو شفایاب کرنا ان خدا رسیدہ بزرگوں کا خاصہ ہے جو بعض اوقات معجزوں اور کرامات کے ذریعے بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔ وہ کسی مریض کو چھو کر یا اسے پھونک مار کر بیماریوں کو رفع کر دیتے ہیں۔ کئی مسلمان یہ مشاہدہ کر چکے ہیں کہ جب وہ کسی بیماری میں مبتلا تھے تو رسول اللہؐ نے خواب میں آ کر ان کو مرض سے نجات دلا دی۔ مسلمانوں کو یقین ہے کہ اگر بیماری کی حالت میں نبی کریمؐ کا واسطہ دے کر دعا کریں تو وہ یقیناً شفایاب ہو جائیں گے۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اکثر طبیب (معالج) کے نام سے پکارا جاتا ہے کیوں کہ ''تمام پیغمبر''، جیسا کہ امام غزالیؒ نے کہا ہے، ''روحوں کے طبیب ہیں'' اور وہ انسانی دل کی بیماریوں کو اچھی طرح جانتے ہیں چناں چہ وہ اپنی تعلیمات اور تبلیغ کے ذریعے انہیں ان بیماریوں سے نجات دلا سکتے ہیں۔ حضورؐ کا تذکرہ، خاص طور پر شاعری میں طبیب اور حبیب کے طور پر کیا گیا ہے۔ اسی دہری حیثیت سے ملت اسلامیہ آپؐ پر بھروسا کرتی اور آپؐ سے محبت کرتی ہے۔ مولانا رومیؒ اپنی ایک خوب صورت مختصر عربی نظم میں کہتے ہیں:

ھٰذا حبیبی، ھٰذا طبیبی، ھٰذا ادبی، ھٰذا دوائی

ترجمہ: یہ میرے دوست ہیں، یہ میرے معالج ہیں، یہ میرے معلم ہیں، یہ میرا علاج ہیں

نبی کریمؐ کا روحانی جمال

اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے، حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات گرامی کو جسمانی حسن و جمال کے اعتبار سے کامل نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ آپؐ کا چہرہ انور، جیسا کہ بعد میں آنے والے شاعروں نے کہا: ''قرآن کا پرتو اور خوب صورتی کا مصحف تھا۔ لیکن یہ ظاہری حسن و جمال آپؐ کے داخلی حسن کا آئینہ تھا کیوں کہ خدا نے آپؐ کو فطری اور

اخلاقی محاسن خَلقان وخُلقان ہرلحاظ سے ایک کامل انسان پیدا کیا تھا۔ جب حضورؐ کی چہیتی بیوی حضرت عائشہؓ سے ایک مرتبہ آپؐ کے کردار اور سیرت کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے سادہ لفظوں میں کہا: ''خلقہ قرآن، آپؐ کا اخلاق قرآن تھا، آپؐ وہی پسند کرتے جسے قرآن پسند کرتا ہے اور جس بات پر قرآن ناراض ہوتا ہے، آپؐ بھی اس سے ناراض ہو جاتے۔''

مغرب کے قارئین، جو صدیوں سے پیغمبر اسلامؐ سے نفرت کی روایت کے زیر اثر پلے بڑھے ہیں، یہ جان کر حیران ہوں گے کہ تمام روایات کے مطابق عجز وانکسار اور رحم دلی حضورؐ کی سب سے بڑی خوبی تھی۔ آپؐ کے ثناخواں قاضی عیاضؒ نے لکھا ہے:

خدا نے اپنے پیغمبرؐ کو اعلیٰ اخلاق اور بے مثل محاسن سے نوازا، آپؐ کے درجات بلند کیے، آپؐ کو بے نظیر خوبیوں سے نوازا اور خصوصی اختیارات دیے۔ اللہ نے حضورؐ کے اعلیٰ اوصاف کی اس درجہ تعریف وتوصیف کی ہے کہ زبان اور قلم انہیں بیان کرنے سے عاجز ہیں۔ خدا نے اپنی کتاب (قرآن کریم) میں واضح اور کھلے انداز میں آں حضرتؐ کے اوصاف حمیدہ، اعلیٰ اخلاق اور بلند اور بہترین عادات کی تعریف وتوصیف کی ہے۔ خدا نے اپنے بندوں کو نبی کریمؐ کی اتباع کرنے اور آپؐ کے ساتھ وابستہ رہنے کی ہدایت کی ہے۔ یہ رب ذوالجلال ہی ہے جو عظمت اور بزرگی عطا کرتا ہے۔ اس نے حضورؐ کو روحانی اعتبار سے بلند مرتبے پر فائز کیا، آپؐ کی مدح سرائی کی اور آپؐ کو انسانوں کی رہنمائی کے لیے کامل نمونہ بنایا...... خدا نے رسول اللہؐ کے اعلیٰ اخلاق اور فطرت کو ہماری آنکھوں پر عیاں کیا جو ہر لحاظ سے کامل اور ارفع و بلند مرتبت ہیں۔ اللہ نے آپؐ کو کاملیت کے بلند مرتبے پر فائز کیا، آپؐ کو قابل تعریف خوبیوں سے متصف کیا، بہترین عادات وخصائص اور کئی اعتبار سے فوقیت اور برتری بخشی۔ اس نے روشن وتاباں معجزے دے کر آپؐ کے پیغام کی توثیق کی اور آپؐ کی رسالت کی تائید میں واضح ثبوت اور نشانیاں پیش کیں۔

تمام روایات میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دوستانہ، مشفقانہ لیکن سنجیدہ رویے کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ آپؐ کی یہ عادت مبارکہ تھی کہ آپؐ بہت کم ہنستے تھے۔ (ابتدائی ماخذوں میں ایک مشہور حدیث کا اکثر حوالہ دیا گیا ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا تھا: ''اگر تم وہ کچھ جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم لوگ بہت زیادہ روتے اور بہت کم ہنستے۔'') لیکن روایات میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ حضورؐ انتہائی دل فریب تبسم فرماتے جس سے صحابہ کرامؓ مسحور ہو جاتے۔ امام غزالیؒ کے مطابق حضورؐ اکثر مسکراتے رہتے۔ صدر اول کی بیشتر روایات میں رسول کریمؐ کے دھیمے انداز میں ہنسی مذاق کرنے کے مختلف واقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس نوع کا ایک واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے: ''ایک دن ایک ضعیف خاتون یہ پوچھنے کے لیے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی کہ آیا بوڑھی عورتیں بھی جنت میں جائیں گی؟''

''نہیں!'' حضورؐ نے جواب دیا: ''کوئی بوڑھی عورت جنت میں نہیں ہوگی۔'' پھر آپؐ نے اس معمر خاتون کے غمگین چہرے کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے فرمایا: ''جنت میں سب بوڑھی عورتوں کو جوان بنا دیا جائے گا کیوں کہ جنت میں سب لوگ جوان ہوں گے۔'' صحابہ کرامؓ کے ساتھ معاملت کرتے وقت آں حضرتؐ کے عملی تدبر اور بے نظیر دانش مندی کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال وہ حدیث ہے جس میں آپؐ نے ابو ہریرہؓ سے فرمایا تھا: ''میرے پاس کبھی کبھی آیا کرو، اس طرح محبت بڑھتی ہے۔''

ابتدائی ماخذوں میں کمزور لوگوں کے ساتھ حضورؐ کے شفقت آمیز سلوک کا نمایاں طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں بیان کیا گیا ہے: ''نبی کریمؐ نے زندگی بھر کسی لونڈی یا غلام کو کبھی زدوکوب نہ کیا اور نہ ہی کبھی کسی بیوی پر ہاتھ اٹھایا۔'' امام ترمذیؒ نے اس حوالے سے یوں تذکرہ کیا ہے: ''حضورؐ اکثر آزردہ رہتے، خیالوں میں کھوئے رہتے، بہت کم آرام فرماتے، طویل عرصے تک خاموش رہتے اور بلاضرورت گفتگو نہ کرتے۔ آپؐ گفتگو کے شروع اور آخر میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے۔ آپؐ کی گفتگو ہمیشہ پرمغز اور بامعنی ہوتی، نہ زیادہ لمبی، نہ بہت مختصر، نہ سخت نہ کھردری، نہ زیادہ پرمذاق، نہ ہلکی پھلکی۔ آپؐ خدا کی عظمت کی ہر نشانی کا ادب واحترام کرتے، خواہ یہ نشانی کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو۔ کسی چیز میں عیب نکالنا آپؐ کی عادت نہیں تھی۔''

آپؐ صحابہؓ کو عملی مشورے بھی دیتے۔ جب ایک بدوی نے آپؐ سے یہ دریافت کیا کہ آیا وہ خدا اور اس کی محافظت پر پختہ ایمان رکھتے ہوئے اپنے اونٹ کو کھلا چھوڑ سکتا ہے تو رسول خداؐ نے مختصر جواب دیتے ہوئے فرمایا: ''پہلے اونٹ کو رسے سے باندھو، پھر خدا پر بھروسا رکھو۔'' قضاوقدر کے غیر صحت منداور انسانوں کو اپنے اعمال سے بری الذمہ قرار دینے کے عقیدے کے برعکس کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ مقدر ہو چکا ہے، رسول عربیؐ نے اپنی اس مشہور حدیث میں اس دنیا میں عمل کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے فرمایا: ''یہ دنیا اگلی دنیا کی کھیتی ہے۔'' انسان اس دنیا میں جو بھی عمل کرتا ہے، قیامت کے دن اس کے اچھے یا برے ثمرات بہ ہر حال ظاہر ہو کر رہیں گے۔ اس کے علاوہ ہر مسلمان کو نبی کریمؐ کی یہ مختصر دعا بھی ہمیشہ ذہن نشین رکھنی چاہیے: ''اے خدایا! میرے علم میں اضافہ فرما!'' نیز مسلمانوں کو اپنے ہم عصروں کے ساتھ معاملات طے کرنے اور معاشرے میں اپنے رویے کے حوالے سے بھی اپنے عظیم پیغمبرؐ کی بے مثال شخصیت کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ کیا قرآن حکیم کی سورہ عبس میں ایک نابینا صحابیؓ (عبداللہ ابن مکتوم۔ مترجم) کے ساتھ بے توجہی برتنے پر حضورؐ کو تنبیہ نہیں کی گئی جس کے بعد آپؐ ہر شخص کے ساتھ متوازن انداز میں یکساں شفقت آمیز سلوک کرنے لگے تھے۔ جب کوئی شخص آپؐ کی خدمت میں کوئی سوال کرتا تو آپؐ اس کی حاجت روائی کر کے اسے رخصت کرتے یا نرمی سے معذرت کر دیتے۔ نبی کریمؐ ہر ایک کے ساتھ دوستانہ اور مشفقانہ برتاؤ کرتے جس کا

نتیجہ یہ نکلا کہ ہر کوئی آپ ؐ کا گرویدہ ہو گیا۔ روایات کے مطابق رسول اللہؐ تمام صحابہ کرامؓ کے نزدیک ایک باپ کا درجہ رکھتے تھے۔

ان مختصر ریمارکس کی وضاحت کے لیے بے شمار طویل اور جذباتی داستانیں وضع کی گئیں جو کئی صدیوں پر محیط ہیں۔ ان میں سے ایک قصہ مولانا رومیؒ نے اپنی مثنوی میں اس طرح بیان کیا ہے: ایک مشرک رسول کریمؐ کے پاس آیا اور کفار کی روایت کے مطابق اپنے ساتوں شکموں میں بہت زیادہ کھانا ٹھونس دیا۔ بعد میں اس نے مہمان خانے کو، جہاں وہ قیام کر رہا تھا، بول و براز سے بھر دیا اور پو پھٹنے سے پہلے کمرے کو گندہ کر کے چپکے سے وہاں سے کھسک گیا۔ لیکن اس دوران وہ اپنی کوئی چیز کمرے میں بھول گیا جسے تلاش کرنے کے لیے اسے واپس آنا پڑا۔ واپسی پر اس نے دیکھا کہ نبی پاکؐ اپنے ہاتھوں سے اس کی غلاظت کو دھو رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر اس نے فوراً اسلام قبول کر لیا اور حضورؐ کا عجز و انکسار اور فیاضی کو دیکھ کر سخت نادم ہوا۔ ایسے افسانوی قصے کسی بنیاد کے بغیر وضع نہیں کیے جا سکتے، ان کی جڑیں یقیناً ابتدائی تاریخ میں پیوست ہیں۔ بعد میں ان واقعات کی اس انداز سے تشریح کی گئی کہ مسلمانوں کے نزدیک انہیں آئیڈیل کی حیثیت حاصل ہو گئی اور پاکباز مسلمانوں کے حلقے رسول کریمؐ کے اسوہ حسنہ کی پیروی کرنے لگے۔

اس کے ساتھ ہی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مفلسی اور تنگ دستی اور آپؐ کے اہل خاندان کی دنیاوی وسائل سے محرومی کو جمہور مسلمانوں کے نزدیک ایک اہم موضوع کا درجہ حاصل ہو گیا۔ آپؐ ان چھنے جو کی روٹی کھاتے اور بعض روایات میں بتایا گیا ہے کہ حضورؐ اور آپؐ کا خاندان، خاص طور پر آپؐ کی چہیتی بیٹی حضرت فاطمہؓ پر کئی کئی راتیں فاقے سے گزر جاتیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نبی کریمؐ بھوک کے احساس کی شدت کو دبانے کے لیے اپنے پیٹ پر ہمیشہ ایک پتھر باندھ دیا کرتے تھے۔ حضرت فاطمہؓ کی غربت اور مصائب کا تذکرہ کئی دل گداز واقعات کے ضمن میں کیا گیا ہے (خاص طور پر شیعہ روایات میں)۔ ایک روایت میں ہے کہ آں حضرتؐ جب معراج کے سفر سے واپس تشریف لائے تو اگلی صبح آپؐ کو بھوک مٹانے کے لیے ایک شقی القلب یہودی تاجر سے جو ادھار لینا پڑے تھے۔ عمرؓ ابن الخطاب، جو رسول اللہؐ کے دوسرے خلیفہ منتخب ہوئے، ایک مرتبہ آپؐ کی بے سروسامانی کو دیکھ کر رو پڑے تھے۔ جب ان سے رونے کا سبب دریافت کیا گیا تو انہوں نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کی کہ ایرانی اور بازنطینی حکمران خسرو اور قیصر تو عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن خدا کے پیغمبرؐ فاقوں اور غربت کی حالت میں وقت گزار رہے ہیں۔ اس پر نبی کریمؐ نے جناب عمرؓ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: ''ان لوگوں کے لیے یہ دنیا اور ہمارے لیے اگلی دنیا ہے۔'' کیا خدا نے آپؐ کو اس دنیا کے تمام خزانوں کی چابیاں پیش نہیں کی تھیں؟ لیکن آپؐ نے یہ چابیاں لینے سے انکار کر دیا کیوں کہ آپؐ اپنے پروردگار کی رفاقت کے آرزومند تھے ''جو مجھے بھوک میں کھانا کھلاتا اور پیاس میں پانی

پلاتا ہے۔'' کیا خدا آپ کو داؤدؑ اور سلیمان علیہ السلام کی طرح ایک بادشاہ پیغمبر نہیں بنانا چاہتا تھا؟ لیکن آں حضرتؐ نے خدا کا بندہ اور رسول بننے کو ترجیح دی: ''میں ایک غلام کی طرح کھاتا اور غلام کی طرح بیٹھتا ہوں کیوں کہ میں خدا کا غلام ہوں۔'' آپؐ اکثر و بیشتر یہ دعا کرتے جو بعد میں صوفیوں اور متقی لوگوں کی پسندیدہ دعا بن گئی: ''خدایا مجھے ایک دن بھوکا رکھ اور ایک دن پیٹ بھر کر کھلا۔ جب میں بھوکا ہوتا ہوں تو تجھ سے دعا مانگتا ہوں اور جب میں کھانا کھالیتا ہوں تو تیری حمد و ثنا کرتا ہوں۔'' اہل مکہ نے جب آپ کا جینا دوبھر کر دیا اور آپؐ پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تو آپؐ نے فرمایا: ''دنیا میں پیغمبروں کو سب سے زیادہ مشکلات جھیلنا پڑیں، اس کے بعد ولیوں کو اور اس کے بعد مرتبے کے اعتبار سے دوسرے لوگوں کو!''

بتایا گیا ہے کہ ایک شخص رسول خداؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا: ''یا رسول اللہؐ! مجھے آپؐ سے محبت ہے!'' اس پر حضورؐ نے فرمایا: ''اب تم فقر (غریبی) کے لیے تیار ہو جاؤ!'' اس طرح غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ محبت رسول کریمؐ کے ساتھ محبت کی علامت بن گئی۔ غریبوں کی تکریم کرنے اور انہیں رفیق بنانے کا مطلب نہ صرف پیغمبر اسلامؐ کی اتباع کرنا بلکہ فلاکت زدہ لوگوں میں آپؐ کی عزت و توقیر بڑھانا ہے۔ آپؐ نے غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا: ''انہیں وہی پہناؤ جو خود پہنتے ہو اور انہیں وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو۔'' بعد میں آنے والے زمانوں میں آپؐ کے اس فرمان پر پوری طرح عمل کیا گیا جس کی کئی واقعات سے تصدیق ہوتی ہے۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ فرمان الفقر فخری، میری غریبی میرے لیے باعث فخر ہے، مستقبل میں روحانی بالیدگی کے متلاشی مسلمانوں کے لیے رہنما اصول کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اب غربت کو محض بے کسی اور تہی دستی کی علامت تصور نہ کیا جاتا بلکہ اسے ایک روحانی مرتبہ حاصل ہو گیا جس کے ذریعے انسانوں کو اپنی کم مائیگی اور بے چارگی کا ادراک ہوا اور ان پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ خدائے ذوالجلال کے سامنے ان کی حیثیت صرف ایک عاجز اور ادنیٰ بندے کی ہے کیوں کہ خدا کی ذات غنی ہے، وہ بے نیاز اور کسی کا محتاج نہیں۔ قرآن کریم کی سورہ فاطر میں اس صورت حال کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے: ''اے لوگو! تم اللہ کے محتاج ہو اور اللہ بے نیاز خوبیوں والا ہے۔'' چناں چہ رسول کریمؐ کو اسلام کے عقیدہ توحید اور خدا کی حاکمیت کے نظریے کے ضمن میں ایک کامل نمونے کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ فقر کے صوفیانہ نظریے کا مطلب احسان مندی، شکر گزاری اور تسلیم و رضا ہے۔ ایوب علیہ السلام نے صبر و شکر کے اظہار کے لیے کہا تھا: ''خدا نے دیا تھا، اسی نے واپس لے لیا، سب تعریفیں تمام جہانوں کے پروردگار کے لیے ہیں۔'' حضرت ایوبؑ کے ان الفاظ سے مسلمانوں کے تسلیم و رضا کے نظریے کی عکاسی ہوتی ہے۔ خود نبی کریمؐ بھی صبر و شکر اور خدا کی رضا کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا عملی نمونہ ہیں۔

حضورؐ تمام مخلوقات کے ساتھ شفقت آمیز سلوک کرتے۔ بچوں سے آپؐ کو خصوصی محبت تھی، آپؐ گلی میں ان سے ملتے اور ان کے ساتھ کھیلتے۔ زمانہ بعد میں کئی لوک داستانوں کے رقت انگیز شعروں میں یہ ذکر کیا گیا کہ آپؐ کے دونواسے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ، جنھیں حسنینؓ کہا جاتا ہے، کس طرح نماز کے دوران آپؐ کی کمر پر بیٹھ جاتے تھے۔ لیکن حضورؐ اپنے ان خوش طبع لڑکوں سے، جو عرش کے تخت کے جھومر ہیں، ہرگز پریشان نہ ہوتے۔ حضرات حسنین علیہما السلام سے خصوصی محبت کی وجہ یہ تھی کہ جبرئیلؑ نے آپؐ کو ان دونوں نواسوں کے المناک انجام کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ امام حسنؓ کے لیے ایک سبز اور امام حسینؓ کے لیے سرخ پوشاک لے کر حاضر ہوئے جس سے مراد یہ تھی کہ حضرت حسنؓ کو زہر دیا جائے گا اور حضرت حسینؓ کو میدان جنگ میں شہید کر دیا جائے گا۔ چناں چہ آں حضرتؐ کو ان نواسوں کے ساتھ خصوصی لگاؤ تھا اور کہا جاتا ہے کہ جب ایک شخص نے دیکھا کہ آپؐ حضرت حسنؓ کا منہ چوم رہے ہیں تو اس نے حقارت سے کہا: ''میرے دس لڑکے ہیں لیکن میں نے کبھی ان میں سے کسی کا منہ نہیں چوما۔'' اس پر رسول کریمؐ نے فرمایا: ''جو شخص دوسروں پر رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔''

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جانوروں سے بھی محبت کرتے تھے۔ آپؐ نے ایک مرتبہ اس گنہگار عورت کو جنت کی بشارت دی جس نے پانی پلا کر ایک کتے کی جان بچائی تھی۔ آپؐ بلیوں کو خصوصی طور پر پسند کرتے تھے۔ کیا آپؐ نے نماز ادا کرنے کے لیے مسجد میں جانے کی غرض سے اپنے چغے کی آستین نہیں کاٹ دی تھی جس پر ایک بلی سو رہی تھی؟ آپؐ کو یہ گوارا نہ ہوا کہ آپؐ بلی کے آرام میں خلل ڈالیں۔ ایک بلی نے تو آپؐ کی عبا پر بچوں کو جنم دے دیا تھا۔ آپؐ نے ابوہریرہؓ کی اس بلی کے لیے خصوصی دعا کی جس نے مشفقانہ سلوک کے باوجود حضورؐ کو ڈسنے کی کوشش کرنے والے سانپ کو ہلاک کر دیا تھا۔ چوں کہ آپؐ نے بلی کی کمر پر تھپکی دی تھی، اس لیے بلیاں کبھی کمر کے بل نہیں گرتیں۔ اسی طرح چوں کہ ایک بلی کے ماتھے پر حضورؐ کی پانچ انگلیوں کے نشان پڑ گئے تھے، اس لیے ہر بلی کی آنکھ کے اوپر سیاہ دھاری کا نشان موجود ہوتا ہے۔ (یہاں ہمیں درہ خیبر کے قریب موسم بہار میں کھلنے والے مہکتے ہوئے خوشبودار زرد پھولوں کو بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے جن کی پنکھڑیوں پر سیاہ لکیریں موجود ہوتی ہیں، پٹھان ان پھولوں کو حضورؐ کی نسبت سے پیغامبر گل کہتے ہیں)۔ ایک حدیث شریف میں بلیوں کے ساتھ حضورؐ کی محبت کے حوالے سے آپؐ کا یہ فرمان نقل کیا گیا ہے: ''بلیوں سے محبت ایمان کا جزو ہے۔'' اس قسم کی روایات کے نتیجے میں دنیائے اسلام میں کئی دل کش روایتی کہانیاں وضع کی گئی ہیں۔ اس ضمن میں ابوہریرہؓ کی بلی کا خصوصی تذکرہ کیا گیا ہے جو جرمنی کے لٹریچر کا حصہ بن گیا ہے چناں چہ گوئٹے نے اپنی کتاب West Ostlicher Divan کے ایک باب میں ترجیحی جانوروں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔

اسلام کے غیر مسلم طالب علموں کے لیے رسول کریمؐ کی زندگی کا ایک پہلو، جس کا تعلق تعدد ازواج سے ہے، بہت زیادہ پریشان کن، تکلیف دہ بلکہ صدمے کا باعث ہے۔ زندگی کے آخر تک حضورؐ نے ۹ شادیاں کی تھیں۔ مغرب کے جو عیسائی کنوارے عیسیٰ علیہ السلام کو آئیڈیل سمجھتے ہیں، وہ تجرد اور رہبانیت کی روایت کے سائے میں پلے بڑھے ہیں جس میں ایک ہی بیوی رکھنے پر زور دیا گیا ہے، انہیں یہ دقت پیش آسکتی ہے کہ کوئی سچا پیغمبر شادی بھی کر سکتا ہے یا اس کی کئی بیویاں ہو سکتی ہیں؟ قرون وسطیٰ سے لے کر آج تک پیغمبر اسلامؐ پر بار بار جو حملہ کیا گیا ہے، اس میں شہوت پرستی اور جنسی کج روی کا الزام سرفہرست ہے لیکن مغرب کے برعکس مسلمان یہ محسوس کرتے ہیں کہ دنیاوی اور روحانی معاملات کو یک جان کرنا ان کے پیغمبرؐ کا امتیازی وصف ہے اور یہ خوبی آں حضرتؐ کے اعلیٰ منصب کا خاص ثبوت ہے۔ (قرآن کریم میں چار بیویاں رکھنے کی اجازت ہے لیکن اس کے لیے یہ شرط عاید کی گئی ہے کہ ان سب کے ساتھ انصاف اور مساوی سلوک کیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے کے رسم ورواج میں یہ ایک بہت بڑی پیش رفت تھی)۔ مسلمان سیرت نگار تواتر کے ساتھ یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بعض ازواج مطہراتؓ کے ساتھ اس ارادے کے تحت شادیاں کی تھیں کہ چوں کہ ان کے شوہر اسلام کے لیے جنگیں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے، اس لیے ان بیواؤں کو رہنے کے لیے نئے گھر مہیا کیے جائیں۔ اس کے علاوہ اسرائیل کے دو بادشاہوں حضرت سلیمانؑ اور داؤد علیہ السلام نے، جنہیں قرآن کریم میں پیغمبر کہا گیا ہے اور جو حضورؐ کے پیشرو تھے، بے شمار بیویاں اور لونڈیاں رکھی ہوئی تھیں چناں چہ رسول کریمؐ نے حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد جو شادیاں کیں، ان پیغمبروں کے مقابلے میں ان کی تعداد بہت کم تھی۔ ہمیں اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ آں حضرتؐ نے جوانی میں صرف حضرت خدیجہؓ کے ساتھ شادی کی تھی جن کی عمر اس وقت آپؐ کی عمر سے خاصی زیادہ تھی۔ نبی کریمؐ نے صرف اپنی زندگی کے آخری ۱۳ برسوں میں دوسری ازواجؓ سے شادیاں کیں اور جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، جناب خدیجہؓ رحلت کے بعد بھی حضورؐ کی آئیڈیل رہیں یہاں تک کہ نوجوان عائشہؓ ہمیشہ حضرت خدیجہؓ سے رشک اور حسد کرتی رہی ہیں۔

ازواج مطہراتؓ کے ساتھ بہترین سلوک کی بنا پر رسول اللہؐ ملت اسلامیہ کے لیے ہمیشہ بے مثال نمونہ ثابت ہوئے۔ ''شادی کرنا میری سنت ہے۔'' حضورؐ نے یہ الفاظ جوانی میں کہے تھے چناں چہ اسلام نے مجرد زندگی بسر کرنے کی کبھی تلقین نہیں کی۔ ایک اور حدیث میں رسول کریمؐ نے فرمایا: ''اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں۔'' اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض زاہد و عابد مسلمانوں نے رہبانیت اختیار کیے رکھی لیکن ان متقی اور پرہیزگار لوگوں نے خواب میں حضورؐ کی زیارت کے بعد آخر شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس ضمن میں شیراز کے ابن خفیفؒ (وفات ۹۸۲ عیسوی) اور مولانا رومؒ

کے والد اور نامور عالم دین بہاالدین ولد (وفات ۱۲۳۱عیسوی) کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

رسول کریمؐ کی نجی زندگی کے بارے میں کئی اہم روایات حضرت عائشہؓ سے منسوب ہیں جن کی رائے کو سند کا درجہ حاصل ہے اور جب ان کے والد (ابوبکرؓ) کے دوست (نبی کریمؐ) کے ساتھ ان کی منگنی ہوئی، اس وقت وہ کمسن تھیں اور گڑیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ نے حضورؐ کی شرم و حیا کی خصوصیت پر زور دیا ہے: یہ وہ خوبی ہے جو ہر مسلمان میں بدرجہ اتم موجود ہونی چاہیے۔ حضرت عائشہؓ کئی حدیثوں کی مستند راوی ہیں۔ یہ عائشہؓ ہی ہیں جنہوں نے حضورؐ کو یہ فرماتے سنا: ''میری آنکھیں سوتی لیکن میرا دل جاگتا ہے۔'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ جب بستر پر سوئے ہوتے تو اس وقت بھی آپؐ روحانی طور پر بیدار ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے پروردگار کے ساتھ آپ کا روحانی تعلق ہمیشہ قائم رہتا۔ حضورؐ بعض اوقات حضرت عائشہؓ کو شفقت کے ساتھ فرماتے: ''کلمینی یا حمیرہ!'' (اے سرخ رنگ والی لڑکی! میرے ساتھ باتیں کرو)۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک انسان کی حیثیت سے عورتوں سمیت انسانی زندگی کے تمام کمزور پہلوؤں سے بخوبی آگاہ تھے۔ گوئٹے نے West Ostlicher Divan میں اس حدیث مبارکہ کو کمال خوبی کے ساتھ شعری قالب میں ڈھالا ہے: ''خدا نے عورت کو ایک خمیدہ پسلی سے پیدا کیا ہے۔ اگر اس کا شوہر اسے استعمال کرنا چاہتا ہے تو اسے اس کجی کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے کیوں کہ اگر وہ اسے مروڑ کر سیدھا کرنے کی کوشش کرے تو وہ ٹوٹ جائے گی اور اس کے ٹوٹنے کا مطلب طلاق ہے۔'' جدید دور کی اصطلاح کے مطابق اس سے مراد عورتوں کے مساوی حقوق اور آزادی نہیں لیکن عرب کے اس زمانے کے سماجی نظام میں، جب والدین لڑکی کی پرورش اور اس کے نان ونفقے کا انتظام کرنے کے خوف سے نومولود لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے، یہ ایک بہت بڑی پیش رفت تھی۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ مسلمان شارحین حضورؐ کے تعدد ازواج کے مسئلے پر پوری طرح آگاہ ہیں اور وہ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ عورتیں عام طور پر مردوں کی توجہ خدا سے ہٹا کر انہیں دوسرے مشاغل میں مصروف اور انہیں روحانی نصب العین سے دور کر دیتی ہیں لیکن ان سیرت نگاروں کا کہنا ہے کہ نبی کریمؐ کا معاملہ دوسرے لوگوں سے بالکل مختلف تھا: ''حضورؐ کی ازواج مطہراتؓ نے آپؐ کی توجہ خدا سے کبھی نہیں ہٹائی تھی بلکہ ان کی موجودگی کے باعث آپؐ کے تقوے اور پرہیز گاری میں اضافہ ہوا، آپؐ نے ان کی عفت اور پاکبازی میں اضافہ کیا اور اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں انہیں شریک کار بنایا۔ دوسرے لوگوں کے لیے گو کہ شادی اس دنیا کا معاملہ ہے لیکن آں حضرتؐ نے شادیوں کے ذریعے اگلی دنیا کے لیے جستجو کی۔'' (Andrae: Die Person Muhammads, p.205)۔ قرون وسطیٰ کے ایک سیرت نگار کے خیالات کی صدائے بازگشت بیسویں صدی کے اس مصنف کے الفاظ میں اس طرح سنائی دیتی ہے: ''رسول اللہؐ کی

کثیر الازدواجی کا گوشت پوست سے بنے انسان کی کمزوریوں سے دور کا بھی تعلق واسطہ نہیں بلکہ ان کی نوعیت خاندان کے بزرگ اور سردار کے طرز عمل جیسی ہے، آپؐ نے دنیا سے کنارہ کش کسی ولی اللہ کا کردار ادا نہ کیا بلکہ آپ کی پوری زندگی عمل سے عبارت تھی اور یہ شادیاں عملی ضروریات کے تحت کی گئی تھیں۔ آں حضرتؐ نے دنیوی زندگی کے حقائق کو تسلیم کیا اور عمل سے بھرپور زندگی گزاری، آپؐ نے دنیاوی حقیقتوں کو باہم مربوط کر کے زندگی کی تطہیر کے ذریعے اسے تقدیس کی رفعتوں سے ہم کنار کیا۔'' (Nasr: Ideals and Realities of Islam, p.76)۔

اس ضمن میں یہ بات پوری طرح ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ رسول کریمؐ ماؤں کو بے حد احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جریج نامی راہب حضورؐ سے ملاقات کرنے کا خواہش مند تھا لیکن آپ کو یہ بتایا گیا کہ وہ اپنی ماں کی دیکھ بھال نہیں کرتا۔ اس پر آں حضرتؐ نے فرمایا: ''اگر جریج پڑھا لکھا راہب ہے تو اسے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ماں کے بلاوے پر اس کی خدمت میں حاضر ہونا خدا کے حکم کی تعمیل کرنے کے مترادف ہے۔'' (الحکیم الترمذی، نوادر الاصول صفحہ ۳۰۱)۔ رسول کریمؐ سے یہ خوب صورت حدیث بھی مروی ہے: ''جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔''

رسول خداؐ کے بعد اسلامی معاشروں میں عورتوں کے لیے پردے جیسی کئی رسوم رائج ہو گئیں جنھیں آپؐ سے منسوب کر دیا گیا۔ لیکن آپؐ نے صرف ازواج مطہراتؓ کے لیے بعض پابندیوں کا حکم دیا تھا۔ پردے کے حوالے سے قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے صرف ''مومنوں کی ماؤں'' سے خطاب کیا ہے اور ان کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے جسموں کو مناسب پردے سے ڈھانپا کریں۔ روایات کے مطابق خواتین کو سر ڈھانپنے کا حکم دیا گیا ہے نہ کہ چہرے کو ڈھانپنے کا! حضرت عائشہؓ کی مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے صدر اول کی خواتین سماجی زندگی اور امت مسلمہ کے معاملات میں سرگرمی سے حصہ لیتی تھیں۔ رسول کریمؐ کی وفات کے طویل عرصے کے بعد حضرت عائشہؓ میدان جنگ میں چلی گئی تھیں۔

ہر چند کہ مسلمان زاہد و عابد درویشوں نے خواتین کو خطرناک، دغاباز اور کم عقل مخلوق قرار دے کر عورتوں کی توہین کی ہے لیکن وہ صنف نازک کے امیج کو مکمل طور پر مسخ نہیں کر سکے کیوں کہ قرآن مجید نیک و پارسا اور صاحبِ ایمان مردوں اور عورتوں المومنون والمومنات کا بار بار تذکرہ کرتا ہے اور مسلمان خواتین کو المسلمات کے نام سے موسوم کرتا ہے جن پر مردوں کی طرح کئی دینی فرائض عاید ہوتے ہیں اور انھیں ان کے اچھے اعمال کا برابر اجر ملے گا۔ ازواج مطہراتؓ اور اپنی صاحبزادیوںؓ، خاص طور پر حضرت فاطمہؓ کے ساتھ حضورؐ کی خصوصی شفقت اور محبت سے بھی خواتین کے بارے میں آپؐ کے مثبت طرز عمل کی عکاسی ہوتی ہے۔ احادیث کی کتابوں میں رسول کریمؐ سے

منسوب اس حدیث کا اکثر ذکر ہوا ہے: ''خدا نے عورتوں اور خوشبو کو تمہاری دنیا میں سب سے محبوب بنایا ہے اور نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔'' قرونِ وسطیٰ کے عظیم صوفی ابن عربیؒ نے اس حدیث مبارکہ کو پیغمبر اسلامؐ کے افکار کے اسرار کا صحیح ادراک کرنے کے لیے مرکزی نکتہ قرار دیا ہے۔ کسی بھی غیر مسلم کو اس حدیث پر یقیناً حیرت ہوگی لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس حدیث مبارکہ سے حضورؐ کے دہرے فرض منصبی کا پتا چلتا ہے اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آپؐ یہ جانتے تھے کہ اس دنیا کو کس طرح آخرت کے ساتھ یکجا کیا جا سکتا ہے اور اگر ہم اسلامی توضیح و تصریح پر کاربند رہیں تو دونوں جہانوں میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔

نبی کریمؐ کی حیات مقدسہ کا ایک اور پہلو، جو مغربی ذوق کے لیے ناگواری اور کراہت کا سبب بن سکتا ہے اور جس کا تجزیہ کرنا بہت مشکل ہے، دین اور دنیا کو یکجا کرنا ہے۔ ایک غیر مسلم شخص حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شخصیت کا اس انداز سے جائزہ لیتا ہے کہ آپؐ ''پیغمبر اور سیاست دان'' تھے۔ مغرب میں عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اگرچہ حضورؐ شروع میں راہِ حق کے مخلص متلاشی تھے لیکن بعد میں جب آپؐ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو آپؐ (نعوذ باللہ۔ مترجم) اصولوں سے بے نیاز سیاست دان اور تیزی کے ساتھ پھلنے پھولنے والی مسلح جماعت کے چالاک لیڈر بن گئے تھے۔ لیکن ایک مسلمان اس واقعے کو مکمل طور پر ایک نئے زاویے سے دیکھتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کا یہ پیغام نا تمام اور ادھورا ہے جس میں اس دنیا سے کنارہ کشی کرنے اور اگلی دنیا کی نعمتوں پر زور دیا گیا ہے۔ گو کہ اس پیغام میں قابلِ قدر امتیازی خصائص موجود ہیں، اس کے باوجود یہ پیغام نامکمل اور ناقص ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک کامیاب پیغمبر کو اس پیغام کی تشہیر کے لیے دنیاوی وسائل استعمال کرنے چاہییں جو خدا نے اس کو تفویض کر رکھا ہے۔ ایک غیر مسلم کو حضور نبی کریمؐ کے پیغمبرانہ رول اور ایک سیاست دان کی حیثیت سے آپؐ کے کردار میں تضاد نظر آتا ہے لیکن ایک مسلمان کی نظر میں حضورؐ کو یہ امتیاز حاصل ہے اور یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ آپؐ نے خدا کے پیامبر کی حیثیت سے دنیا میں بے مثل کردار ادا کیا ہے جس سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عظمت اور آپؐ کے پیغام کی صداقت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ خدا، جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا، آخر کار آپؐ کو کامیابی سے ہم کنار نہ کرتا اور آپؐ امت کی رہنمائی نہ کرتے؟

بدر کے معرکے میں خدا نے اعلان کیا: ''اور آپؐ نے خاک کی مٹھی نہیں پھینکی بلکہ اللہ تعالیٰ نے وہ پھینکی۔'' (سورہ الانفال، آیت ۱۷)۔ اس آیہ مبارکہ کا مطلب ہجرت کر کے مدینہ آنے والے مسلمانوں کو پہلی مرتبہ یہ احساس دلانا تھا کہ خدا کے فرشتے اس جدوجہد میں ان کی مدد کر رہے ہیں۔ بعد میں جب قریش کے ساتھ کئی جھڑپیں ہوئیں اور اہل مکہ کے ساتھ مذاکرات کے نتیجے میں نسبتاً مختصر وقت میں امن قائم ہو گیا تو مسلمانوں نے اس کامیابی کو خدائی

اعانت و دست گیری اور ربانی نشانیاں قرار دیا۔ حضورؐ کی زندگی میں جزیرہ نما عرب میں نہایت سرعت کے ساتھ اسلام کے فروغ اور نبی کریمؐ کی وفات کے بعد پہلی صدی ہجری کے دوران اسلامی سلطنت میں زبردست توسیع کے بعد رسالت مآبؐ کی صداقت میں شک کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ اب یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ اسلام ایک سچا دین ہے اور جس شخصیت نے اسلام کی دعوت دی ہے، وہ خدا کا سچا پیغمبر ہے۔ خدا کی جانب سے آخری اور جامع وحی کس پر نازل ہوئی ہے؟ آپ کو صرف عربوں کی طرف مبعوث نہیں کیا گیا تھا بلکہ ''گورے اور کالے'' غرض دنیا کے تمام لوگوں اور تمام نسلوں کی جانب بھیجا گیا تھا۔

ظہور اسلام کے بعد ابتدائی زمانے میں بھی اسلام کی کامیابی کو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیغام کی صداقت کا ثبوت سمجھا گیا اور عصر جدید میں بھی اس دلیل کو اسلام کے آفاقی پیغام کی کامیابی سے تعبیر کیا جارہا ہے۔ اگر روشن خیالی اور لبرل روایات کے زیر سایہ پلنے بڑھنے والا ایک مغربی مبصر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ مذہب اور سیاست کو (وسیع تر مفہوم کے تناظر میں) ایک دوسرے سے الگ کردینا چاہیے اور یہ کہ مذہب ایک ذاتی، باطنی اور خالص نجی معاملہ ہے جس کا تعلق صرف دل سے ہے تو ایک روایتی مسلمان اس کے جواب میں واضح کرے گا کہ مذہب اور سیاست اصل میں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ اگر پیغمبر اسلامؐ کی مثال، جیسا کہ اسلامی تاریخ میں اکثر مقامات پر کہا گیا ہے، ایک نخلستان جیسی ہے اور پوری نسل انسانی حضورؐ کی ذات کے گرد طواف کرتی ہے تو زندگی کے تمام سیاسی اور سماجی پہلو بھی اسی عمل کا حصہ ہیں۔ رسول کریمؐ کی سیاسی فہم وفراست، مکہ بلکہ مدینہ میں سماجی اصلاح کے لیے آپ کی جدوجہد، میثاق مدینہ، جدید جمہوری اداروں کے نمونے کی حیثیت سے آج بھی بنظر تحسین دیکھے جاتے ہیں اور اقتصادی شعبے میں حضورؐ کی سرگرمیاں، غرض ان تمام باتوں میں ایک ماڈرن مسلمان کے لیے قابل قدر مثالیں موجود ہیں اور وہ اپنی اور اپنی پوری برادری کی زندگی کو اسی سانچے میں ڈھالنے کی تگ ودو کرتا ہے۔ اسلام میں ایک اچھی روحانی سلطنت اور برائیوں سے آلودہ مادی دنیا کے درمیان خط امتیاز کھینچنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، نہ ہی یہاں دین اور دنیا میں کوئی دوئی ہے۔ اس دنیا کو بھی اللہ تعالیٰ نے تخلیق کیا ہے اور اس نے اسے انسان کے تابع بنایا ہے۔ یہی ایک وجہ ہے کہ کٹر عقاید رکھنے والے مسلمان تصوف کے اس مروجہ نظریے کے خلاف ہیں جس کی رو سے اگلی دنیا کے لیے اس دنیا کی مذمت اور لعن طعن کی جاتی اور لافانی مسرتوں کی امید میں ترک دنیا کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ''اسلام کی روحانیت، جس کا عملی نمونہ حضور نبی کریمؐ نے پیش کیا، دنیا کو مسترد کرنا نہیں بلکہ اس کا مقصد ایک مربوط طریقے سے ایسی ہم آہنگی پیدا کرنا ہے جس کی بنیاد خدا کی کامل اور حقیقت مطلق کی تلاش پر رکھی گئی ہے۔'' (Nasr: Ideals and Realities of Islam, p.77)۔ رسول خداؐ نے خدا کی جس بادشاہت کا اعلان کیا، وہ اسی دنیا کی بادشاہت ہے۔ چناں چہ وہ صوفی،

جوذات باری تعالیٰ کے مشاہدے میں غرق ہو جاتا ہے، اس مادی دنیا میں واپس آنے کے بجائے اسی روحانی سلطنت میں بدستور قیام کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کا یہ طرزِ عمل حضورؐ کے طریق کار کے بالکل برعکس ہوتا ہے کیوں کہ آپؐ خدا کے ساتھ مکالمے کے بعد، جس کو بیان کرنے کے لیے الفاظ موجود نہیں، اس دنیا کی حالت کو بہتر بنانے اور اپنے روحانی وجدان کے ثمرات کو معاشرے کی بہبود کے لیے استعمال کرنے کی غرض سے اس دنیا میں واپس آ گئے تھے۔

اس تصویر کا ایک رخ جہاد یا نام نہاد مقدس جنگ ہے جس کی تشریح اس طرح کی جاتی ہے گویا یہ کافروں کے خلاف جنگ ہے تاکہ پوری دنیا قیامِ امن کے لیے اسلام کے پرچم تلے جمع ہو جائے۔

نبی کریمؐ نے تصورات کو عملی شکل دینے کی غرض سے انسان میں موجود جنگجوئی کے جوہر کو کاملیت کے نقطہ عروج پر پہنچا دیا ہے۔ اگر ہم چشمِ تصور سے گوتم بدھ کو دیکھیں تو وہ جنگل میں ایک درخت کے نیچے عالمِ استغراق میں غور و فکر کرتا نظر آئے گا لیکن اس کے برعکس حضورؐ ایک برق رفتار گھوڑے پر سوار نظر آئیں گے جن کے ہاتھ میں انصاف اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے والی تلوار ہے، آپؐ گھوڑے کو پوری رفتار کے ساتھ دوڑا رہے ہیں، اس کے باوجود آپؐ حق و صداقت کے پہاڑ کے سامنے فوری طور پر رکنے کو تیار ہیں ...... آپؐ کا قیام اور آرام بھی بذاتِ خود جہاد تھا جس سے روحانیت کے اس پہلو کا مظاہرہ ہوتا ہے کہ امن حالت جمود یا بے حس و حرکت پڑے رہنے سے نہیں، حقیقی طور پر سرگرمِ عمل رہنے سے ہی قائم ہو سکتا ہے۔ امن صرف اسی کی میراث ہے جو خدا کی رضا سے داخلی طور پر امن اور عملی اعتبار سے تفرقہ اور انتشار اور عدم توازن پیدا کرنے والی قوتوں کے خلاف برسرِ پیکار ہو۔ (Nasr: Ideals and Realities of Islam, p.74)۔

جہاد کے نصب العین کا عمیق سطح پر جائزہ لینے کے بعد رسول کریمؐ کی اس مشہور حدیث کی حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے جس میں آپؐ نے اعلان کیا تھا کہ سب سے بڑا جہاد وہ ہے جو اپنے نفس کے خلاف کیا جائے۔ چناں چہ جہاد کا مقصد جبلی اور بری عادات پر قابو پا کر انہیں مثبت خوبیوں کے سانچے میں ڈھالنا ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس انسانی جوہر کو ''پیغمبرانہ نہیں'' کی اصطلاح میں مجسم کر دکھایا (Nathan Soderbloom) اور یہ خوبی آپؐ کی پیغمبرانہ مذہبیت کا امتیازی وصف ہے جو ''تصوفانہ نہیں'' کے بالکل برعکس ہے۔

آں حضرتؐ کی سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کی تشریح اور توضیح کے سلسلے میں مسلمانوں میں آسانی سے اختلافات پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس ضمن میں ہمارے سامنے جو مواد موجود ہے، اس کی کئی جہتیں ہیں اور ان میں اکثر تضاد پائے جاتے ہیں چناں چہ اسلام کی ابتدائی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ صدر اول کے مسلمانوں میں اس بارے میں کئی مسائل پیدا ہو گئے تھے کہ وہ نبی کریمؐ کے اس نصب العین کو دنیا میں کیسے نافذ کریں؟ جدید قوموں کو، جب وہ قرآن اور سنت کی

تعلیمات کی بنیاد پر صحیح معنوں میں ''اسلامی ریاست'' قائم کرنے کی کوشش کرتی ہیں تو انہیں ان ہی مشکلات اور مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ رسول اللہؐ کے سیاسی کیریئر کے بعض پہلوؤں سے مسلمانوں کو کئی خصوصی اصطلاحیں مل گئی ہیں۔ مثال کے طور پر نیک اور پارسا مسلمان مردوں اور عورتوں کی طرف سے اپنا وطن اور گھر بار چھوڑ کر کسی اسلامی مملکت میں پناہ لینے کی جستجو اور تلاش کو حضورؐ کی مکہ سے مدینہ مراجعت کی مناسبت سے ہجرت کی اصطلاح وجود میں آ گئی ہے۔ اس قسم کی ایک ہجرت ہندوستان میں برٹش راج قائم ہونے کے بعد ہوئی۔ اسی طرح ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں بھارت سے پاکستان آنے والوں کو نبی کریمؐ کے ساتھ مدینہ میں مقیم صحابہ کرامؓ کے حوالے سے مہاجر کہا جاتا ہے۔ اس لفظ سے ان لوگوں کی ہجرت میں ایک مذہبی چاشنی پیدا کی گئی ہے۔

رسول کریمؐ جنگ میں ہوں یا حالت امن میں، گھر میں ہوں یا باہر کی دنیا میں، مذہبی سرگرمیوں میں حصہ لے رہے ہوں یا دنیاوی کام کاج میں مصروف عمل ہوں، آپؐ ہر حالت میں کاملیت کا بہترین نمونہ ہیں۔ اخلاقی اعتبار سے آپؐ کا ہر عمل مثالی ہے اور آپؐ نے جو کچھ بھی کیا، وہ مسلمانوں کے لیے ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ چناں چہ حضورؐ کی دعائیں بھی مسلمانوں کے نزدیک ضابطے اور دستور کا درجہ رکھتی ہیں اور وہ خدا کی رحمت کے امیدوار کی حیثیت سے نبی کریمؐ کی پیروی کرتے ہوئے ان قرآنی آیات کا مسلسل ورد کرتے رہتے ہیں جو رحمت للعالمینؐ کو بہت زیادہ مرغوب تھیں۔ یہ آیات مسلمانوں کو بھی دل سے عزیز ہیں اور وہ اسی طرح ان آیات کی تلاوت کرتے ہیں جس طرح حضورؐ نے ان کی تلاوت کی تھی۔ مثال کے طور پر مسلمان سونے کے لیے بستر پر لیٹتے وقت حضرت عائشہؓ سے مروی اس حدیث مبارکہ کو یاد کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہؐ جب بستر پر لیٹ جاتے تو آپؐ اپنے دونوں ہاتھوں کو ملا کر الاخلاص (سورہ ۱۱۲) اور معوذتین (سورہ ۱۱۳، ۱۱۴) کی تلاوت کر کے اپنے ہاتھوں پر پھونک مارتے اور جسم کے ان حصوں پر ہاتھ پھیرتے جہاں تک ہاتھ پہنچ سکتے تھے۔ اس عمل کا آغاز آپؐ اپنے سر، چہرہ مبارک اور قریبی اعضا سے کرتے۔ آپؐ تین مرتبہ یہ عمل کرتے۔ حضورؐ کے اس عمل کی نقل کرنے کی اجازت ہے۔ آں حضرتؐ سے ایسی کئی دعائیں منسوب ہیں جن میں یہ دعا بھی شامل ہے۔ اسلام کے متعلق ہر معیاری کتاب میں ایسے ابواب شامل ہوتے ہیں جن میں رسول کریمؐ کی مفید دعاؤں کی تفصیل درج ہوتی ہے۔ یہ دعائیں سب سے پہلے حضورؐ نے پڑھیں اور مسلمان آپؐ کی پیروی کرتے ہوئے اب بھی ان دعاؤں کو پڑھتے ہیں۔

ان دعاؤں سے حضور رسالت مآبؐ کے عجز و انکسار اور خدا کی ذات پر کامل بھروسے کی مکمل عکاسی ہوتی ہے۔ آپؐ اپنے پروردگار سے ہمیشہ توبہ و استغفار کرتے چناں چہ آپؐ نے فرمایا کہ میں دن میں ستر (بعض اوقات

ایک سو) مرتبہ خدا سے مغفرت اور بخشش کی دعائیں مانگتا ہوں۔ گو کہ یہ اسلوب مسلمانوں میں طویل عرصے سے رائج اس نظریے سے متصادم ہے کہ آپؐ گناہوں اور خامیوں سے مبرّیٰ ہیں، آپؐ کے اس فعل کی توضیح عموماً اس طرح کی جاتی ہے کہ یہ دعائیں آپؐ نے اپنے گنہگار امتیوں کی رہنمائی کے لیے مانگی ہیں تا کہ وہ اپنی انسانی کمزوریوں سے آگہی حاصل کر کے خدا سے اپنی لغزشوں اور گناہوں کی معافی مانگ سکیں۔ یہاں آپؐ ایک معلم کی حیثیت سے اپنے پیروکاروں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپؐ ہر حال میں ایک بہترین رہنما ہیں کیوں کہ آپؐ کا فرمان ہے کہ میں اچھے اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوا ہوں۔

دوسرے تمام بڑے مذہبی رہنماؤں کی طرح حضورؐ نے بھی اپنی امت کو اعلیٰ اخلاقی قدروں کی تعلیم دی ہے اور ملت اسلامیہ کے ہر فرد کو ان اخلاقی محاسن کی قدر و قیمت سے روشناس کرایا ہے۔ چناں چہ جب آپؐ سے سوال کیا گیا کہ نیکی کیا ہے تو آپؐ نے جواب میں کہا: اپنے دل سے فتویٰ پوچھو۔ نیکی یہ ہے کہ روح امن اور چین محسوس کرے اور دل کو آسودگی حاصل ہو اور گناہ وہ ہے جو روح کو مضطرب کرے اور سینے میں کھٹکے۔ جب حضورؐ سے دریافت کیا گیا کہ بہترین اسلام کیا ہے تو آپؐ نے فرمایا: بہترین اسلام یہ ہے کہ بھوکے کو کھانا کھلاؤ اور ان لوگوں میں، جنہیں تم جانتے ہو یا نہیں جانتے، امن پھیلاؤ۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اسوہ حسنہ، اپنے اعلیٰ کردار اور افکار اور ذاتی مثال کے ذریعے امت کے ہر مرد اور عورت کو یہ سبق سکھایا کہ وہ اپنی ذات اور وجود کی وساطت سے خدا کی وحدانیت کی گواہی دے۔ چناں چہ جیسا کہ دلائل الخیرات میں کہا گیا ہے، ہر نیک مسلمان کو یہ دعا کرنی چاہیے: ''اے ہمارے پروردگار! میں تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ ہمیں حضورؐ کے اسوہ حسنہ پر کاربند رکھ، ہماری زندگی کا خاتمہ آپؐ کی امت میں ہو، ہمیں آپؐ کی امت میں شمار کر، ہمیں آپؐ کے پرچم تلے رکھ، ہمیں آپؐ ہی کی رفاقت میسر ہو، ہمیں آپؐ ہی کے حوض سے سیراب کر، ہمیں آپؐ ہی کے دست مبارک سے پانی پلا اور آپؐ کے عشق و محبت کی دولت بخش!''

سیرت محمدی اور آپؐ کے اسوہ حسنہ کی پیروی، یہی وہ آئیڈیل ہے جس نے مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک کے مسلمانوں میں وحدت عمل کا جوہر پیدا کر دیا ہے چناں چہ ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسے ایک مکان میں داخل ہونے کے لیے کیا طریق کار اختیار کرنا چاہیے، کسی کو کس طرح خوش آمدید کہنا ہے، اچھی صحبت میں کن چیزوں سے گریز کرنا چاہیے، کھانا کیسے کھانا چاہیے اور سفر کس طرح کرنا چاہیے۔ صدیوں سے مسلمان بچوں کو ان طور طریقوں کی تعلیم دی جا رہی ہے لیکن ماڈرن ٹیکنالوجیکل کلچر کی وجہ سے حال ہی میں یہ روایتی دنیا ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگی ہے۔ اسلامی روایت پرستی کو آج جو خطرات لاحق ہو گئے ہیں، ان کی وجہ سے مسلمانوں میں بنیاد پرستی کو فروغ حاصل ہو

رہا ہے اور مغربی دنیا کو، جو اس خطرے سے نمٹنے کے لیے تیار نہیں، اچانک ایک خلاف توقع اور حیرت انگیز صورت حال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

لیکن ہر شخص کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اگر پیغمبر اسلامؐ کی طلسماتی شخصیت میں کوئی غیر معمولی کرشمہ ودیعت نہ کیا گیا ہوتا تو مسلمانوں میں آپؐ کے ہر قول و فعل کی پیروی کرنے کا جذبہ ہرگز کارفرما نہ ہوتا۔ جیسا کہ Johann Fuck نے بالکل صحیح کہا ہے: ''ہم آج بھی مسلمانوں میں تقوے اور پرہیز گاری کی اس جھلک کا مشاہدہ کر سکتے ہیں جس نے ۱۳۰۰ سال پہلے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ابن عبداللہ کو آگے بڑھ کر خدا اور روز جزا کی تبلیغ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔'' اور ہم تور آندرے Tor Andrae کے خیالات سے بھی پوری طرح متفق ہیں جنہوں نے روحانی پاکیزگی سے متعلق مسلمانوں کے نظریے میں رسول اللہؐ کے رول کا تجزیہ کرتے ہوئے ۱۹۱۷ء میں لکھا تھا: ''ہمارے پاس یہ یقین کرنے کے لیے خاصے دلائل موجود ہیں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دلوں کو تسخیر کرنے کا فن اچھی طرح جانتے تھے اور آپؐ میں یہ وصف بدرجہ اتم موجود تھا۔''

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی بے مثل حیثیت

اسلام میں پیغمبروں کے تذکرے کے ضمن میں ایک اہم باب کا تعلق رسول کریمؐ کے اسمائے گرامی سے ہے۔ اس اصطلاح کا مطلب بنیادی طور پر (اخلاقی گراوٹ یا فسق و فجور سے) تحفظ یا آزادی ہے اور یہ خوبی نہ صرف کامل اخلاقی دیانت اور راست بازی بلکہ خطا سے پاک اور منزیٰ ہونے کی دلالت کرتی ہے کیوں کہ جیسا کہ اسلام ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے، خدا اپنے پیغمبروں کو گناہ اور غلطیوں سے اس لیے محفوظ رکھتا ہے تا کہ اس کے الہامی کلام میں کسی قسم کی آلودگی در نہ آ سکے اور پیغام خداوندی کے حامل انسان کا کردار ہر بیرونی داغ دھبے سے پاک رہے۔

اسما کے نظریے کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے قاری کو اسلام میں پیغمبروں کے کردار کو دوبارہ ذہن نشین کرنا چاہیے۔ قرآن کریم نے سورہ یونس کی ۴۷ویں آیت میں بیان کیا ہے: ''اور ہر امت کے لیے ایک رسول ہے، سو جب ان کا رسول آ چکتا ہے ان کا فیصلہ انصاف کے ساتھ کیا جاتا ہے اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا۔'' آگے چل کر قرآن مجید کی سورہ ابراہیم کی چوتھی آیت میں یوں ارشاد ہوتا ہے: ''ہم نے ہر ہر نبی کو اس کی قومی زبان میں ہی بھیجا ہے تا کہ ان کے سامنے وضاحت سے بیان کر دے۔'' مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ خدا نے خود کو تاریخ میں کسی گواہ کے بغیر نہیں چھوڑا اور حضرت آدمؑ سے لے کر، جو پہلے انسان اور پہلے نبی تھے، خدا کے فرستادہ پیغمبر بنی نوع انسان کو خدا کی رضا اور منشا سے مسلسل آگاہ کرتے رہے ہیں یہاں تک کہ سب سے آخر میں خدا نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو یـایھا النبی (اے نبیؐ: سورہ الاحزاب آیت ۱) اور خاتم الانبیا کہہ کر پکارا۔ لیکن نبی دنیا میں کوئی نیا قانون نافذ کرنے کا مجاز نہیں، یہ فریضہ رسول یا پیغمبر کا ہے۔ بہ ہر حال ہمیں انبیا کی تعداد کا علم نہیں لیکن قانون ساز پیغمبروں کی تعداد کا تعین کرنا ممکن ہے۔ نبی کریمؐ سے ایک مشہور حدیث منسوب ہے جس میں حضورؐ نے انبیا کی تعداد ایک لاکھ ۲۴ ہزار اور رسولوں کی تعداد ۳۱۳ بتائی ہے۔ قرآن کریم میں ان میں سے ۲۸ رسولوں کے نام موجود ہیں البتہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ جن پیغمبروں کا

قرآن میں تذکرہ نہیں کیا گیا، ممکن ہے کہ وہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پہلے لوگوں میں خدا کے دستور اور قوانین کی تبلیغ کے لیے چین یا جنوبی امریکا میں معبوث ہوئے ہوں۔

عظیم پیغمبروں میں سے پانچ کا شمار اولوالعزم رسولوں میں ہوتا ہے۔ (پس اے پیغمبرؐ! تم ایسا صبر کرو جیسا صبر عالی ہمت رسولوں نے کیا۔ سورہ الاحقاف آیت ۳۵)۔ ان رسولوں میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، حضرت ابراہیمؑ (تین ابراہیمی مذاہب یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے جدامجد)، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور نوح علیہ السلام شامل ہیں۔ نبی کریمؐ کے بعد حضرت ابراہیمؑ سب سے بلند مرتبت ہیں اور علم معرفت کے ماہرین کچھ عرصے تک اس معاملے پر بحث کرتے رہے ہیں کہ آیا نبی کریمؐ خلیل اللہ ہیں یا جیسا کہ قرآن پاک میں کہا گیا ہے، حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ ہیں یا آپؐ صوفیوں کے دعوے کے مطابق حبیب اللہ ہیں؟ بعد میں آنے والے زمانے میں تمام متقی اور پرہیزگار مسلمانوں نے اس بات کو عموماً تسلیم کرلیا کہ رسول کریمؐ کا اصل مقام حبیب اللہ ہے اور جس طرح حضرت موسیٰؑ کو کلیم اللہ کے لقب سے پکارا جاتا ہے، اسی طرح خلیل اللہ کا لقب صرف حضرت ابراہیمؑ کے لیے مخصوص کردیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ حبیب اللہ کی حیثیت سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے رول سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے (جیسا کہ ابن عربیؒ اور ان کے پیروکاروں کا عقیدہ ہے) کہ اسلام پیار اور محبت کا دین ہے کیوں کہ کسی بھی دوسرے پیغمبر کے مقابلے میں ذات خداوندی کے ساتھ حضورؐ کا عشق سب سے کامل ہے۔

دینی کتابوں میں ایک پیغمبر کے محاسن کی مکمل تشریح کی گئی ہے چناں چہ متاخر قرون وسطیٰ میں مذہبی عقاید کے بارے میں بڑے پیمانے پر پڑھی جانے والی کتاب سنوسیہ میں کہا گیا ہے: ''ایک پیغمبر کو ان چار لازمی خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے: صادق، امین، مبلغ اور تیز فہم اور ذی شعور۔ ایک پیغمبر جھوٹ (کذب) نہیں بول سکتا، نہ ہی وہ خیانت کا مرتکب ہوسکتا ہے۔ ایک پیغمبر خدائی پیغام کو نہیں چھپاتا (کتمان)، نہ ہی وہ کند ذہن اور مخبوط الحواس ہوتا ہے۔ اس کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ حادثاتی طور پر انسانی کمزوریوں سے مغلوب ہوتا ہے۔ اسما کے اس نظریے کا کہ پیغمبر غلطیوں اور گناہوں سے محفوظ ہوتا ہے، درج بالا خصوصیات کے تناظر میں جائزہ لینا چاہیے۔ قاضی عیاضؒ نے رسولوں کا عمومی تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی حفاظت خدا کرتا ہے چناں چہ تمام پیغمبروں میں اکمل و افضل پیغمبر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حفاظت کی ذمے داری بھی اللہ تعالیٰ پر تھی اور حضورؐ کو اس کا مکمل ادراک تھا۔

اسلام کے ابتدائی برسوں میں حضورؐ کے معصوم عن الخطا ہونے کے بارے میں کوئی باضابطہ اور مستند نظریہ موجود نہیں تھا اور قرآن کریم کی قدیم تفسیروں میں اس سلسلے میں متضاد رجحانات پائے جاتے ہیں۔ بعض مفسروں نے رسول اللہؐ کو اخلاقی خامیوں سے پاک قرار دیا ہے لیکن اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا گیا کہ پیغمبر بلکہ آخری پیغمبر کہلانے سے پہلے آپؐ کی حیثیت اور رتبہ کیا تھا؟ قرآن مجید کی سورہ الضحیٰ کی ساتویں آیت میں اللہ تعالیٰ حضورؐ سے مخاطب ہوکر

فرماتا ہے: ''اور کیا اس نے تجھے راہ بھولا پا کر ہدایت نہیں دی؟'' یہ ایک پریشان کن بیان ہے اور بعض قدیم مفسر اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ ممکن ہے بچپن کے زمانے میں حضورؐ ایک خدا کی پرستش کرنے کی طرف رہنمائی حاصل ہونے سے پہلے اہل مکہ کے مذہب پر کاربند ہوں (نعوذ باللہ۔ مترجم)۔ پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہونے سے پہلے ''سینہ چاک ہونے'' کا قصہ اس ضمن میں خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ (اس سلسلے میں مزید تفصیلات اگلے باب میں بیان کی جائیں گی)۔

لیکن اس کے ساتھ ہی کئی مفسر پوری قوت کے ساتھ یہ ثابت کرنے کے لیے کوشاں رہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اہل مکہ کی بت پرستی کی مشرکانہ رسوم میں کبھی شریک نہیں ہوئے تھے بلکہ جب آپؐ ایک نوجوان لڑکے تھے، اس وقت آپؐ نے اپنے ہم جولیوں کے ساتھ کھیلوں میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا تھا اور یہ کہ حضورؐ کو اہل مکہ کے بتوں سے زیادہ کسی چیز سے نفرت نہیں تھی۔ ابونعیمؒ کی تصنیف دلائل میں ایسے کئی موقعوں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں نوجوان محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو گناہوں سے آلودہ مشاغل میں حصہ لینے سے محفوظ رکھا گیا بلکہ بچپن میں آپؐ میں ادنیٰ سے ادنیٰ خامی بھی موجود نہیں تھی۔ زمخشریؒ نے سورہ الضحیٰ کی تفسیر میں واضح طور پر بیان کیا ہے: ''اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) چالیس برس تک اپنے ہم نشینوں جیسی زندگی بسر کرتے رہے ہیں اور اپنے ساتھیوں کی طرح آپ بھی ان علوم سے ناآشنا تھے جو تعلیم کے ذریعے حاصل کیے جا سکتے ہیں تو یہ کہنا درست ہے لیکن اگر کوئی شخص یہ کہنے کی جسارت کرتا ہے کہ حضورؐ اپنے قبائلی ساتھیوں کے مذہب اور کفر و الحاد پر کاربند تھے تو ایسا کہنے والے سے خدا کی پناہ!''

اکثر دہرائی جانے والی یہ روایت بتدریج ذہنوں سے محو ہو گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ شیطان نے ایک مرتبہ رسول اللہؐ کو بہکا دیا تھا اور آپؐ پر زور دیا تھا کہ آپؐ اہل مکہ کی تین دیویوں لات، عزیٰ اور منات کو غرانیق (انسان اور خدا کے درمیان رابطے کا ذریعہ پرندے جن کی سفارش قبول کی جاتی ہے) کی حیثیت سے قبول کر لیں (لیکن اب کوئی شخص اس فرضی کہانی کو درست نہیں مانتا اور شیطانی آیات کے قصے کو من گھڑت قرار دے دیا گیا ہے۔ مترجم)۔ کئی احادیث میں رسول کریمؐ خدا سے اپنی توبہ، مغفرت اور بخشش کی دعا مانگتے نظر آتے ہیں جن کا تعلق آپؐ کے معصوم عن الخطا ہونے کے سوال سے ہے۔

رسول خداؐ جب نماز ادا کرنے کے لیے کھڑے ہوتے تو آپ کہا کرتے تھے: ''اے خدا! تو میرا رب ہے اور میں تیرا بندہ ہوں۔ میں نے غلطیاں کی ہیں اور میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں۔ پس تو میرے گناہ معاف کر دے کیوں کہ تیرے سوا گناہوں کو معاف کر دینے والا کوئی نہیں۔''

ایسی دعاؤں کی، جن سے انسانی کمزوریوں اور لغزشوں کے متعلق رسول کریمؐ کے جذبات اور احساسات کا ثبوت ملتا ہے، بعد میں یہ تعبیر کی گئی کہ حضورؐ نے یہ دعائیں اپنے امتیوں کی تعلیم کے لیے مانگی تھیں جو وہ گناہوں سے

تائب ہونے اور خدا کے حضور اظہار ندامت و پشیمانی کے لیے کرتے اور رسول اللہ کی مثال کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔
اسپین کے عرب عالم دین ابن حزمؒ نے گیارہویں صدی میں کہا تھا: ''اگر پیغمبروں کے لیے خدا کی نافرمانی ممکن ہوتی تو ہم سب کو بھی اس کی اجازت ہوتی کیوں کہ ہمیں پیغمبروں کا اتباع کرنے کا حکم دیا گیا ہے چناں چہ ایسا کرنے کی صورت میں ہم یہ نہیں جان سکتے تھے کہ آیا ہم غلط راہ اور شرک کے راستے پر چل رہے ہیں اور کیا حضورؐ نے جو کچھ کیا تھا، وہ خدا کی نافرمانی تھی؟'' ابن حزمؒ کے اس استدلال کو آج تک درست اور جائز سمجھا جاتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ نبی کریمؐ کی کامل اتباع صرف اسی صورت میں با مقصد اور معنی خیز ہو سکتی ہے جب ہمارا یہ عقیدہ ہو کہ آں حضرتؐ کی ذات اقدس ہر قسم کی خامیوں اور آلودگیوں سے پاک ہے تا کہ ہم زندگی کی جزئیات میں بھی آپؐ کو بے عیب اور معصوم نمونہ سمجھتے ہوئے آپؐ کی پیروی کریں۔
رسول کریمؐ کے تابناک روحانی محاسن کو اجاگر کرنے کے لیے بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ حضورؐ کا جسم اطہر آپؐ کی روشنی کی وجہ سے روشن و تاباں تھا، آپؐ تمام جسمانی اور مادی آلودگیوں سے پاک تھے اس لیے گناہ آپؐ کو داغ دار نہیں کر سکتا تھا۔ نبی کریمؐ کی ذات اقدس کے گناہوں سے پاک ہونے کے نظریے پر شیعہ خیالات بھی یقیناً اثر انداز ہوئے ہیں کیوں کہ شیعہ اسکالرز نہایت شرح و بسط کے ساتھ اماموں کے اسما کی وضاحت کرتے ہیں لہٰذا یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ان اماموں کے عظیم جد امجد حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، جو خدائی نور ہدایت کے علم بردار ہیں، لغزشوں اور گناہوں سے پاک نہ ہوں!
اس کے باوجود بعض مذہبی گروہوں کا یہ خیال تھا کہ ایک پیغمبر گناہ بلکہ سنگین نوعیت کے گناہوں کا مرتکب ہو سکتا ہے کیوں کہ کیا قرآن کریم میں بعض انبیا کے گناہوں یا لغزشوں کا تذکرہ نہیں کیا گیا؟ کئی مفسروں کی رائے ہے کہ ایک پیغمبر کم سے کم معمولی گناہوں کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ چناں چہ نامور مورخ اور مفسر قرآن الطبریؒ (وفات ۹۲۳ عیسوی) نے سورہ الفتح کی ابتدائی آیات کی اس انداز میں تشریح کی ہے:
''بے شک (اے نبیؐ) ہم نے آپ کو ایک کھلم کھلا فتح دی ہے تا کہ جو کچھ تیرے گناہ آگے ہوئے اور جو پیچھے سب کو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔'' اس آیہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ پر واضح کیا ہے کہ اس نے آپؐ کو جو فتح مبین دی ہے، اس پر آپؐ کو اپنے پروردگار کا شکر گزار ہونا چاہیے اور اس سے ان گناہوں کی معافی مانگنی چاہیے جو اس فتح سے پہلے اور بعد میں سرزد ہوئے ہیں...... ورنہ گناہوں کی معافی کے لیے کہنا، جس کا ذکر بعد کی سورتوں میں ہوا ہے، بے معنی ہے۔
طبریؒ کو یقین تھا کہ خدا کی مغفرت اور بخشش کے نتیجے میں حضورؐ کو اللہ تعالیٰ کا مزید قرب حاصل ہوگا۔ صوفیائے عظام کا بھی یہی نظریہ ہے البتہ ان کا خیال ہے کہ نہ صرف رسول کریمؐ بلکہ ہر مسلمان کا یہ روحانی فریضہ ہے کہ

وہ اللہ تعالیٰ سے احسان مندی اور شکر گزاری کا اظہار کرے۔

بعض مفسروں، خاص طور پر معتزلی مکتبہ فکر کے لوگوں کا خیال ہے کہ پیغمبر بے توجہی یا غفلت سے گناہ کا ارتکاب کر سکتا ہے لیکن ایک پیغمبر کی معمولی سی غفلت یا لاپروائی کسی بھی دوسرے انسان کے مقابلے میں بہت زیادہ وزن رکھتی ہے چناں چہ اس کی معمولی خطا اور لغزش پر اس پر سنگین الزام عاید ہو سکتا ہے لیکن بعد میں معتزلیوں نے یہ رائے قائم کر لی کہ پیغمبر غفلت یا بھول چوک کی بنا پر کبھی گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا، پیغمبر کسی حال میں بھی گناہ نہیں کر سکتا۔ ''سب سے زیادہ کار آمد'' کا اصول، جس کا اطلاق خدا اس زمین کی ہر چیز پر کرتا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا پیامبر ہر قسم کے اخلاقی عیب اور داغ دھبے سے مکمل طور پر پاک ہو۔

لیکن اس نکتے پر اشعری مکتبہ فکر کا نقطہ نظر بالکل مختلف ہے۔ ان کے سب سے بڑے عالم دین الباقلانیؒ کی رائے یہ ہے کہ پیغمبروں کے اسما کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت وہ انسانوں کو تبلیغ کرتے ہیں تو خدا انہیں دروغ گوئی سے محفوظ و مامون اور نفرت اور کاہلی کے جذبات سے پاک رکھتا ہے۔ باقلانیؒ کے مذہبی حریف قاضی عیاضؒ نے زیادہ صراحت کے ساتھ اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ باقلانیؒ کے نظریے کی تحسین کے لیے ہمیں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ اس کے مذہبی افکار میں قرآن کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ اس کی رائے یہ ہے کہ اصل اہمیت وحی الٰہی کی ہے اور وہی مسلمانوں کی زندگی کا مرکز و محور ہے۔ باقلانیؒ کا کہنا ہے کہ رسول کریمؐ نے بلاشبہ بعض ضابطے وضع کیے ہیں جن کی پیروی لازم ہے لیکن یہ صرف احادیث تھیں جو حضورؐ نے مذہبی مسئلوں کے حل کے سلسلے میں اتھارٹی کے طور پر بیان کی تھیں البتہ احادیث میں آپؐ کی زندگی اور طرز عمل کی جزئیات بیان نہیں کی گئیں۔ باقلانیؒ کا نظریہ بعض جدت پسند علما کے خیالات سے مماثلت رکھتا ہے (جیسے سرسید احمد خان اور ان کے رفقائے کار) جو یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو صرف مذہبی معاملوں میں رسول اللہؐ کی سنت کی پیروی کرنی چاہیے۔

اس کے باوجود مسلمانوں میں رسول کریمؐ کی کامل معصومیت کا نظریہ بدستور موجود رہا۔ چناں چہ قاضی عیاضؒ لکھتے ہیں: ''پس ہم اس رائے پر ثابت قدمی سے قائم رہتے ہیں جسے تمام اہل ایمان کی حمایت حاصل ہے اور جس پر سب متفق ہیں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معاملے میں یہ ممکن نہیں کہ آپؐ وحی کے ابلاغ کے سلسلے میں کسی فروگزاشت کے مرتکب ہو سکتے ہیں — خواہ یہ غلطی اپنی مرضی سے ہو یا غیر ارادی طور پر — خوشی کی حالت میں ہو یا غیظ و غضب کی کیفیت میں، تندرستی کے عالم میں ہو یا بیماری کی حالت میں۔ اور اگر حضورؐ نے کسی دنیاوی معاملے میں غلطی کی ہو، جیسا کہ کھجوروں کی کاشت کے مسئلے میں آپؐ سے غلطی سرزد ہوئی تو آپؐ نے اس غلطی کی فوراً اصلاح کر لی تھی۔

رسول کریمؐ کے معصوم ہونے کے نظریے کو فروغ دینے میں صوفیوں کا بہت اہم حصہ ہے۔ ''دل کے مغموم ہونے'' کا تذکرہ ایک مشہور حدیث میں ہوا ہے لیکن صوفیوں نے اس کی یہ تشریح کی ہے کہ آں حضرتؐ خدا کی جستجو میں

ہمیشہ محوِ سفر رہتے تھے اور اس سفر میں آپؐ کو روشنی کے نئے پردے ہٹا کر آگے کی طرف مراجعت کرنا پڑتی تھی۔ ان کا خیال ہے کہ ''دل پر غم کے بادل چھائے رہے'' سے مراد بدلتی ہوئی روحانی حالتیں ہیں اور رسول کریمؐ جوں جوں اپنے پروردگار کے قریب پہنچتے، منزلِ عشق کے اس مسافر (حضورؐ) کو یہ نورانی پردے ہٹانا پڑتے تھے۔ لیکن صوفیوں کو آں حضرتؐ کی ایک اور حدیث مل گئی ہے اور وہ اپنی روحانی تعلیم کے سلسلے میں سنتِ نبویؐ کی پیروی کرتے ہوئے آپؐ کو ہمیشہ ایک کامل نمونے کے طور پر سامنے رکھتے ہیں۔ جب حضورؐ سے ایک مرتبہ شیطان کے بارے میں سوال کیا گیا جو انسان کی ذہنی صلاحیتوں اور شہوانی رغبت کی اساس ہے تو نبی کریمؐ نے بحث کے آخر میں فرمایا: ''اسلما شیطانی''، یعنی میرے شیطان نے میری کامل اطاعت کر لی ہے (یا وہ مسلمان ہو گیا ہے) اور وہ صرف وہی کام کرتا ہے جنہیں کرنے کا میں اسے حکم دیتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کامل اپنی جبلتوں اور فطری شہوانی جذبات کو اس طریقے سے مطیع کر لیتا ہے کہ وہ آخر کار انہیں مثبت اور خدائی کاموں کے لیے بروئے کار لے آتا ہے اور اپنے قول و فعل کے ذریعے ہر لمحے خدا کی رضا کی اتباع کرتا ہے۔ صوفیوں کے نزدیک اس حالت کو ''جہادِ اکبر'' سے تعبیر کیا گیا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے ان منفی رجحانات اور شہوانی جذبات پر قابو پانے کے لیے جہدِ مسلسل میں مصروف رہتا ہے جنہیں ختم کر دینا انسانی مطمحِ نظر نہیں بلکہ انہیں زیر کر کے مثبت اقدار میں تبدیل کرنا چاہیے۔ شکست خوردہ شیطان کے بارے میں حضورؐ کی حدیثِ مبارکہ سے ایک نہایت اہم نفسیاتی صداقت کا عندیہ ملتا ہے چناں چہ نہ صرف صوفیوں بلکہ بعض جدت پسندوں کے لیے بھی یہ ایک قابلِ تقلید نمونہ ہے۔ محمد اقبالؒ نے انسان اور شیطانی قوتوں کے درمیان تعلقات کے ضمن میں اسے اپنے نظامِ فلسفہ میں مرکزی خیال کا درجہ دیا ہے۔ اس معاملے میں رسول کریمؐ فطری طور پر معصوم نظر نہیں آتے بلکہ خدا کا فضل و کرم شاملِ حال رہنے اور مسلسل روحانی ترقی کے بعد آپؐ نے یہ ارفع مقام حاصل کیا ہے۔

آں حضرتؐ نے ذاتِ خداوندی کا قرب حاصل کرنے کے لیے ان تھک جدوجہد کی اور مولانا رومیؒ اس جہدِ مسلسل کو دوسرے تمام لوگوں پر حضورؐ کی برتری کے ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ جب شمس تبریزؒ نے پوچھا کہ کیا بایزید بسطامیؒ، جنہوں نے ''سبحانی''، یعنی میں پاک ہوں، میری بڑی شان ہے، کہا تھا، حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) سے بڑے نہیں تھے جنہوں نے خدا کے سامنے یہ اعتراف کیا تھا کہ ''ہم تمہیں اس طرح نہیں جان سکے جس قدر ہمیں جاننا چاہیے تھا تو مولانا نے جواب دیا کہ بایزیدؒ ایک مقام پر رک گئے تھے جہاں انہوں نے اپنے آپ کو خدا کا مجسم سمجھ لیا لیکن رسول کریمؐ نے ''ہر روز نئی تجلیات دیکھیں اور آگے بڑھ گئے۔'' اس طرح حضورؐ نے ذاتِ خداوندی کا قرب حاصل کر لیا اور آپؐ کو اس بات کا کامل ادراک تھا کہ کسی اور میں خدا کی عظمت کو ناپنے کے لیے استعداد موجود نہیں۔

لیکن اگر کوئی شخص یہ سوال کرتا ہے کہ شیطان کس طرح رسول کریمؐ کے قریب آ سکتا ہے ـــــ کیوں کہ ایک حدیث شریف میں کہا گیا ہے کہ شیطان عمرؓ (ابن خطاب، دوسرے خلیفہ) کے سائے سے بھاگ جاتا ہے، مولانا رومیؒ اس کے جواب میں کہتے ہیں: ''حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) ایک سمندر ہیں اور عمرؓ ایک پیالہ۔ کوئی شخص کتے

کے لعاب سے سمندر کی حفاظت نہیں کرتا کیوں کہ بحر ذخار کتے کے منہ سے آلودہ نہیں ہوتا لیکن پیالہ اس سے ناپاک ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کتے کے چاٹنے سے چھوٹے سے برتن میں رکھی گئی چیز پلید ہو جاتی ہے لیکن اس ناپاک شے کے چھونے سے رسول کریمؐ کی سمندر جیسی شخصیت کی پاکیزگی پر ہرگز کوئی اثر نہیں پڑتا۔

حضورؐ سے پہلے مبعوث ہونے والے نبیوں اور رسولوں پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے باعث آپؐ کی حیثیت خاتم النبیین کی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمان فطری طور پر اس معاملے پر غور و خوض کرتے ہیں کہ سابق پیغمبروں کے ساتھ آپؐ کا کیا تعلق ہے؟ قرآن کریم نے مسلمانوں کو خبردار کیا ہے: ''اے مسلمانو! تم سب کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر بھی جو ہماری طرف اتاری گئی اور جو چیز ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب (علیہما السلام) اور ان کی اولاد پر اتاری گئی اور جو کچھ اللہ کی جانب سے موسیٰ اور عیسیٰ (علیہما السلام) اور دوسرے انبیا (علیہم السلام) دیے گئے۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ ہم اللہ کے فرماں بردار ہیں۔ سورہ البقرہ آیت ۱۳۶۔ آپؐ کہہ دیجیے کہ ہم اللہ تعالیٰ پر اور جو کچھ ہم پر اتارا گیا ہے اور جو کچھ ابراہیم (علیہ السلام) اور اسماعیل (علیہ السلام) اور یعقوب (علیہ السلام) اور ان کی اولاد پر اتارا گیا اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ (علیہما السلام) اور دوسرے انبیا (علیہم السلام) اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیے گئے، ان سب پر ایمان لائے، ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار ہیں۔ سورہ آل عمران آیت ۸۴۔ مترجم)۔ ایک اور حدیث مبارکہ میں ''تفضیل''، یعنی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خدا کے بھیجے ہوئے کسی اور نبی پر ترجیح اور فضیلت دینے کی ممانعت کی گئی ہے: ''مجھے یونس ابن متی سے افضل نہ سمجھو اور انبیا میں سے کسی کا موازنہ نہ کرو اور نہ ہی مجھے موسیٰؑ پر فوقیت دو۔'' لیکن اس کے ساتھ ہی کئی دوسری حدیثوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آں حضرتؐ اپنی امت کی شفاعت کرنے کی حیثیت (شافع) اور دوسرے پیغمبروں پر اپنی فضیلت سے پوری طرح آگاہ تھے:

میں خدا کا پیغمبر ہوں لیکن اس میں کوئی فخر نہیں۔ قیامت کے دن خدا کی حمد کا پرچم میرے ہاتھ میں ہوگا۔ میں شفاعت کرنے والا پہلا پیغمبر ہوں گا اور سب سے پہلے میری شفاعت قبول کی جائے گی۔ میں جنت کا دروازہ کھٹکھٹانے والا پہلا شخص ہوں گا۔ خدا میرے لیے جنت کا دروازہ کھولے گا اور مجھے اور میرے قریبی امتیوں کو جنت میں داخل کرے گا۔ پس اپنے سے پہلے آنے والے رہنماؤں اور بعد میں آنے والی (نسلوں) میں مجھے سب سے زیادہ اعزاز و اکرام بخشا جائے گا۔ (آندرے:

(The Path of God's Bondsmen, p.153 :نیز رضی Die Person Muhammads, p.246

نجم الدین رضی دیا نے اس حدیث کو مختلف انداز میں اس طرح پیش کیا ہے:

رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ''مجھے چھ چیزوں میں دوسرے پیغمبروں پر فضیلت دی گئی ہے۔ میرے لیے پوری روئے زمین کو مسجد بنا دیا گیا ہے اور اس کی مٹی کو پاک قرار دے دیا گیا ہے، مالِ غنیمت کو

میرے لیے حلال کر دیا گیا ہے، مجھے ایک ماہ کے سفر کے فاصلے سے رعب و جلال کے ذریعے فتح دی گئی ہے، مجھے شفاعت کرنے کی اجازت دی گئی ہے، مجھے پوری نوع انسانی کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہے اور مجھے خاتم النبیینؐ بنایا گیا ہے۔(Razi: The Path of Gods Bondsmen, p.155)۔

لیکن رضی نے اس دنیا میں رسول خداؐ کی سرگرمی کو زیادہ خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے: ''آدمؑ کے زمانے سے لے کر عیسیٰؑ کے عہد تک ہر پیغمبر نے مذہب کا آٹا گوندھ کر اپنے اپنے انداز میں روٹی پکائی لیکن یہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تھے جن کے پاس ''عشق کی آگ کا دہکتا ہوا تنور'' موجود تھا جس میں مسلسل ۲۳ برسوں تک ''مذہب کی روٹی'' پکائی گئی۔ پھر آپؐ نے اس روٹی کو عشق کے تنور سے باہر نکال کر اسے اپنی دکان کے دروازے پر لٹکا دیا اور یہ اعلان کر دیا: ''میں گوروں اور کالوں سب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔'' یہ وہ روٹی تھی جسے بھوکوں نے پیٹ بھر کر کھایا اور سیر ہو گئے اور یہ روٹی ان لوگوں کے لیے، جن کا حضورؐ کی امت سے تعلق ہے، مسرور کن چیز بن گئی۔ (Razi: The Path of Gods Bondsmen: p.168)۔ لیکن یہ تمام امتیازی خصوصیات اور خدائی نوازشات حضورؐ میں تکبر کا سبب نہ بنیں، آپؐ دنیا سے بے تعلق رہے اور ان تمام حیرت انگیز اوصاف کے باوجود آپؐ نے فرمایا: ''غربت اور افلاس میرا فخر ہے۔''

نویں صدی کے مورخ ابن سعدؒ نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سید المرسلین کے لقب سے پکارا ہے۔ یہ وہ لقب ہے جس کی جڑیں اسلام میں بہت دور تک پیوست ہیں۔ چودھویں صدی میں حنبلی عالم دین ابن قیم الجوزیؒ نے یہ اہم اصول وضع کیا کہ پیغمبر اسلام کا درجہ بلاشبہ موسیٰ علیہ السلام سے بہت بلند ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو وہ طور پر خدا کے ایک صفاتی جلوے کو دیکھ کر بے ہوش ہو گئے تھے لیکن معراج کی رات کو حضورؐ کسی خوف اور دہشت کے بغیر خدا سے ہم کلام ہوئے تھے۔(Bell: Love Theories in Later Hamblite Islam, p.176)۔ یہ موازنہ صدر اول کے صوفیوں کو بھی بہت پسند تھا۔ (ملاحظہ کیجیے نواں باب)۔

شاعروں نے رسول کریمؐ کی برتری ثابت کرنے کے لیے مسلسل غور و فکر اور وجدان و استغراق سے کام لیا ہے۔ لیکن ان میں ہندوستان کے مغل دربار کے شاعر عرفی (شیرازی۔ مترجم) تو اس سلسلے میں بہت آگے نکل گئے ہیں اور وہ فارسی میں اپنے مخصوص ایجاد کردہ انداز میں لکھی جانے والی مدحیہ شاعری میں مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے حضورؐ سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

ترجمہ: عیسیٰؑ کی حیثیت تو محض ایک مگس کی سی ہے جب کہ آپؐ کی گفتگو
تخلیق کی دکان میں مٹھائی کے مترادف ہے

عرفی نے ایک اور حوالے سے مکھیوں کا پھر ذکر کیا ہے یعنی سبعا مثانی کے حوالے سے (غالباً ان کی مرادسات

دہرائی جانے والی قرآنی آیات سے ہے) ''یقیناً ہم نے آپ کو سات آیتیں دے رکھی ہیں کہ دہرائی جاتی ہیں اور عظیم قرآن بھی دے رکھا ہے۔'' سورہ الحجر، آیت ۸۷۔ مترجم)۔عرفی نے سبعا مثانی کو ''رسول اللہؐ کے شہد کی مکھیاں'' کہا ہے۔لیکن عرفی سے کئی صدیاں پہلے ایران میں خاقانی پہلے ہی یہ تذکرہ کر چکا ہے کہ دو زندہ جاوید پیغمبر عیسیٰؑ اور ادریسؑ جب طٰہٰ (آں حضرتؐ) کی میز پر بچا کھچا کھانا دیکھیں گے تو وہ اس کھانے کو جنت میں واقع اپنے گھروں میں لے جانے کے لیے آسمان سے نیچے اتر آئیں گے۔خاقانی نے اپنے کلام میں حضرت عیسیٰؑ کے اس معجزے کا حوالہ دیا ہے جس کا ذکر کھانے کی دعوت کے بارے میں ان کے معجزے کے سلسلے میں قرآن پاک کی سورہ المائدہ میں کیا گیا ہے۔

رومیؒ نے ان ہی خیالات کو زیادہ شاعرانہ اور دل کش انداز میں اس طرح بیان کیا ہے:

ترجمہ: عیسیٰؑ حضرت موسیٰؑ کے ساتھی اور یونسؑ حضرت یوسفؑ کے ہم نشیں ہیں
لیکن احمدؐ تنہا بیٹھے ہوئے ہیں جس کا مطلب ہے: ''میں سب سے منفرد اور ممتاز ہوں''
عشق سے مراد مخفی معنی کا سمندر ہے جس میں ہر کوئی ایک مچھلی کی مانند رہتا ہے
احمدؐ اس سمندر میں موتی کی مانند ہیں، یہی بات میں تمہیں ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں

عراقی نے تیرہویں صدی میں حضورؐ کے تذکرے کو اس انداز سے متشکل کیا ہے کہ فارسی شاعری میں اس کا تتبع عام ہو گیا:

ترجمہ: آپؐ کے جسم اطہر کی ایک چٹکی کو
دمِ عیسیٰؑ میں رکھ دیا گیا
اور آپؐ کے چہرہ انور کی شمع کی تجلی سے
موسیٰؑ کی آگ روشن کی گئی

صوفیائے عظام کے اس نظریے کا پہلے ہی ذکر ہو چکا ہے کہ آں حضرتؐ سے پہلے مبعوث ہونے والے تمام پیغمبر محض نور محمدؐ کا جزوی پرتو تھے۔ابن عربیؒ اور مولانا جامیؒ کے افکار کے اثر سے تمام مسلمانوں میں یہ نظریہ اس قدر عام ہو گیا ہے کہ اس نظریے کے علم برداروں نے اپنے کلام میں دوسرے پیغمبروں کے مقابلے میں رسول کریمؐ کی عظمت اور برتری کے موضوع پر نعتیں اور قصیدے لکھے ہیں۔سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کے تخت کو اپنے ہاتھوں سے چھوا جب کہ حضورؐ کے پیروں نے خدائی تخت کی چوٹی کو چھوا۔جس طرح ہدہد حضرت سلیمانؑ کی خدمت کرتا، اسی طرح جبرئیلؑ حضورؐ کی خدمت پر مامور تھے۔

یہ اشارے کنائے مسلمانوں کی دعاؤں پر بھی اثر انداز ہوئے ہیں چناں چہ دریئیؒ رسول کریمؐ کے متعلق یوں رقم طراز ہے:

آدم علیہ السلام آپؐ کو جانتے تھے اور آپؐ کے وسیلے سے دعا کرتے تھے۔حضورؐ نے تمام پیغمبروں سے اپنی رسالت کا عہد و پیمان لیا تھا۔آپؐ نے آدمؑ سے عفت و پاکیزگی، نوحؑ سے گریہ وزاری اور ادریسؑ کی تعلیمات سے علم اخذ

کیا۔ آپؐ کے وجدانی مشاہدات میں یعقوبؑ کا غم اور حزن اور ایوبؑ کا صبر واستقلال شامل ہے۔ آپؐ کا سینہ داؤدؑ کی آہ و پکار کی آماجگاہ ہے۔ آپؐ سلیمانؑ کی دولت اور شان و شوکت سے بڑھ کر صاحب عظمت و جلال ہیں۔ ابراہیم خلیل اللہؑ آپؐ کی ذات میں سمٹے ہوئے ہیں۔ موسیٰؑ میں خدا سے ہم کلام ہونے کی جو خوبی موجود تھی، آپؐ اس سے متصف تھے۔ آپؐ کو خدا کے ساتھ بالمشافہ گفتگو کرنے کا اعزاز حاصل ہے غرض آپؐ بڑے بڑے بادشاہوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بلند مرتبت ہیں۔ پیغمبروں کے درمیان آپ کا مرتبہ ایسا ہے جیسے چاند کے مقابلے میں سورج، قطرے کے مقابلے میں سمندر!

حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام پر حضورؐ کی برتری اور فوقیت کا بہت زیادہ ذکر کیا گیا ہے۔ (Padwick: Muslim Devotions, p.170)

چوں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں ان دو عظیم پیغمبروں موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی خوبیاں بیک وقت موجود ہیں جن کے پیروکار اب بھی دنیا میں سرگرم عمل ہیں لیکن حضورؐ موسیٰؑ کی طرح نہ تو صرف خدا کے انصاف اور قانون پر تکیہ کرتے ہیں اور نہ ہی عیسیٰؑ کی طرح محض خدا کی شفقت ورافت پر ہمہ تن متوجہ ہوتے اور دنیاوی معاملوں میں عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی کرتے ہیں، حضورؐ کا راستہ دونوں انتہاؤں کے درمیان بیچ کی راہ ہے جو سابق پیغمبروں کی مسلمہ تعلیمات کو باہم مربوط اور یک جا کرتی ہے۔ ہندوستان کے امیر مینائی نے رسول کریمؐ پر ان لفظوں میں درود وسلام بھیجا ہے:

رہبرِ موسیٰؑ، ہادیٔ عیسیٰؑ، تارک دنیا، مالک عقبیٰ
ہاتھ کا تکیہ، خاک کا بستر، صلی اللہ علیہ وسلم

امیر مینائی ہی کے ہم وطن اسماعیل میرٹھی نے اسی زمانے میں یہ شعر کہے:

خلیل حق کی تھی جو اشارت   اور ابن مریم کی جو بشارت
ظہور احمدؐ سے تھی عبارت   سمجھ گئے صاحبِ بصارت

لیکن عام مسلمان ان دقیق علمی اور قانونی موشگافیوں میں نہیں الجھتے، نہ ہی حقیقت محمدیہ کے بارے میں استغراق کرتے ہیں۔ وہ صوفیوں کے تتبع میں ''اولیں اور سب سے برتر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)'' پر زیادہ غور وفکر نہیں کرتے اور نہ ہی سابق پیغمبروں پر آں حضرتؐ کی فضیلت کے متعلق سوال جواب کرتے ہیں۔ بہ ہر حال عام مسلمانوں کا یہ پختہ عقیدہ ہے، جس کا اظہار ان کی بار بار دہرائی جانے والی تحریروں میں کیا جاتا ہے کہ اسلام سے پہلے کی تمام مقدس کتابوں میں کئی ایسے اقتباس موجود ہیں جن میں نبی کریمؐ کے ظہور کی واضح پیش گوئی کی گئی ہے۔

رسول اللہؐ کی بلند مرتبت اور بے مثل حیثیت کا تقاضا یہ ہے کہ آپؐ کو بلاشبہ ہر قسم کی بدگوئی، گستاخی، زبان درازی اور توہین سے محفوظ ہونا چاہیے۔ چناں چہ فقہا نے حضورؐ کی عزت وتوقیر نہ کرنے سے متعلق مسئلوں پر نہایت تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، خاص طور پر مغربی اسلامی ملکوں کے علمائے دین آں حضرتؐ کی تعظیم وتکریم اور احترام کے مسئلے پر

نہایت مضبوط رائے پر قائم ہیں۔ (Andrae: Die Person Muhammads, pp.266-68)۔ قاضی عیاضؒ جیسے مذہبی مصنفوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ رسول خداؐ کا دنیاوی بادشاہوں اور حکمرانوں سے موازنہ کرنا حد درجہ بدذوقی اور عقیدت واحترام کے فقدان کی علامت ہے۔ مثال کے طور پر بدنام شاعر ابونواس نے عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے بیٹے کی مدح میں لکھے گئے ایک قصیدے میں ''پیغمبر احمدؐ'' اور ''احمد امین'' کو یکساں مرتبہ دیا تھا۔

لیکن فارسی شاعروں نے اس انتباہ پر کبھی توجہ نہیں دی کیوں کہ فارسی کی ادبی روایات میں رسول کریمؐ کے بارے میں اکثر بالواسطہ اشارے کنائے استعمال کرنے کی جسارت کی گئی ہے اور شاعروں نے محمد نامی شخص کی مدح سرائی کے سلسلے میں مبالغہ آرائی نہیں کی تاہم ''راسخ العقیدہ'' اسلام نے حضور علیہ السلام کے اسم گرامی کو بے قرینہ اور عجیب و غریب انداز میں (حالاں کہ آپ کا اسم گرامی بہ ہر طور تقدس آمیز اور اس میں رحمتیں اور برکتیں ہیں) استعمال کرنے کو ایک خطرناک رجحان قرار دیا ہے جس کے نتیجے میں رسول کریمؐ کی (نعوذ باللہ۔ مترجم) توہین ہو سکتی ہے۔ عراق کے ابوحنیفہؒ (وفات ۷۶۷ عیسوی) جیسے اسلام کے ابتدائی فقیہوں نے اس جرم کو ارتداد کے زمرے میں شامل کیا ہے کیوں کہ ایک ایسے شخص پر، جس کے نام کا کلمہ شہادت کے دوسرے حصے میں خدا کے نام کے ساتھ ذکر ہوا ہو، کس طرح دشنام طرازی کی جا سکتی ہے؟ اگر کوئی شخص اس گناہ کا مرتکب ہو تو اسے اسلام کی طرف دوبارہ لوٹ آنے کے لیے کہا جانا چاہیے اور اگر وہ ایسا کرنے سے انکار کرے تو اسے موت کی سزا دینی چاہیے۔ دوسرے فقہا اس معاملے میں اس سے بھی آگے نکل گئے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ توہین رسالت کے مرتکب شخص کو فوری طور پر پھانسی کی سزا دے دینی چاہیے اور اگر وہ توبہ کرے تو بھی اسے یہ سزا ضرور ملنی چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمان مورخ اکثر و بیشتر ایسے واقعات نقل کرتے ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ توہین رسالت کا ارتکاب کرنے والوں کو یا تو قانونی طور پر پھانسی دے دی گئی یا مشتعل ہجوم ایسے مجرم کو سنگسار کر دیتے۔ (اس قسم کا ایک واقعہ، جسے ابن الیاسؒ نے بیان کیا ہے، سولہویں صدی کے مصر میں ۲۶ رمضان ۹۱۸ ہجری یعنی نومبر ۱۵۱۲ عیسوی میں پیش آیا)۔ حیرت انگیز واقعہ یہ ہے کہ اسلامی تاریخ کے ایک بڑے عالم دین اور قرون وسطیٰ کے اصلاح پسند ابن تیمیہ کو اس لیے سخت سزا سنادی گئی تھی کیوں کہ انہوں نے دمشق میں حضورؐ کے نقش قدم سے عوام کی مقبول عام روایت کے سلسلے میں بعض غیر صحت مند مبالغہ آرائیوں کے خلاف گفتگو کی تھی۔

یہ مسئلہ ان اہل کتاب ذمیوں کے لیے زیادہ پیچیدہ ہے جو کسی مخصوص معاہدے کے تحت بعض ٹیکس ادا کر کے مسلمانوں کے زیر حفاظت رہتے ہیں۔ ان میں یہودی، عیسائی، صابی، زرتشتی اور ہندوستان کے ہندو شامل ہیں۔ ایک عیسائی یقیناً یہ کہہ سکتا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اس کے مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے لیکن جیسے ہی وہ حضورؐ کی شان میں کوئی توہین آمیز بات کہتا ہے، بعض فقہا کے مطابق اس ذمی کی حفاظت کا معاہدہ منسوخ ہو جاتا ہے اور وہ صرف اسلام قبول کر کے اپنی جان بچا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں قرون وسطیٰ کا اسپین خاص طور پر قابل ذکر ہے

جہاں بعض عیسائی جان بوجھ کر رسول اللہؐ کی توہین کے مرتکب ہوئے۔ چناں چہ انہیں ان کے مذہب کی خاطر ''شہادت'' دے دی گئی جس کی وہ شدت سے تمنا کر رہے تھے۔

آں حضرتؐ نے اپنی توہین اور بدگوئی کرنے والوں کے ضمن میں جو ردعمل ظاہر کیے، ان میں تضادات پائے جاتے ہیں۔ بیشتر احادیث کے مطابق رسول کریمؐ نے ایسے معاملوں میں فیاضی اور نرم دلی کا مظاہرہ کیا لیکن کئی دوسری روایات میں کہا گیا ہے کہ اس معاملے میں سخت گیری پر مبنی ردعمل ظاہر کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ابن تیمیہ کی مثال پیش کی جاسکتی ہے جن پر خود ایک زمانے میں حضورؐ کی توقیر کے فقدان کا الزام لگایا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے بھی اس نمایاں نام سے یہ کتاب مرتب کی: الصارم المسلول علی شاتم الرسول (شاتم رسول کے خلاف سونتی گئی تلوار)۔ اس کتاب میں ابن تیمیہ نے لکھا ہے: ''جو شخص کسی پیغمبر کے خلاف دشنام طرازی کرتا ہے، اسے قتل کر دینا چاہیے اور جو کوئی اس پیغمبر کے ساتھیوں کو برا بھلا کہے، اسے کوڑے لگانے چاہییں۔'' اس جملے کا دوسرا حصہ شیعوں کے خلاف ہے جو پہلے تین خلفاؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ پر لعنت بھیجتے ہیں۔ ابن تیمیہ کے بعد مصری اسکالر تقی الدین السبکی نے (اسی نام سے) ایک اور کتاب لکھی۔

توہین رسالت کا مسئلہ اب بھی مسلمانوں کے لیے اشتعال کا باعث ہے جس سے وہ سخت ناراض ہو جاتے ہیں۔ اس کا اندازہ ہندوستان میں ۱۹۲۰ء کے عشرے میں رونما ہونے والے ایک واقعے سے لگایا جا سکتا ہے۔ ایک ہندو نے اس پریشان کن عنوان رنگیلا رسول کے تحت ایک کتاب شائع کر دی جس کے تھوڑی دیر بعد دو نوجوان مسلمانوں نے، جو اپنے محبوب پیغمبرؐ کے خلاف بدگوئی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اس ہندو کو قتل کر دیا۔ (W.C. Smith: Modern Islam in India, p.69: Ikrammullah: From Purdah to Parliament, p.46)

گو کہ ان مسلمانوں پر قتل کا الزام ثابت ہو گیا اور انہیں پھانسی دے دی گئی لیکن ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت کی ہمدردیاں ان نوجوانوں کے ساتھ تھیں۔ چند برس بعد ۱۹۳۵ء میں محمد اقبالؒ نے کسی دوسرے مسئلے میں توہین رسالت کے مرتکب شخص کی سزا کے بارے میں استفسار کیا تو انہیں بتایا گیا کہ ایسے شخص کو سزائے موت ملنی چاہیے۔ (اقبال نامہ ۱۸۹:۱ نیز شمل کی کتاب: Gabriel's Wing, p.170)۔ اور ۱۹۵۰ء کے عشرے میں جب ترکی میں اسلام کے احیا کی تحریک چلی تو ترکی کے اخبارات نے اس پر توسیعی مباحث شائع کیے۔ ہر شخص، جو مسلم ماحول میں لیکچر دیتا ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ رسول کریمؐ کے بارے میں کسی بھی بات پر، خواہ وہ کلی طور پر معصومیت سے ہی کیوں نہ کہی گئی ہو، سامعین اس کی غلط توضیح کر سکتے ہیں کیوں کہ جب ان کے محبوب پیغمبرؐ کا ذکر ہو تو وہ حد درجہ حساس ہوتے ہیں۔

معجزے اور افسانوی داستانیں

ایک حدیث مبارکہ کے مطابق حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ دعویٰ کرنے سے خود انکار کر دیا کہ آپؐ نے اپنے پیغام کی صداقت کی توثیق کے لیے قرآن کریم کے سوا کوئی اور معجزہ دکھایا ہے یا مستقبل میں کوئی معجزہ دکھائیں گے جو آپؐ کے پروردگار نے آپ کو عطا کیا ہے چناں چہ نجم الدین رضی دیا نے بالکل صحیح کہا ہے کہ ''ہر نبی کا معجزہ اس کے زمانے تک محدود ہوتا ہے لیکن رسول کریمؐ کے دین کی خصوصی صفت قرآن کا معجزہ ہے جس کی وجہ سے آپؐ ہمیشہ قائم و دائم رہیں گے اور رہتی دنیا تک آپؐ کا نام زندہ رہے گا۔'' (Razi: The Path of God's Bondsmen, p.160)۔ خود قرآن مجید میں بھی نہ صرف آپؐ کے اعلیٰ خصائص اور اعمال بلکہ آپؐ کی حیات مقدسہ میں پیش آنے والے پراسرار واقعات کا تذکرہ ملتا ہے جس سے انسانوں کے درمیان حضورؐ کے خصوصی مقام اور حیثیت کا پتا چلتا ہے۔ قرآن حکیم کے مفسروں، مبلغوں، قصہ گووں اور تمام صوفیوں اور شاعروں کو قرآن کریم سے خاصا مواد مل گیا ہے جس کی مدد سے انہوں نے ایسے معجزات اور افسانوی داستانیں وضع کر لیں جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آں حضرتؐ کے تقریباً تمام سوانح نگاروں کے لیے ضروری اجزا اور مسالے کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔

نبی کریمؐ کے خرق عادت واقعات کو معجزے کہا جاتا ہے جنہیں دنیا کا کوئی دوسرا شخص انجام نہیں دے سکتا۔ یہ معجزات اولیائے کرام کی کرامتوں سے بالکل مختلف ہیں۔ بعد میں آنے والے زمانے، خاص طور پر غیر عرب ماحول میں رسول اللہؐ، صحابہ کرامؓ، اہل بیتؓ اور عظیم صوفیوں کے خرق عادت واقعات کو مناقب کے نام سے موسوم کر دیا گیا۔

ظہور اسلام کے بعد کی صدیوں، خصوصاً مسلم جدت پسندوں نے پیغمبرانہ معجزوں پر بھروسا کرنے کے خطرے کو محسوس کر لیا چناں چہ انہوں نے رسالت مآبؐ کی حیات طیبہ کو افسانوں اور داستانوں سے الگ کرنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ (سرسید احمد خان نے مقالات میں اس ضمن میں اس عنوان سے مضمون باندھا ہے: کیا معجزہ دلیل نبوت ہے؟)۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زندگی کے ابتدائی کیریئر میں شق صدر کے واقعے کو سیرت کی تمام کتابوں میں مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ قرآن کریم کی سورہ النشرح کے شروع میں اللہ تعالیٰ حضورؐ سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

''اور کیا ہم نے تیرا سینہ نہیں کھول دیا؟'' اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ کا سینہ چاک کرنے کا مطلب آپؐ کے سینے کو خاص طور پر صاف کر کے آپ کو بے مثل طہارت اور پاکیزگی کے مقام پر فائز کرنا تھا تا کہ آپؐ کسی خامی اور نقص کے بغیر انسانوں کو خدا کا پیغام پہنچا سکیں۔ ایک ابتدائی حدیث میں رسول کریمؐ کے حوالے سے اس واقعے کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے:

جب میں اپنے دوستوں کے ساتھ تھا تو میرے پاس تین آدمی آئے۔ ان میں سے ایک شخص کے ایک ہاتھ میں چاندی کی طشتری جب کہ اس کے دوسرے ہاتھ میں برف سے بھرا سبز زمرد کا برتن تھا۔ یہ لوگ مجھے پہاڑ کی چوٹی پر لے گئے اور نہایت نرمی اور آہستگی کے ساتھ مجھے پہاڑ پر بٹھا دیا۔ پھر ان میں سے پہلے شخص نے اس حال میں میرے سینے کو بطن تک چاک کر دیا کہ میں اسے دیکھ رہا تھا لیکن مجھے کچھ پتا نہ چلا اور مجھے درد بھی محسوس نہ ہوا۔ اس کے بعد اس نے میرے پیٹ کے خالی حصے میں اپنا ہاتھ ڈال دیا، انتڑیاں نکالیں اور برف سے دھو کر نہایت احتیاط کے ساتھ انہیں صاف کر دیا۔ پھر اس شخص نے انہیں واپس ان کی جگہ پر رکھ دیا۔ اب دوسرا شخص اٹھا اور پہلے سے کہنے لگا: ''واپس چلے جاؤ، تم نے وہ کام کر دیا ہے جسے کرنے کا حکم خدا نے دیا تھا۔'' بعد میں وہ میرے قریب آیا، اس نے اپنا ہاتھ میرے جسم کی خالی جگہ میں ڈالا، میرا دل جسم سے باہر نکال لیا، اسے چاک کیا، اس میں سے خون سے بھرا ایک سیاہ لوتھڑا نکال کر اسے دور پھینک دیا اور کہا: ''اے خدا کے محبوبؐ! یہ آپؐ کے جسم میں شیطان کا حصہ تھا۔'' پھر اس نے دل کو اس چیز سے بھر دیا جو اس کے پاس تھی۔ اس کے بعد اس نے دل کو واپس اس کی جگہ پر رکھ دیا اور اس پر نور کی ایک مہر ثبت کر دی۔ میں اس مہر کی ٹھنڈک اپنے جسم کی رگوں اور جوڑوں میں اب بھی محسوس کرتا ہوں۔ پھر ان میں سے تیسرا شخص میرے قریب آ گیا۔ اس فرشتے نے کہا: ''اس کو دس امتیوں کے ساتھ ترازو میں تولو۔'' انہوں نے میرا وزن کیا تو میں ان سب سے بھاری تھا۔ پھر اس نے کہا: ''اسے چھوڑ دو کیوں کہ اگر ہم نے پوری امت کے مقابلے میں اسے تولا تو بھی اس کا وزن زیادہ ہو گا۔'' پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور پہاڑ سے نیچے اترنے میں بڑی احتیاط سے میری مدد کی۔ بعد میں یہ لوگ مجھ پر جھک گئے۔ ان میں سے ایک نے میرے سر اور پیشانی کو چوما اور کہنے لگا: ''اے خدا کے محبوبؐ! آپؐ کبھی خوف زدہ نہیں ہوں گے اور اگر آپ کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا نے آپؐ کے لیے کیا کچھ تیار کر رکھا ہے تو آپؐ بہت خوش ہوتے!'' پھر انہوں نے مجھے اپنی جگہ پر بٹھا دیا اور وہ پرواز کر کے آسمانوں میں داخل ہو گئے۔ میں انہیں دیکھتا رہا

اور اگر تم چاہو تو میں تمہیں وہ جگہ دکھا سکتا ہوں جہاں وہ گئے ہیں۔ (ابو بکر البیہقی: دلائل النبوت ۱:۱۲)۔

ان ماخذوں کے مطابق حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ قصہ اپنی دایہ حلیمہ کو سنایا جو آپؐ کے اچانک غائب ہونے پر پریشان ہو گئی تھیں۔ یہ واقعہ اس مخصوص ابتدائی رسم کی عکاسی کرتا ہے جس میں نوجوان لڑکے کو استقبال وحی کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ کے سیرت نگاروں کا یہ کہنا ہے کہ شق صدر کا واقعہ آپؐ کے بچپن میں نہیں، سفر معراج سے پہلے رونما ہوا تھا۔

ایک اور روایت کے مطابق آں حضرتؐ نے اس واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے:

وہ لوگ اس وقت میرے پاس آئے جب میں اپنے اہل خاندان کے ساتھ تھا۔ مجھے چاہ آب زمزم پر لایا گیا جہاں میرا سینہ چاک کر کے اسے زمزم سے دھویا گیا۔ پھر سونے کا ایک طشت میرے پاس لایا گیا جو ایمان و یقین اور حکمت و دانائی سے بھرا ہوا تھا۔ میرا سینہ ان چیزوں سے بھر دیا گیا، پھر یہ فرشتہ آسمانوں کی طرف محو پرواز ہو گیا۔

اس کے بعد اسریٰ اور معراج کا واقعہ رونما ہوا جس کے دوران حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تمام پیغمبروں سے ملاقات ہوئی۔ (دیکھیے نواں باب)۔ یہاں پیغمبرانہ فرائض اور مشن کے لیے حضورؐ کی ابتدائی تیاری کا پھر عندیہ دیا گیا ہے۔

شق صدر کا واقعہ روحانی دنیا کی طرف رسول کریمؐ کی مراجعت سے متعلق ہے جس کے بعد آپؐ نے ایک اور معجزہ دکھایا اور آنے والی نسلوں نے اس پسندیدہ معجزے کو حضورؐ کی صداقت کا ثبوت قرار دیا ہے۔ یہ معجزہ چاند کو دو ٹکڑے کرنے (شق القمر) کا ہے جو قرآن کریم کی سورہ القمر کی پہلی آیہ مبارکہ میں اس طرح بیان ہوا ہے: ''قیامت قریب آ گئی اور چاند پھٹ گیا۔'' ابتدائی مفسرین اس آیہ کریمہ کو قرب قیامت کی نشانی قرار نہیں دیتے بلکہ ان کا کہنا ہے کہ آں حضرتؐ نے شق القمر کا معجزہ شک و شبہے میں مبتلا قریش کو اپنی رسالت کی صداقت ثابت کرنے کے لیے دکھایا تھا۔ آپؐ نے چاند کے دو ٹکڑے کر دیے جن کے درمیان کوہ حرا کو دیکھا جا سکتا تھا۔ اس معجزے پر یقین نہ کرنے والوں کو قائل کرنے کے لیے قاضی عیاضؒ اس طرح زور دیتے ہیں:

اس رات زمین پر بسنے والی تمام قوموں کے لوگوں نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھا۔ گو کہ مختلف مقامات سے یہ اطلاع موصول ہوئی اور یہ ممکن نہیں ہے کہ تمام لوگ ایک جھوٹے واقعے پر متفق ہوں، اس کے باوجود ہم اس واقعے کو شق قمر کے ثبوت کے طور پر پیش نہیں کر سکتے کیوں کہ کئی لوگوں نے اس طرح نہیں دیکھا...... چاند گرہن ایک ملک میں دکھائی دے سکتا ہے، دوسرے ملک میں نہیں! ایک ملک میں مکمل چاند گرہن ہوتا ہے اور دوسرے ملک میں صرف جزوی! (Andrae: Die Person Muhammads, p.107 نیز قاضی عیاض: شفا: ۱:۲۳۹)۔

اندلس کے شہر سبتہ میں رہنے والے قاضی عیاضؒ اصل میں ہندوستانی روایت کو نہیں جانتے تھے۔ اگر انہیں یہ معلوم ہو جاتا تو وہ بہت خوش ہو جاتے کہ دنیا کے اس حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ جنوبی ہندوستان کے ایک بادشاہ شکراوتی فرمد نے واقعی چاند کو دو ٹکڑے ہوتے دیکھا تھا اور جب اس رات مکہ میں رونما ہونے والے اس واقعے کی قابل اعتماد گواہوں نے تصدیق کر دی تو اس بادشاہ نے اسلام قبول کر لیا۔ چناں چہ برصغیر ہند میں مسلمانوں کی جو پہلی بستیاں آباد ہوئیں، وہ اسی معجزے کی مرہون منت ہیں۔ جنوبی ہندوستان میں یہ قصہ بہت مشہور ہوا جس کے بعد متاخر زمانے میں عربی کی ایک کتاب میں اس واقعے کا حوالہ دیا گیا ہے۔(Freedman: Qisat Shakarwati Farmad) نیز جنوبی افریقا کے ایڈیٹروں نے اس ہندوستانی بادشاہ کے قصے کو دہراتے ہوئے مزید کہا ہے کہ نیل آرمسٹرانگ نے چاند پر ۲۴۰ کلومیٹر چوڑی سیدھی لکیر دیکھی تھی جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ چاند کے واقعی دو ٹکڑے ہوئے تھے)۔ یہ بات دل چسپی سے نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ انیسویں صدی کے وسط میں کوٹاہ کے راجپوت (ہندو) دربار میں ایک منقش تصویر سے چاند کے دو ٹکڑے ہونے کی تمام تفصیلات ظاہر ہوتی ہیں۔

چوں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کو شعری زبان میں سورج یا طلوع آفتاب سے تشبیہ دی گئی ہے، اس لیے شاعروں کے لیے یہ کہنا ایک فطری بات تھی کہ ''سورج کو چاند کے دو ٹکڑے کر دینے چاہییں''۔ سنائی (غزنوی۔مترجم) نے بارہویں صدی کے شروع میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ عوامی شاعری میں بھی، خواہ وہ سندھی ہو، پنجابی، سواحلی یا دوسری زبانیں، نبی کریمؐ کے اس معجزے اور اس کی جزئیات کو نہایت دل کش پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن عقلیت پسند مفکروں کو چاند کے دو ٹکڑے ہونے کے معجزے کی صراحت کرنے میں دشواری پیش آئی چناں چہ انہوں نے اس واقعے اور دوسرے متعلقہ مظاہر فطرت کو افسانہ طرازی سے الگ کرنے کی کوشش کی۔ ہندوستان کے اصلاح پسند عالم دین شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اٹھارویں صدی کے وسط میں لکھا کہ چاند کے ٹکڑے ہونے کا واقعہ ممکن ہے فریب نظر ہو، کسی ستارے کے ناگہانی ٹوٹنے سے پیدا ہونے والے دھوئیں کی بدولت ایسا دکھائی دیا ہو، بادل کے باعث یوں نظر آیا ہو، سورج یا چاند گرہن کی وجہ سے اس قسم کا تاثر پیدا ہوا ہو کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے ہیں۔(Baljon: A Mystical Interpretation of Prophetic Tales, p.60)۔ اس کے باوجود شاہ ولی اللہ نے عربی شاعری میں حضورؐ کی شان میں کئی نعتیں لکھیں اور دوسرے سیکڑوں باکمال مصنفوں کے ساتھ مل کر شق القمر کے معجزے کا بڑی محبت سے ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ معجزہ آں حضرتؐ کی عظمت کا آئینہ دار ہے۔ رومیؔ نے ایک غنائیہ نظم میں کہا ہے:

ترجمہ: اہل ایمان جانتے ہیں کہ جو شخص حضورؐ کے ساتھ کامل عقیدت رکھتا ہے

وہ مصطفیٰؐ کی انگلی سے چاند کے دوٹکڑے کرسکتا ہے

بے چارے چاند کے لیے نبی کریمؐ کی انگلی کے اشارے سے دوٹکڑے ہونا کامل مسرت کا باعث ہے۔ مولانا جامیؒ نے، جنہیں عربی الفاظ کے اشکال اور ان کی عددی قیمت میں گہری دل چسپی ہے، رومیؔ کے اس حد درجہ پیچیدہ نظریے کی تشریح کی ہے۔ جامیؒ کا کہنا ہے کہ مکمل چاند کی شکل م سے مشابہ اور اس کی عددی قیمت چالیس ہے۔ جب رسول اللہؐ نے اس کے دوٹکڑے کردیے تو اس کی شکل دو ہلال ن ن جیسی ہوگئی جن میں سے ہر ایک لفظ کی عددی قیمت پچاس ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس معجزے کی بدولت چاند کی قیمت بڑھ گئی ہے:

ترجمہ: جو انجم شناس اس معجزے پر یقین رکھتے ہیں

انہیں اپنے پیشے اور سورج اور چاند کی ہنسی اڑانی چاہیے

کیوں کہ جس کسی نے امی احمدؐ کے مکتب میں تعلیم پائی ہے

وہ علم اور فن دونوں کا مضحکہ اڑا سکتا ہے

مولانا رومیؔ نے اس شعر میں حضورؐ کے دو معجزانہ پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔ ان میں سے پہلے معجزے کا تعلق چاند کے دوٹکڑے کرنے سے ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فطرت تک انسان کی سائنسی رسائی کی تمام کوششیں لاحاصل ہیں نیز یہ کہ آں حضرتؐ امی یعنی ''ناخواندہ'' تھے جیسا کہ قرآن کریم کی سورہ الاعراف کی آیات ۱۵۷، ۱۵۸ میں کہا گیا ہے (جو لوگ ایسے رسول نبی امی کا اتباع کرتے ہیں جن کو وہ لوگ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ ان کو نیک باتوں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں اور پاکیزہ چیزوں کو حلال بتاتے ہیں اور گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں اور ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے، ان کو دور کرتے ہیں۔ سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور اس نور کا اتباع کرتے ہیں جو ان کے ساتھ بھیجا گیا ہے، ایسے لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں۔ آپؐ کہہ دیجیے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے سو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور اس کے نبی امی پر جو کہ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے احکام پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کا اتباع کرو تا کہ تم راہ پر آ جاؤ۔ مترجم)۔ سورہ البقرہ کی ۷۸ ویں، سورہ آل عمران کی ۷۴ ویں اور سورہ الجمعہ کی دوسری آیت میں بھی یہ لفظ دہرایا گیا ہے اور یہاں بظاہر اس کا مطلب امہ یا ''عرب جماعت'' ہے جن میں عیسائیوں اور یہودیوں کے برعکس آں حضرتؐ کے ظہور سے پہلے کوئی پیغمبر مبعوث نہیں ہوا تھا۔ اس اعتبار سے ''امی'' سے مراد بائبل کے بت پرست مشرکوں کے نظریے کے مصداق ہے لیکن اسلام کی روایت، خاص طور پر اس کے

صوفیانہ حلقوں میں اس لفظ کا مطلب ہے ''جو لکھ پڑھ نہ سکے یعنی ناخواندہ۔'' (جرمن زبان میں امی نبی کا ترجمہ heidnischer prophet یا ''ملحد و مشرک نبی'' کیا گیا ہے جو نہایت لغو اور بے ہودہ ہے اور اس سے غلط معنی اخذ ہوتے ہیں)۔

یورپی اسکالرز اس مسئلے پر دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں کہ آیا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لکھ یا پڑھ سکتے تھے؟ (گو کہ حضورؐ کی دو ازواج مطہراتؓ پڑھی لکھی تھیں)۔ مسلمان علمائے کرام خاص طور پر صوفیہ حضرات نے آں حضرتؐ کے ''امی'' یا ''ناخواندہ'' ہونے کے نظریے کو آپؐ کے پیغام کی صداقت اور اس کے حقیقی وجدان اور روحانی فیضان کا شاندار ثبوت قرار دیا ہے کیوں کہ حضورؐ کو، جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، قرآن میں بیان کیے گئے ماضی اور مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کا کس طرح علم ہو سکتا تھا؟ کیا ایک امی کی یہ خوبی اس بات کی ضمانت نہیں کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا سچا اور خالص کلام ہے جو کسی آمیزش سے آلودہ نہیں؟ سرزمین عرب کے ایک یتیم کو یہ تمام سائنسی اور تاریخی معلومات کس طرح حاصل ہو گئیں جو ایک مسلمان کو قرآن مجید کے ہر صفحے میں ملتی ہیں؟ صوفیوں نے لفظ امی کی اس طرح تشریح کی ہے کہ اس سے خدا کے ساتھ حضورؐ کی انتہائی قربت کا پتا چلتا ہے۔ آپؐ نہ صرف ساقی ہیں جنھوں نے دنیا کو خدا کی حکمت اور رہنمائی کی شراب پلائی بلکہ جیسا کہ رومیؒ نے کہا ہے، آپؐ کی حیثیت اس برتن کی سی ہے جس کے ذریعے بنی نوع انسان کو معرفت کی شراب پیش کی گئی ہے۔ کٹر عیسائیوں کے مطابق حضرت مریمؑ کو کنواری ہونا چاہیے تاکہ وہ بے داغ کردار کے ذریعے وحی ربانی کو انسانی شکل دے سکیں۔ اسی طرح حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھی امی ہونا چاہیے تھا تاکہ وحی کی صورت میں نازل ہونے والے قرآن میں آپؐ کی اپنی کسی عقلی اور استدلالی سرگرمی کا عمل دخل نہ ہو اور اس کی خالص عظمت اور حسن برقرار رہے جیسا کہ حلاجؔ (وفات ۹۲۲ عیسوی) نے کہا ہے: ''حضورؐ یہ کہہ کر اپنی طاقت سے دست بردار ہو گئے تھے: میں تیری ہی طرف لوٹتا ہوں اور تیری طرف ہی چل کر آتا ہوں۔'' (حلاجؔ: کتاب الطواسین)۔

نظامیؔ نے امی کی اصطلاح کی خصوصی تشریح کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ الف سے مراد آدم اور میم سے مراد مسیح ہے۔ اس طرح تمام سابق پیغمبر حضورؐ کی ذات میں سمو گئے ہیں۔ لیکن جامیؔ نے لفظ امی کی وضاحت کرنے کے لیے زیادہ سیدھا سادا البتہ ذومعنی انداز اختیار کیا ہے: نبی کریمؐ کی پرورش ام الکتاب یعنی سورہ فاتحہ کے جاہ و جلال سے ہوئی ہے، اس لیے آپؐ صحیح معنوں میں امی ہیں یعنی ''ام بمعنی ماں سے آپؐ کا قریبی تعلق ہے۔''

مولانا رومیؔ اپنی مثنوی میں اس طرح نغمہ سرا ہیں:

ترجمہ: شاعری کی ایک لاکھ کتابیں

امی کے ایک لفظ کے سامنے شرمسار ہیں

اپنی نثری کتاب فیہ مافیہ میں اس موضوع کی تشریح کرتے ہوئے وہ یوں رقم طراز ہیں:

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس لیے امی یا ناخواندہ نہیں کہا گیا کہ آپ لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے بلکہ آپ کو امی اس لیے کہا گیا ہے کہ لکھنا پڑھنا، علم اور حکمت آپ کی ذات کے باعث وجود میں آئے ہیں اور یہ علوم اکتسابی نہیں ہیں۔ کیا ایسا شخص، جو چاند کے چہرے پر علامتیں نقش کر سکتا ہو، لکھنے کے فن سے ناآشنا ہو سکتا ہے؟ اور پوری دنیا میں ایسی کون سی چیز ہے جس کا اسے علم نہیں؟ سب انسان اسی سے سیکھتے ہیں۔ پھر کیوں نہ ہم اسی ذات پاک کا دامن تھام لیں کیوں کہ آپؐ سے حاصل ہونے والی جزوی دانش و حکمت بھی آفاقی علم پر بھاری ہے۔ (Arberry: Discourses of Rumi, p.151)

یہ ایک اچھوتا اور منفرد انداز ہے جس کے ذریعے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تمام آفاقی علوم کے ہم پلہ قرار دیا گیا ہے اور یہ کہ تمام انسانی علوم اور حکمت و دانش کا سرچشمہ حضورؐ کی ذات ہے۔ یہ وہ نظریہ ہے جو رومیؔ کے عہد کے صوفیوں کے حلقے میں فروغ پا رہا تھا۔

رسول اللہؐ کے تصوفانہ میلان کو اجاگر کرنے کے لیے شاعروں نے آں حضرتؐ کے امی ہونے کی خوبی کا ہمیشہ عقیدت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے:

ترجمہ: ایک یتیم جس نے کبھی پڑھنا نہ سیکھا
اس نے کئی ملکوں کے کتب خانوں کو ملیامیٹ کر دیا

سعدیؔ نے ان خیالات کا اظہار تیرہویں صدی میں کیا جس کے ۳۵۰ سال بعد فیضیؔ نے مغل ہندوستان میں لکھا:

ترجمہ: شریعت اور الہامی کتاب کے ساتھ جو ایک نور ہے
تلوار اور زبان کے ساتھ جو ایک بین ثبوت ہے
اگرچہ آپؐ خاک سے ہیں، اس کے باوجود تخت کی چوٹی پر آپؐ کا نزول ہوا
گو کہ آپؐ ناخواندہ ہیں لیکن ایک کتب خانہ آپؐ کے دل میں ہے

سعدیؔ کے چند سال بعد تقریباً ۱۶۰۰ عیسوی میں نظیریؔ ان سے بھی آگے نکل گئے ہیں:

ترجمہ: اسرار کے کتب خانے میں آپؐ کو اس وقت قرآن ازبر تھا
جب آفاقی علم و دانش ابھی حروف تہجی کے الف اور ب کے درمیان امتیاز بھی نہیں کر سکتی تھی

بھارت اور پاکستان کے دیگر شاعروں نے اسلامی فن خطاطی کی اصطلاحیں استعمال کرتے ہوئے کہا ہے:

ترجمہ: نسخ اور نستعلیق کو سیکھے بغیر

آپ نے اپنے پہلے کی تمام چیزوں کو منسوخ (خط نسخ) کر دیا

شاعر یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ جب امی پیغمبر کا ظہور ہوا تو آپ سے پہلے نازل ہونے والی الہامی کتابیں تورات، زبور اور انجیل منسوخ ہو گئیں اور جیسا کہ رومی نے کہا ہے، حضور کے امی ہونے کی خوبی یہ ہے کہ آپ نے چاند کے دو ٹکڑے کر کے اس پر ایک لکیر کھینچ دی۔ آپ کو ہاتھ میں قلم لینے کی کیا ضرورت ہے؟

صوفیہ حضرات کی نظر میں امی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان تمام لوگوں کے لیے مثال اور نمونہ بن گئے جن کے پاس کوئی کتابی علم نہیں اور انہیں صرف خدا کی طرف سے علم اور وجدان کی دولت سے سرفراز کیا گیا ہے، وہ جنہیں شعری کلام کے مطابق حروف تہجی کے صرف پہلے لفظ الف کا علم ہے۔ صوفیانہ تشریح کے مطابق یہ لفظ اللہ کا آئینہ دار ہے جو ایک اور بے مثل ذات ہے لہٰذا چاروں مقدس کتابیں اس لفظ میں سمو دی گئی ہیں کیوں کہ جیسا کہ جامی نے سوال کیا ہے:

ترجمہ: اگر کاملیت لکھنے پڑھنے سے حاصل ہو سکتی

تو کائنات کا قبلہ ناخواندہ کیوں ہوتا؟

اسی وجہ سے بہت سے صوفیوں نے رسول کریم کے ناخواندہ ہونے کے حوالے سے ان پڑھ ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ چناں چہ ترکی کے لوک صوفی شاعروں نے (مثال کے طور پر امی کمال اور امی سنان) دوسری باتوں کے علاوہ امی کو عرفیت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہ لوگ محسوس کرتے تھے کہ ان کا کلام روحانی وجدان کا نتیجہ ہے نہ کہ علم حاصل کرنے کے روایتی ذرائع کا!

خدا کی جانب سے اس خاص علم کو قرآن کریم میں علم لدنی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے علم منجانب اللہ (پس ہمارے بندوں سے ایک بندے کو پایا جسے ہم نے اپنے پاس کی خاص رحمت عطا فرما رکھی تھی اور اسے اپنے پاس سے خاص علم سکھا رکھا تھا۔ سورہ کہف آیت ۶۵۔ مترجم)۔ یہی وہ خاص علم ہے جس کی بدولت حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس دنیا کی ہر چیز بلکہ مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کے متعلق سب کچھ جانتے تھے۔ قاضی عیاضؒ نے کتاب الشفا میں رسول کریم کے صحابی حضرت ابو حذیفہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے: ''ایک روز رسول اللہؐ ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور اپنے اس مقام میں آپ نے قیامت تک ہونے والی کسی چیز کا ذکر بیان کرنے سے باقی اٹھا نہ رکھا۔ پس جس نے یاد رکھا، اس نے یاد رکھا اور جس نے بھلا دیا، اس نے بھلا دیا۔ میرے یہ ساتھی اچھی

طرح جانتے ہیں کہ ان میں سے جب کسی بات کا وقوع ہوتا ہے تو میں اسے جان لیتا ہوں اور فوراً مجھے اس طرح یاد آ جاتی ہے جیسے کسی غائب آشنا کی صورت ذہن نشین ہوتی ہے اور جب وہ سامنے آتا ہے تو آدمی اسے فوراً پہچان لیتا ہے۔'' (Tor Andrae: Die Person Muhammads, p.86)۔ یہ نظریہ قرآن حکیم کے اس بیان کی تردید کرتا ہے کہ حضورؐ مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات کی پیش گوئی کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ (آپؐ کہہ دیجیے کہ نہ تو میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف جو کچھ میرے پاس وحی آتی ہے، اس کا اتباع کرتا ہوں۔ آپؐ کہیے کہ اندھا اور بینا کہیں برابر ہو سکتا ہے۔ سو کیا تم غور نہیں کرتے؟ سورہ الانعام آیت ۵۰۔ مترجم)۔ لیکن اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نسبتاً ابتدائی زمانے میں بھی حضورؐ کے مداحوں کو یقین تھا کہ آپؐ کا علم انسانی فہم وادراک کے تمام حدود سے برتر اور بے مثال ہے اور اسی علم کی بدولت آپ کو سائنس کی تمام شاخوں کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ جس طرح صوفیائے کرام آں حضرتؐ کی ذات گرامی کو تصوف کا سرچشمہ سمجھتے ہیں، اسی طرح خطاطوں اور تاریخ دانوں، سائنس دانوں اور طبیبوں کو یقین ہے کہ آپؐ نے ان کے متعلقہ شعبوں کی رہنمائی کے لیے مثال قائم کر دی ہے۔

شق صدر اور شق القمر جیسے معجزوں کے علاوہ جس طرح ایک امی پیغمبرؐ کی حیثیت سے آپؐ کے رول کی قرآن مجید میں صراحت موجود ہے، ٹھیک اسی طرح اسریٰ اور معراج کے واقعات اور قیامت کے روز شفاعت کرنے کے اختیار سمیت حضورؐ سے منسوب کئی دوسرے معجزوں کا عوامی روایات میں بار بار تذکرہ کیا گیا ہے۔

یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ جس طرح قرآن مجید میں حضرت عیسیٰؑ کے مردوں کو زندہ کرنے کا ذکر ہوا ہے، اسی طرح حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی مردوں میں نئی روح پھونک سکتے تھے، پشتو کے ایک لوک گیت میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ سے اپنی نبوت کی صداقت کے ثبوت میں ایک ایسا پرندہ پیدا کرنے کے لیے کہا گیا جس کے پاؤں عقیق، آنکھیں لاجوردی، گردن بلوریں اور چونچ سونے کی ہو تو آپؐ نے ایسا پرندہ پیدا کر دیا تھا۔ یہ اس قسم کا معجزہ ہے جس کی طرف ہندوستانی مسلمانوں کا خاص طور پر بہت میلان ہے۔ اس قسم کے کئی دوسرے معجزوں کا بھی اکثر تذکرہ ہوا ہے۔ مشرقی ملکوں میں رسول کریمؐ کے بارش برسانے کے معجزے کو مذہبی کتابوں میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ چوں کہ طویل قحط کے بعد بارش کے لیے نماز (نماز استسقا) کا شمار فرض نمازوں میں ہوتا ہے، اس لیے سب سے پہلے نماز استسقا ادا کرنے والے پیغمبر کا ذکر فطری بات ہے۔ (ابونعیم: دلائل النبوت صفحات ۳۸۳ تا ۳۸۵)۔ چناں چہ مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ وہ اس نماز میں ان الفاظ میں دعا کریں جو اس موقعے پر حضورؐ نے ادا کیے تھے۔ چوں کہ رسول کریمؐ عالمین کے لیے رحمت ہیں اور رحمت اور بارش میں قریبی تعلق ہے، اس لیے مشرقی زبانوں میں اس

تعلق کو دعا میں تاثیر کا درجہ حاصل ہے، بارش برسانے کے ساتھ ہی آں حضرتؐ کے اس معجزے کا بھی ذکر آتا ہے جب آپؐ کی انگشت مبارکہ سے پانی جاری ہو گیا تھا۔ سولہویں صدی کے آخر میں ترک شاعر فوظلی نے اس معجزے سے متاثر ہو کر رسول اللہؐ کی شان میں نہایت اعلیٰ پائے کا ایک قصیدہ لکھا جو اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس کے ردیف میں سو یعنی پانی کا لفظ آتا ہے۔ شاعر نے حضور رسالت پناہؐ کے اس معجزے کا حوالہ دیتے ہوئے یہ امید ظاہر کی ہے کہ آپ کی شفقت و رافت کا پانی دوزخ کی آگ کو بجھا دے گا۔ اس استعارے کو مسلسل استعمال کرنے کے بعد وہ اپنی طویل نظم کو اس دعا کے ساتھ ختم کرتا ہے:

ترجمہ: اے وحدت کی سرچشمہ ذات! میری آنکھوں کو آنسوؤں کی صورت میں پانی سے بھر دے

جو (رسول کریمؐ کے) دیدار کی پیاسی ہیں

رسول کریمؐ کے دوسرے معجزوں کا تعلق کھانے سے ہے جو ایک معاشرے میں، جہاں مہمان نوازی کو سب سے بڑی خوبی سمجھا جاتا ہے، بے پناہ اہمیت حاصل ہے (ابونعیم نے دلائل النبوت کے صفحات ۳۵۳ تا ۳۶۸ میں کھانے سے متعلق معجزوں کا تذکرہ کیا ہے)۔ آپؐ کے ان معجزوں میں ام معبدؓ کا قصہ غالباً سب سے پرانا اور مصدقہ ہے۔ رسول کریمؐ صحابہؓ کی ایک جماعت کے ہمراہ صحرا میں ام معبدؓ کے خیمے کے قریب سے گزرے اور ان سے کچھ گوشت اور کھجوریں خریدنے کی کوشش کی لیکن ان کے پاس بجز ایک بکری کے کھانے کی کوئی چیز نہیں تھی۔ چناں چہ آں حضرتؐ نے اس بکری کی طرف اشارہ کیا جو خیمے کے ایک کونے میں کھڑی تھی، آپؐ نے فرمایا:

''کیا یہ بکری دودھ دیتی ہے؟''

ام معبدؓ نے جواب دیا: ''یہ بہت کمزور ہے۔''

حضورؐ نے فرمایا: ''کیا تم مجھے اس بکری کا دودھ دوہنے کی اجازت دو گی؟''

ام معبدؓ نے کہا: ''آپؐ مجھے اپنے ماں باپ سے عزیز ہیں۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ یہ بکری دودھ دیتی ہے تو میں اس سے پہلے اس کا دودھ دوہ لیتی۔''

اس پر رسول اللہؐ نے بکری کو قریب بلا کر اپنا دست مبارک اس کے تھنوں پر پھیرا اور ام معبدؓ اور اس کی بکری کے لیے خدا سے دعا مانگی۔ اچانک بکری نے اپنی ٹانگیں پھیلا دیں اور اس کے تھنوں سے دودھ رواں ہو گیا۔ آں حضرتؐ نے ایک برتن منگوایا اور یہ برتن بکری کے دودھ سے بھر گیا۔ پھر آپؐ نے یہ دودھ ام معبدؓ کو دیا اور وہ دودھ پی کر سیر ہو گئیں۔ بعد میں حضورؐ نے تمام صحابہؓ کو وہ دودھ پلایا اور وہ سب بھی آسودہ ہو گئے۔ سب سے آخر میں آپؐ نے دودھ پیا۔ جب سب لوگوں کی پیاس بجھ گئی تو آپؐ نے ایک مرتبہ پھر دودھ نکالا جس سے برتن دودھ سے لبریز ہو گیا۔

آپؐ نے یہ برتن ام معبدؓ کو دے دیا اور وہاں سے روانہ ہو گئے اور سب نے اپنا سفر جاری رکھا۔

اس واقعے کے کچھ دیر بعد اس خاتون کے شوہر ابو معبدؓ چند خستہ حال بھوکی بکریوں کو ہانکتے ہوئے واپس آ گئے جن کے تھن بھی سوکھ چکے تھے۔ جب انہوں نے دودھ کو دیکھا تو انہیں سخت حیرت ہوئی اور انہوں نے اپنی بیوی سے دریافت کیا: ''تم نے یہ دودھ کہاں سے لیا ہے ام معبد؟ یہ بکری تو بانجھ ہے اور گھر میں دودھ دینے والا کوئی اور جانور بھی نہیں ہے!''

ام معبدؓ نے کہا: ''یہ سچ ہے لیکن ایک مقدس شخص کا یہاں سے گزر ہوا ہے، جس کا حلیہ اس طرح تھا۔''

ابو معبدؓ نے کہا: ''مجھے ان کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کرو ام معبد!''

ام معبدؓ نے کہا: ''میں نے ایک ایسے شخص کو دیکھا جو بے حد پاکیزہ اور نفیس، جس کا چہرہ روشن و تاباں اور اخلاق و اطوار کے اعتبار سے بے مثل تھا۔ نہ تو دبلے پن کی وجہ سے اس کی شکل و صورت بگڑی ہے اور نہ ہی سر کے بال غائب ہونے کی بنا پر وہ فرومایہ نظر آ رہا تھا۔ وہ نہایت بارعب اور خوش اطوار تھا۔ اس کی آنکھیں سیاہ اور بھنویں خمدار تھیں۔ اس کی آواز رعب دار اور اس کی گردن میں نورانی چمک تھی۔ اس کی داڑھی گھنی اور اس کی پلکیں کمان کی طرح تھیں۔ جب وہ خاموش ہوتا، تمکنت اور شان و شوکت اسے اپنے حصار میں لے لیتی، جب وہ گفتگو کرتا تو سر بہ فلک ہوتا اور اس کے چاروں طرف نور افشانی ہوتی۔ آپؐ کو خواہ قریب سے دیکھا جاتا یا دور سے، ہر حالت میں آپؐ حسین و جمیل دکھائی دیتے......(البیہقی، دلائل النبوت، صفحہ ۱۹۶)۔

یہ قصہ رسول اللہؐ کے حلیہ مبارک کی جزئیات کے ضمن میں ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور حسانؓ بن ثابت کی شاعری میں ایسے ہی خیالات ظاہر کیے گئے ہیں۔ بعد میں آنے والے شاعروں نے اس سلسلے میں مزید تفصیلات کا اضافہ کیا ہے۔

متاخر روایات میں کھانے سے متعلق معجزوں میں بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ ایک بکری کے گوشت سے ایک ہزار افراد کا پیٹ بھر گیا یا تھوڑے سے کھانے سے بڑی تعداد میں غیر متوقع مہمان سیر ہو گئے۔ جس واقعے کا اکثر ذکر ہوا ہے، وہ خیبر میں ایک یہودیہ کی طرف سے حضورؐ کو پیش کیا جانے والا بھنا ہوا بکرا تھا جس کے سامنے آنے پر آپؐ نے فرمایا تھا: ''اس بکرے کی ٹانگ نے مجھے بتایا ہے کہ وہ زہر آلود ہے۔'' بعد میں اس حکایت میں اور اضافہ کر کے یہ کہا گیا کہ بھنا ہوا بکرا اپنی چاروں ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا تھا اور اس نے آں حضرتؐ سے مخاطب ہو کر آپؐ کو زہر کے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ (ابونعیم دلائل النبوت، صفحہ ۱۵۵)۔

اس کے علاوہ جانوروں اور چوپایوں نے کئی موقعوں پر حضورؐ کی رسالت کی تصدیق کی۔ مثال کے طور پر ابونعیم

اور البیہقی نے اپنی اپنی کتاب دلائل النبوت میں بیان کیا ہے کہ کس طرح اونٹ اور دوسرے جنگلی جانور آں حضرتؐ کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے تھے اور کس طرح ہرن، بھیڑیے اور گوہ نے یہ گواہی دی تھی کہ آپ اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں۔ (سبز رنگ کی ایک گوہ نے حضورؐ کی خدمت میں کہا تھا: السلام علیکم یا نبی محمدؐ، یا رسول اللہؐ۔ Swahili Islamic) (Poetry 1:35۔ درخت اور پتھر بھی یہ شہادت دیتے تھے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خدا کے رسول ہیں۔ غرض یہ معجزے دیکھ کر کئی مشرکوں نے اسلام قبول کر لیا۔ (ابونعیم: دلائل النبوت صفحات ۳۳۱ تا ۳۳۷)۔ رسول کریمؐ کے ہاتھ میں کنکریوں نے بھی آپؐ کی تعریف وتحسین کی۔ کئی صدیاں پہلے جامیؔ نے اس معجزے سے متاثر ہو کر کہا تھا:

ترجمہ: تسبیح کے دانے سے بھی چھوٹی کنکری نے
حضورؐ کے ہاتھ میں فصیح و بلیغ لفظوں میں خدا کی حمد وثنا کی
اور وہ جادو بیان لوگ جن کے دل پتھر کی مانند سیاہ تھے
ان کی زبانیں بیک وقت گنگ ہو گئیں

ایک روایت کے مطابق آں حضرتؐ نے ایک مکان میں دعا کی تو اس گھر کی دیواروں اور دروازوں سے ''آمین'' کی صدائیں سنائی دیں۔ (ابونعیم: دلائل النبوت، صفحہ ۳۷۰)۔

اور جب آپؐ تپتی ہوئی دھوپ میں باہر نکلے تو ابر کا ایک ٹکڑا آپؐ کو دھوپ کی تمازت سے بچانے کے لیے سایہ فگن ہو گیا۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ ایک طاقت ور رہنما کے ساتھ عقیدت کے طور پر رسول کریمؐ کے صحابہ کرامؓ آپؐ کے استعمال کیے ہوئے پانی کو دوائی سمجھتے تھے اور جو بھی چیز آپؐ کے جسم اطہر کو چھو جاتی، اسے برکت سمجھا جاتا تھا۔ یہ نظریہ ایسے واقعات کے پیچھے بھی کارفرما تھا جن میں رسول اللہؐ نے بیماروں کو شفایاب کرنے کے لیے اپنا لعاب استعمال کیا جس میں شفایابی کی نمایاں تاثیر موجود تھی۔ (Andrae: Die Person Muhammads, p.48)۔ بعد کے برسوں میں عبدالقادر جیلانیؒ کو خواب میں نبی کریمؐ کی زیارت ہوئی اور حضورؐ نے اپنا لعاب ان کی زبان پر ڈال دیا تاکہ اس کی برکت سے وہ اسلام کی کامیاب تبلیغ کر سکیں۔ (Braune: Die Futu-al-gaib, p.14)۔ صوفیوں میں خواب میں آں حضرتؐ کی زیارت کے ایسے کئی واقعات رونما ہوئے ہیں۔

نہ صرف انسان بلکہ حیوان بھی آپؐ کے ان معجزوں سے فیض یاب ہوئے۔ مثال کے طور پر حضورؐ نے ایک لاغر اونٹ کا اپنے دست مبارک سے علاج کیا۔ یہ وہ معجزے ہیں جن کو لوک گیتوں میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بدوی اور دیہاتی لوگ دوسرے معجزوں کے مقابلے میں اس قسم کے معجزات کی زیادہ تحسین کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ابونعیم اور البیہقی کی کتابوں میں آں حضرتؐ کے جن معجزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہ سب کے سب مقبول نہیں ہوئے اور جن معجزوں کا انہوں نے ذکر نہیں کیا، وہ علمائے دین، خاص طور پر شاعروں کے خیالات کو مہمیز دینے میں زیادہ کارگر اور موثر ثابت ہوئے ہیں۔ سندھی کے عوامی روایات کے سلسلے وار جریدے کے مسلمان ایڈیٹر ڈاکٹر این اے بلوچ نے، جنھوں نے امریکا میں تعلیم پائی ہے، ایسے معجزاتی قصوں کے حوالے سے قدیم معاشروں کی فرسودہ باقیات تصور کرنے والے جدت پسندوں کو ٹھیک یاددلایا ہے کہ "یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ محبوب شخصیات کے بارے میں مبالغہ آرائی ایک فطری بات ہے کیوں کہ یہ (مبالغہ آرائی) دل سے نکلتی ہے۔" (بلوچ: معجزہ تعارف، صفحہ ۲)۔ اس دنیا میں محبوب پیغمبرؐ سے بڑھ کر قابل تعریف اور حسین کوئی اور شخصیت موجود نہیں چناں چہ رسول کریمؐ کی سادہ سیرت مقدسہ کے متعلق روایات اور اشعار اس عقیدت اور محبت کے آئینہ دار ہیں جو آپؐ کی ذات پاک کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں موجزن ہے۔ قرون وسطی کے ایک اسپینی عرب شاعر احمد العروسی نے اپنی ایک طویل نظم میں حضورؐ کی خدمت میں ان گنت گلہائے عقیدت کا مرقع پیش کرتے ہوئے کہا ہے:

ترجمہ: کیا یہ آپؐ کی ذات اقدس نہیں جسے بنی نوع انسان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے؟
کیا یہ آپؐ ہی نہیں جن کی تعریف میں کنکریاں بھی رطب اللسان ہیں
اور جن سے ریگستان میں بھیڑیوں اور گوہ نے گفتگو کی تھی؟
کیا یہ آپؐ کی ذات مبارک نہیں جن کے لیے چاند کے دو ٹکڑے کیے گئے تھے؟

حنانہ (مسجد نبویؐ میں خشک کھجور کے ستون کے رونے) کا معجز نما واقعہ شاعروں میں خاص طور پر بہت مقبول ہے اور مختلف زمانوں میں عقیدت و شیفتگی کے ساتھ اس واقعے کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسجد نبویؐ میں کھجور کے ایک خشک ستون سے ٹیک لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے لیکن جب صحابہ کرامؓ نے حضورؐ کے لیے ایک منبر تیار کر لیا تو اس ستون کی ضرورت نہ رہی۔ (ابونعیم: دلائل النبوت، صفحات ۳۴۰ تا ۳۴۵)۔ آں حضرتؐ جب اس منبر پر جلوہ افروز ہوئے تو یہ ستون زار و قطار رونے لگا یہاں تک کہ اس کی آواز سے مسجد گونج اٹھی کیوں کہ اس کی خواہش تھی کہ حضورؐ اس کے ساتھ ٹیک لگائیں۔ روایت ہے کہ ستون کے رونے کی آواز سن کر تمام حاضرین بھی رونے لگے۔ چناں چہ جب نبی کریمؐ نے اپنا دست مبارک اس پر رکھا تو یہ ستون خاموش ہو گیا۔ جامیؔ نے اس واقعے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا ہے:

ترجمہ: کیا ہم خشک کھجور کے اس ستون سے بھی کم تر ہیں؟

اگر خشک کھجور کا ایک بے جان ستون حضورؐ کے فراق میں اس قدر غم زدہ ہے تو دل اور عقل رکھنے والا انسان، جو

نبی کریمؐ کے اعلیٰ محاسن اور بلند مرتبے سے آگاہ ہے، اس پر کیا گزرتی ہوگی؟

لوک شاعروں کو اس ہرنی کے قصے سے بھی بڑی محبت ہے جسے ایک سنگ دل شکاری نے پکڑ لیا تھا۔ (ابونعیم: دلائل النبوت، صفحہ ۳۲۰)۔ بعض روایات کے مطابق یہ ظالم شکاری رسول کریمؐ کے پکے دشمن ابوجہل کا بیٹا تھا۔ (Darmesteter: Chants Populaires des Afghans, no.40)۔ جب حضورؐ وہاں سے گزرے تو آپؐ نے ہرنی کے رونے کی آواز سنی کیوں کہ صحرا میں اس کے دو بچے پیاس کی وجہ سے مر رہے تھے۔ لوک گیتوں میں یہ ایک مقبول موضوع ہے اور شاعروں نے ڈرامائی اور رقت انگیز طریقے سے اس بے چاری ہرنی کی حالت زار کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ سندھی کے ۱۳ شاعروں نے اس کہانی کی سادہ انداز میں قافیہ بندی کی ہے۔ ان میں سے ایک شاعر بیان کرتا ہے:

ترجمہ: آقاؐ نے اس غریب ہرنی کی آواز سنی

اور احمدؐ اس کے پاس چلے گئے

آپؐ نے فرمایا: ''تم مدد کے لیے کیوں پکار رہی ہو

اے ہرنی! تمہیں کیا مصیبت پیش آئی ہے؟''

ہرنی کہنے لگی: ''میرے آقاؐ! میرے پیچھے دو بچے

صحرا میں بھوکے پیاسے ہیں

پس آپؐ براہ کرم میری مدد کیجیے

اے احمدؐ! آپؐ میرے ضامن بن جائیے

میں وہاں جاؤں گی اور بچوں کو دودھ پلا کر

بہت جلد واپس آ جاؤں گی!''

بلند مرتبت آقاؐ نے اپنے پاکیزہ ہاتھوں سے

جلدی سے جال کھول کر اسے رہا کر دیا

ہرنی تیزی سے بھاگتی ہوئی وہاں چلی گئی

جہاں بچے اس کا انتظار کر رہے تھے

اسی اثنا میں وہ ناہنجار شکاری وہاں پہنچ گیا

اور رسول اللہؐ سے کہنے لگا:

''دیکھو! میں نے یہ سفاکانہ فعل اس لیے کیا ہے

کیوں کہ میں شکار کھیلنے کا فن جانتا ہوں

آپ نے اس جال کو کیوں چیر پھاڑ دیا ہے؟

آپ نے ہرنی کو کیوں رہا کر دیا ہے؟

آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟

اور آپ مجھے بتائیں کہ آپ کا نام کیا ہے؟

یا تو آپ مجھے ہرنی دیں

یا میرے سوال کا جواب دیں؟''

حضورؐ اس شکاری کے سامنے کھڑے ہو گئے

آپؐ نے نہایت صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے فرمایا:

''میرا نام محمد امین ہے

ہرنی نے مجھ سے واپس آنے

اور خود کو تمہارے حوالے کرنے کا وعدہ کیا تھا

بہ ہر حال اب میں خود کو تمہارے حوالے کرتا ہوں

ہرنی کی جگہ اس کا ضامن حاضر ہے

اگر ہرنی واپس نہ آئی

تو میں اس کا نعم البدل موجود ہوں......''

اسی دوران ہرنی اپنے بچوں کے پاس پہنچ گئی جنھوں نے اس سے دریافت کیا کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے؟ ہرنی نے بچوں کو بتایا کہ رسول کریمؐ خود اس کے ضامن بنے ہیں۔ پھر اس نے بچوں سے کہا کہ وہ بھی اس کے ساتھ چلیں۔ چناں چہ وہ تینوں آں حضرتؐ کے پاس پہنچ کر آپؐ کے قدموں میں گر پڑے اور آپؐ کے پیروں کو چومنے لگے۔ جب شکاری نے یہ معجزہ دیکھا تو وہ فوراً مسلمان ہو گیا۔ (بلوچ: معجزہ، صفحہ ۱۳۰)۔ اس کے بعد وفادار ہرنی کو رہا کر دیا گیا اور وہ اپنے بچوں کے ساتھ واپس چلی گئی۔ بعد کی ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ ہرنی نے سورہ الکوثر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضورؐ سے کہا تھا:

ترجمہ: کوثر آپؐ ہی کے لیے بہتی ہے

میرے تھنوں سے بھی دودھ آپؐ ہی کی برکت سے نکلتا ہے

بنی نوع انسان کو حوض کوثر سے پانی پینے دیجیے

میں تو (اپنے بچوں کو) دودھ ہی پلاؤں گی

ایک اور حکایت کے مطابق ایک عقاب اس لیے حضورؐ کے نعلین پاک لے کر اڑ جاتا ہے کیوں کہ ان میں ایک زہریلا سانپ چھپا ہوا تھا۔ چناں چہ یہ عقاب نعلین کو لے کر صحرائی پہاڑوں میں لے گیا جہاں وہ زہریلے سانپ کو نیچے پھینک دیتا ہے۔ (ابونعیم: دلائل النبوت، صفحہ ۱۵۴)۔ اسی طرح ابوہریرہؓ کی بلی آں حضرت کو اس سانپ سے بچالیتی ہے جو آپؐ کی رحم دلی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپؐ کو گلا دبا کر ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ حضورؐ نے جس رومال سے ایک مرتبہ منہ صاف کیا، اسے جب آگ میں ڈالا جاتا تو اسے آگ نہ لگتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کپڑا انور نبوت سے مستنیر تھا جو آگ کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط ہے۔ (رومیؔ مثنوی جلد سوم)۔ کیا جہنم سچے مومنوں سے یہ نہیں کہتی کہ تمہارے نور نے میری آگ کو سرد کر دیا ہے؟

عربی اور فارسی کے عظیم کلاسیکل شاعروں نے، جیسے بصیریؒ نے ہمزیہ اور جامیؔ نے اپنی طربیہ اور رزمیہ شاعری میں، زوردار لفظوں میں سرور کائناتؐ کے تمام معجزے بیان کیے ہیں کیوں کہ انہیں پختہ یقین تھا کہ ان معجزوں کا تذکرہ خیر و برکت کا باعث ہے جس سے انہیں سنانے اور سننے والا دونوں برکتوں اور رحمتوں سے فیض یاب ہوں گے۔ چناں چہ ایک سندھی شاعر نے کہا ہے کہ جو شخص ہر جمعرات کی شب کو سانپ سے متعلق معجزے کے بارے میں اس کی لکھی ہوئی نظم کو پڑھے گا، قیامت کے روز اسے اس کا بے انتہا اجر و ثواب ملے گا۔ (بلوچ: معجزہ صفحہ ۱۷۶)۔ جنوبی ہندوستان کے شاعروں نے بھی اپنے کلام میں جن معجزوں اور روایتوں کا تذکرہ کیا ہے یا حضورؐ کی شان میں جو قصیدے لکھے ہیں، ان کے قاریوں کے لیے بھی اسی قسم کے وعدے کیے گئے ہیں۔

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ایسے روایتی قصوں پر مبنی اشعار لکھنے یا انہیں سننے سے رسول خداؐ کے ساتھ ان کا ذاتی تعلق قائم ہو جائے گا۔ انہیں یقین ہے کہ اگرچہ رسول پاکؐ مدینہ منورہ میں دفن ہیں، اس کے باوجود آپؐ خدا کی موجودگی میں زندہ اور ہر جگہ موجود ہیں، خاص طور پر ان مقامات پر جہاں درویشوں کی ذکر کی ایسی محفلیں منعقد ہوں جن میں حضورؐ کے اسم گرامی کا تذکرہ محبت کے ساتھ کیا جائے، آپؐ پر درود و سلام بھیجا جائے یا آں حضرت کی پیدائش کے سلسلے میں مولود کی محفلیں منعقد ہوں۔ (تجانیہ سلسلے میں اس عمل کو بنیادی عقیدے کی حیثیت حاصل ہے۔ دیکھیے پانچواں باب)۔

رسول کریمؐ پر درود و سلام بھیجنے اور آپؐ کے معجزوں کے بار بار تذکرے کے نتیجے میں آپؐ کے عقیدت مندیہ

توقع رکھتے ہیں کہ انہیں زندگی کا سب سے بڑا عطیہ یعنی خواب میں آپ کی زیارت کا شرف حاصل ہوگا۔ ایسے خواب اسلامی تقوے اور پرہیزگاری میں آج تک غیر معمولی کردار ادا کرتے ہیں۔ (Goldziher: The Appearance of the Prophet in Dreams)۔ یہ خواب بالکل سچے ہوتے ہیں کیوں کہ شیطان کبھی حضورؐ کی شکل اختیار نہیں کر سکتا۔ یہ خواب ایک مسلمان کی ڈھارس بندھاتے اور اسے بیماری اور غم سے نجات دلاتے ہیں۔ ایک صوفی کے لیے خواب میں آں حضرتؐ کی زیارت ایک باضابطہ مشاہدے کے مصداق ثابت ہو سکتی ہے یا اس سے کوئی دینی مسئلہ حل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ قرون وسطیٰ کے شیراز کے ایک صوفی ابن خفیفؒ کو جب یہ معلوم ہوا کہ رسول کریمؐ نے احد کے معرکے میں پاؤں زخمی ہونے کے بعد پنجوں کے بل نماز ادا کی تھی تو انہوں نے نماز میں حضورؐ کی پیروی کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ چناں چہ رسول اللہؐ نے خواب میں اس صوفی کو ہدایت کی کہ اس قسم کی نماز صرف آپؐ کے لیے مخصوص ہے اور ایک متوسط مسلمان یہ خصوصی انداز اختیار کرنے کا پابند نہیں۔ صوفیوں کی روایات کے مطابق رسول کریمؐ نے کئی ایسے علمائے دین کی سرزنش کی ہے جنہیں کسی صوفی پر اعتماد نہیں تھا یا انہوں نے کسی صوفی رہنما کا احترام نہیں کیا تھا۔ (افلاکی: مناقب العارفین صفحات ۳۲۶، ۳۳۴)۔ مولانا رومؔی کے دوست اور جانشین حسام الدین چلپی نے خواب میں رسول اللہؐ کو دیکھا کہ آپؐ نے رومؔی کی مثنوی ہاتھوں میں پکڑ رکھی ہے اور اپنی امت کے اولیا کی موجودگی میں مثنوی کو پڑھ کر خوش ہو رہے ہیں۔ (جامؔی: نفحات الانس صفحہ ۳۷۳)۔ ایک اور روایت کے مطابق حضورؐ نے الغزالیؒ کے ساتھ بھی اسی طرح شفقت فرمائی۔ رسول کریمؐ نے بعض اوقات خواب میں عملی مسائل بھی حل کیے۔ ابتدائی دور کا ایک صوفی بھوک کی شدت سے نڈھال ہو کر حضورؐ کے روضہ اقدس پر پہنچ گیا اور یہ دعویٰ کیا کہ وہ آں حضرتؐ کا مہمان ہے۔ چناں چہ آپؐ نے اسے خواب میں ایک روٹی دی، اس نے آدھی روٹی کھا لی اور صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو باقی آدھی روٹی اس چٹائی پر پڑی ہوئی تھی جس پر وہ رات کو سویا تھا۔ (Meier: Abu Said Abu Hayr, p.257)۔ خواب میں نبی کریمؐ کی بتائی ہوئی حدیث کو دوسرے لوگوں تک منتقل کیا جا سکتا ہے البتہ شاہ ولی اللہؒ نے واضح کیا ہے کہ ایسی حدیث صرف خواب دیکھنے والے شخص کے لیے جائز ہے، دوسروں کے لیے نہیں۔ بعض صوفیہ حضرات نے خواب میں حضورؐ کی زیارت کرنے کے لیے جامؔی کی وہ نظم پڑھنے کی سفارش کی ہے جس کے قافیے میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اسم گرامی آتا ہے۔ (ایس بی بخاری: جواہر الاولیا صفحہ ۳۱۰)۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ بعض عیار اور دغا باز لوگوں نے متقیوں کے اس پختہ عقیدے سے ناجائز فائدہ اٹھا کر خواب میں حضورؐ کی زیارت کرنے کے جھوٹے دعوے کر کے حضورؐ کی طرف سے یہ یہ کرنے یا اپنی امت کے لیے دعاؤں کے نسخے تجویز کرنے کے من گھڑت قصے وضع کرنا شروع کر دیے چناں چہ ہمدانؔی نے گیارہویں صدی میں مقامات میں اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے ایسے مکار لوگوں کی سخت سرزنش کی ہے۔

السیوطیؒ (علامہ جلال الدین سیوطی ۔مترجم) نے ابتدائی دور کے ایک صوفی کے متعلق ایک خوب صورت قصہ بیان کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پرہیزگار مسلمان خواب میں آں حضرتؐ کی زیارت کو کس قدر اہمیت دیتے ہیں:
ایک رات میں نبی کریمؐ پر مقررہ تعداد میں درود وسلام بھیجنے کے بعد سو گیا۔ میں ایک کمرے میں تھا چناں چہ میں نے حضورؐ کو دروازے سے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔اس وقت پورا کمرہ بقعہ نور بن گیا۔ پھر آپؐ میری طرف بڑھے اور فرمایا: ''اپنا منہ ادھر کرو جس نے مجھ پر کثرت سے درود بھیجا ہے تاکہ میں اسے چوم سکوں۔'' میں نے شرم وحیا کے باعث منہ کے بجائے اپنا چہرہ حضورؐ کی طرف کر دیا اور آپؐ نے میرے گال چوم لیے۔ پھر میں کانپتا ہوا نیند سے بیدار ہو گیا اور میری بیوی بھی، جو میرے قریب سوئی ہوئی تھی، جاگ گئی۔ آں حضرتؐ کی خوشبو سے پورا گھر معطر ہو گیا۔ رسول اللہؐ کے چومنے کے باعث آٹھ دن تک میرے رخسار سے خوشبو آتی رہی۔ میری بیوی عطر بیز خوشبو کو ہر روز سونگھتی رہی۔

-(Padwick: Muslim Devotions, pp.149-50)

ایک اور واقعے میں نبی کریمؐ نے خواب میں ایک ترک خوش نویس سے کہا کہ وہ اپنی بقیہ زندگی دلائل الخیرات لکھنے میں گزارے۔ (مستقیم زادہ: تحفۃ الخطاطین صفحہ ۱۰۵)۔ یہ کتاب حضورؐ کے لیے دعاؤں پر مشتمل ہے جو رسول کریمؐ کی معجزانہ سرگرمیوں، خاص طور پر اپنی امت کی شفاعت کرانے اور مسلمانوں کی طرف سے آپؐ پر درود وسلام بھیجنے کے پہلو کو اجاگر کرتی ہے۔

حضرت محمدؐ، شافع محشر اور حضورؐ پر درود و سلام بھیجنا

کئی برس پہلے Muhammad: A Mercy to All the Nations نام سے ایک کتاب لکھی گئی جس میں دین اور ایمان کے ضمن میں نبی کریمؐ کی حیثیت پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ ۱۹۳۷ء میں شائع ہونے والی اس کتاب کا تعارف آغا خان نے لکھا تھا۔ جن احادیث میں حضورؐ کی شفقت و رافت، رحم دلی اور ملائمت کو اجاگر کیا گیا ہے، وہ قرآن کریم کی اس آیہ مبارکہ کی عملی تفسیر ہیں جس میں کہا گیا ہے: ''اور ہم نے آپؐ کو تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے۔'' (سورہ الانبیا آیت ۱۰۷)۔ ''آپؐ کو رحمت کا چوغہ پہنایا گیا'' نجم رضی لکھتا ہے: ''رحمت کے اوصاف سے سرفراز ہونے کے بعد آپؐ کو زمین پر رہنے والی مخلوق کے لیے بھیجا گیا۔'' (Razi: The Path of God's Bondsmen, p.325)۔ چناں چہ آں حضرتؐ کا پیروکار بلا تامل آپؐ پر بھروسا کرتا ہے اور اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ نبی کریمؐ مردہ دلوں کو زندہ اور ان لوگوں کی حفاظت کر سکتے ہیں جو آپؐ سے محبت کرتے ہیں۔ (ابونعیم: دلائل النبوت باب اول)۔

مشرق کے شاعروں نے حضورؐ سرورِ کونین کی اس خصوصیت کے لیے ''ابرِ رحمت'' یا ''رحمت کی برسات'' کا نہایت عمدہ اور قابلِ تعریف استعارہ دریافت کیا ہے۔ اناطولیہ اور مسلمانوں کے دوسرے مشرقی ملکوں کے دیہی علاقوں میں بارش کو اب بھی ''رحمت'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے کیوں کہ بارانی علاقوں میں زمین کی زرخیزی، اچھی فصل اور مویشیوں کی بہبود کا انحصار مکمل طور پر بارش پر ہے۔ غرض یہ ایک منطقی بات ہے کہ رسول کریمؐ کی ذات اقدس کو اس منافع بخش بادل اور برسات کی تمثیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو اس زمین کے تمام خطوں کو سیراب اور مینہ کے چھینٹوں سے مضطرب دلوں کو امن اور سکون کی دولت سے سرفراز کرتی ہے، ایسے دلوں کو جو خشک کھیتوں سے گہری مماثلت رکھتے ہیں۔ جامیؔ نے اس ابرِ رحمت کی تعریف و توصیف کی ہے جو ''فیاض اور کشادہ دل کرے'' سے بارش برسا کر تشنہ اور پیاسے عاشقوں کو سیراب کرتا ہے۔ اور ہندوستان کے غالبؔ نے ایک نصیحت آمیز نظم ابرِ گہربار لکھ کر رسول کریمؐ

کو ہدیہ عقیدت پیش کیا ہے۔ یہاں گوتم بدھ کا ذکر بے محل نہ ہوگا جسے Sadd Harma punder itea میں عفو درگزر سے بھرپور بارش سے تشبیہ دی گئی ہے۔ دراصل خدائی انوار اور لطف و عنایات کے لیے بارش کا استعارہ پورے مشرق میں عام ہے جسے صوفی روایات میں تقریباً ۹۰۰ عیسوی میں النوریؒ نے پہلی مرتبہ استعمال کیا تھا۔ اردو کے ایک شاعر ناسخ تو اس قدر آگے نکل گئے ہیں کہ انہوں نے اس سیاہ نمدے کا، جس پر حضورؐ سویا کرتے تھے، رحمت کے سیاہ بادل سے موازنہ کر دیا ہے۔ ان سے بہت پہلے رومیؒ نے اس بادل کا ذکر کیا تھا جس سے خدائی نوازشات کی بارش ہوتی ہے:

ترجمہ: اے وہ کہ تیری ذات تمام جہانوں کے لیے رحمت ہے

تو اپنے بحرِ کرم سے آدم خاکی کو موتیوں سے نوازتا اور مچھلیوں کو چین عطا کرتا ہے

ابرِ کرم کی غالباً سب سے خوب صورت تفصیلات سندھی شاعر شاہ عبداللطیفؒ (وفات ۱۷۵۲ عیسوی) نے رسالو کے باب سر سارنگ میں بیان کی ہیں۔ انہوں نے بادلوں کے زمین کے قریب آنے اور بنی نوع انسان، جانوروں اور درختوں میں موجود بادل کے لیے بے پناہ تڑپ کی حقیقت پسندانہ عکاسی کی ہے اور حیات بخش بارش کو اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ بارش سے متعلق مترنم گیت کے آخر میں وہ اچانک ابرِ کرم سے مخاطب ہو جاتے ہیں جس سے مراد حضور سرورِ کائناتؐ کی ذات اقدس ہے:

ترجمہ: آج شمال کی جانب سے ہوا آ رہی ہے

اور کوئل گلہ شکوہ کر رہی ہے

کسانوں نے ہل چلانے بند کر دیے

چرواہا مسرور دکھائی دے رہا ہے

آج میرے محبوب نے

بادلوں کے کپڑے پہن لیے ہیں

آج شمال کی جانب سے ہوا آ رہی ہے

اور بادل، جن کی رنگت اس کے سیاہ بالوں جیسی ہے

وہ میری دلہن جیسے سرخ کپڑوں میں ملبوس ہے

بجلی کی گرج چمک جیسے سرخ ملبوسات!

یہ بارش برسانے والی ہوا

میرے دور افتادہ محبوب کو میرے قریب لا رہی ہے

چوں کہ یہ بادل رسول کریمؐ کے روضہ مبارک سے آئے ہیں، اس لیے لازم ہے کہ ان کا رخ یقیناً سندھ کے پیاسے صحرا کی جانب ہوگا:

ترجمہ: اے بادلو خدا کے لیے

پیاسے پر لطف وکرم کی بارش برساؤ

تا کہ جوہڑ پانی سے لبالب بھر جائیں

اناج سستا ہو جائے

زمین زرخیز ہو جائے

اور کسان خوش ہو جائیں

یہ ساری مخلوقات بادلوں اور بارش کے متعلق سوچ رہی ہیں

ہرن، انسان اور بھینسیں

جنگلی مرغابیاں اور بطخیں بادلوں کی منتظر ہیں

مینڈک شکایت کرتا ہے

سمندر کے جھینگے

سارا دن سمندر سے باہر نکل کر آسمان کی طرف دیکھتے رہتے ہیں

ہاں تالابوں کو پانی سے بھر دو

تا کہ کسان خوش ہو جائیں

بادل قطاروں میں کھڑے ہو گئے

بجلی چمکنے لگی

میں گرج چمک سے بہت مسرور ہوں

سیاہ بادلوں کی اور سے

بوندا باندی شروع ہو گئی ہے

جو دلوں کو نم کے غبار سے دھو رہی ہے

میرا آقا میری حفاظت کرے گا، میں خدا پر بھروسا کرتا ہوں

میرا محبوب سجدہ ریز ہو کر گڑگڑا کر دعا کرے گا

اس لیے میں خدا پر بھروسا کرتا ہوں

محمدؐ، جو معصوم اور پاک ہیں، اپنی امت کی شفاعت کریں گے
جب نقارہ بجے گا تو سب کی آنکھیں کھل جائیں گی
اس روز سب نیکوکار ایک جگہ اکٹھے ہوں گے اور محمدؐ پوری شان و شوکت کے ساتھ
ہر ذی روح کو لے کر محسن اعظم کے دروازے پر لے جائیں گے
اور خدا آپؐ کی عزت و توقیر کرے گا اور ہمارے تمام گناہوں کو معاف کردے گا
پس میں خدا پر ہی بھروسا کرتا ہوں

اسی ''سر سارنگ'' کے ایک اور بند کے آخر میں اس ابر کرم کی زیادہ شاعرانہ تشریح کی گئی ہے جو استنبول سے لے کر دہلی اور جیسلمیر تک محیط ہے۔ شاعر اپنے دیس صوبہ سندھ پر رحمتوں کی بارش کے لیے دعا کرتا ہے۔ (عبداللطیفؒ: شاہ جو رسالو، بند ۷، ۱۰، ۲۹، ۳۰، ۳۳، ۳۴)۔

لیکن اس نظم میں شاہ عبداللطیفؒ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے رحمت للعالمینی کے کردار کے مقابلے میں ایک اور نہایت اہم اور مرکزی وصف (یعنی حضورؐ کے امت کے لیے) شافع محشر ہونے کا تذکرہ کرتا ہے جو آپؐ کی رحمۃ للعالمینی کی خصوصیت کا لازم و ملزوم حصہ ہے البتہ آپؐ کے اس رول کو قرآن کریم سے براہ راست اخذ کرنا مشکل ہے۔ قرآن پاک کی سورہ البقرہ کی آیۃ الکرسی (۲۵۵) میں واضح کیا گیا ہے: ''کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے سامنے شفاعت کر سکے۔'' لیکن اس آیہ مبارکہ سے یہ مطلب اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریمؐ کو شفاعت کرنے کی خصوصی طور پر اجازت دے رکھی ہے کیوں کہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۷۹ میں واضح طور پر یہ کہا گیا ہے کہ ''عنقریب آپؐ کا رب آپؐ کو مقام محمود پر کھڑا کرے گا۔'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ کو قیامت کے دن امت کی شفاعت کرنے کا اختیار ہوگا۔ پھر سورہ المومن کی ساتویں آیت میں کہا گیا ہے کہ ''عرش کے اٹھانے والے اور اس کے آس پاس کے (فرشتے) اپنے رب کی تسبیح حمد کے ساتھ ساتھ کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان والوں کے لیے استغفار کرتے ہیں، کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! تو نے ہر چیز کو اپنی بخشش اور علم سے گھیر رکھا ہے، پس تو انہیں بخش دے جو توبہ کریں اور تیری راہ کی پیروی کریں اور تو انہیں دوزخ کے عذاب سے بھی بچالے۔''

مسلمانوں کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ قیامت کے روز کئی دوسرے شفاعت کرنے والے بھی ہوں گے۔ عام عقیدہ یہ ہے کہ قیامت کے دن قرآن کریم ان اہل ایمان کے لیے خود شفاعت کرے گا جو محبت اور خلوص سے اس کی تلاوت کرتے رہے ہیں۔ اس امید کا اظہار ان دعاؤں میں کیا جاتا ہے جو قرآن حکیم کی تلاوت مکمل کرنے (ختم) پر مانگی جاتی ہیں۔ یہ دعائیں عام طور پر قرآن مجید کے آخر میں درج ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ نیک لوگوں کے اچھے اعمال اور

کلمہ شہادت بھی، جس کا بار بار ورد کیا جاتا ہے، قیامت کے دن شفاعت کرے گا۔ شہید بھی بعض لوگوں کے لیے خدا کے حضور شفاعت کرے گا۔ اسی طرح کم سنی میں فوت ہو جانے والے بچے اپنے والدین کے حق میں شفاعت کریں گے۔ لیکن یہ صرف جزوی اور مبہم امکانات ہیں اور مکمل شفاعت کا خصوصی اختیار صرف اور صرف نبی کریمؐ کو حاصل ہے، آپؐ ہی شافع ہیں اور یہ حضورؐ کا امتیازی وصف ہے۔ چناں چہ تمام اسلامی ملکوں، خاص طور پر ہندوستان میں مسلمان لڑکوں کو محمد شفیع یا شفاعت کہا جاتا ہے۔

رسول کریمؐ کے شافع محشر ہونے کا نظریہ اسلام میں شروع ہی سے رائج ہو گیا تھا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ثناخوان حسانؓ بن ثابت کے بعض اشعار مسلمانوں کی اس امید کے آئینہ دار ہیں کہ آپؐ حشر میں ان کی شفاعت کریں گے۔ لیکن قیامت کے دن امت کی شفاعت کرنے کا عندیہ قدیم زمانے میں مرتب ہونے والی کتب احادیث میں ملتا ہے جن میں آں حضرتؐ کے شافع محشر ہونے کے خصوصی وصف کو اجاگر کیا گیا ہے۔ (Andrae: Die Person Muhammads, p.p.236-38)۔ ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو ایک پہاڑ پر جمع کرے گا۔ اس دن سورج انسانوں کے بہت قریب آ جائے گا اور وہ غم اور صدمے سے نڈھال ہوں گے۔ آخر وہ سب اس بات پر متفق ہو جائیں گے کہ وہ کسی ایسی شخصیت کو تلاش کریں جو خدا کے حضور ان کی شفاعت کر سکے۔ چناں چہ سب لوگ حضرت آدمؑ کے پاس جا کر یوں کہیں گے:

''آپ تمام انسانوں کے باپ ہیں۔ خدا نے اپنے ہاتھوں سے آپ کو تخلیق کیا اور آپ میں اپنی روح ڈالی۔ خدا نے فرشتوں کو آپ کے سامنے سجدہ ریز کیا۔ آپ خدا کے پاس جا کر ہماری شفاعت کریں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہم کس قدر پریشان حال ہیں!''

لیکن آدم علیہ السلام یہ جواب دیں گے: ''آج خدا اس قدر غصے میں ہے کہ اس سے پہلے کبھی اتنا طیش میں نہیں آیا اور نہ ہی آئندہ کبھی اس قدر خشم آلود ہو گا۔ خدا نے مجھے درخت سے (کھانے کو) منع کیا تھا لیکن میں نے اس کی حکم عدولی کی تھی نفسی، نفسی!'' (ہائے میری جان! ہائے میری جان!)۔

پھر ساری مخلوق ہر ایک پیغمبر کے پاس جائے گی لیکن ماسوائے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے باقی تمام پیغمبروں کو اپنی کوئی نہ کوئی حکم عدولی یا گناہ یاد آ جائے گا تاہم عیسیٰ علیہ السلام بھی ''نفسی، نفسی!'' کہہ کر خدا کے حضور جا کر شفاعت کرنے سے انکار کر دیں گے۔ اس کے بعد سب لوگ رسول کریمؐ کے پاس جا کر عرض کریں گے: ''اے محمدؐ! آپؐ خدا کے پیغمبر اور خاتم النبیین ہیں۔ خدا نے آپؐ کے تمام پچھلے اور اگلے گناہ معاف کر دیے ہیں۔ آپؐ اپنے پروردگار سے ہماری شفاعت کریں!'' چناں چہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رضامند ہو جائیں گے:

پھر میں عرش کے نیچے پہنچ کر سجدے میں سر رکھ دوں گا اور اللہ تعالیٰ کی ایسی حمد و ثنا بیان کروں گا جس پر آج تا دم نہیں ہوں۔ غرض اللہ تعالیٰ مجھ پر اپنے ایسے محامد ظاہر فرمائے گا جو کسی دوسرے پر ظاہر نہیں فرمائے ہوں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''اے محمدؐ! اپنے سر کو اوپر اٹھاؤ اور عرض کرو، تمہاری بات سنی جائے گی اور مانگو کہ تمہیں عطا ہوگا اور شفاعت کرو کہ تمہاری شفاعت قبول ہے!''

میں اپنا سر اٹھاؤں گا اور عرض کروں گا: ''یا رب امتی! یا رب امتی!''

اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''اپنے ان امتیوں کو، جن کا حساب پاک ہے، دائیں جانب والے دروازوں سے داخل کر دو اور باقی دروازوں سے داخل ہونے والوں میں وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی شریک ہیں۔''

مختلف انداز میں بیان کی جانے والی یہ حدیث مسلمانوں کے لیے ہمیشہ سے تقویت اور ڈھارس کا باعث بنی ہوئی ہے حالاں کہ مختلف زمانوں میں اس مسئلے پر بحث و تمحیص ہوتی رہی ہے کہ حضورؐ قیامت کے دن کن لوگوں کی شفاعت کریں گے؟ آں حضرتؐ کی اس حدیث مبارکہ میں اس سوال کا واضح جواب موجود ہے: ''میری شفاعت تو امت کے گناہ گاروں اور عصیاں شعاروں کے لیے ہے۔'' (فروزانفر: احادیث مثنوی)۔ اور ہم میں سے ایسے کتنے کم لوگ ہوں گے جنہوں نے کوئی سنگین گناہ نہ کیا ہو؟

مولانا رومیؒ نے ایک عجیب و غریب قصے میں اس حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے قارئین کو بتایا ہے کہ عظیم صوفی حلاجؒ کو پھانسی کی سزا اس کے اس قول کی وجہ سے ملی تھی: ''اگر میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پکڑ سکتا تو میں آپؐ کی سرزنش کرتا۔'' حلاجؒ نے یہ جملہ اس لیے کہا کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ رسول کریمؐ نے اپنی شفاعت کو صرف مسلمانوں تک محدود رکھا ہے اور یہ کہ آپؐ زمین پر رہنے والے ہر شخص کی شفاعت نہیں کریں گے۔ گو کہ آں حضرتؐ نے خواب میں حلاجؒ کی اس شکایت کا جواب دے دیا تھا، اس کے باوجود حلاجؒ کو اپنے گستاخانہ لفظوں کی سزا مل کر رہی! (افلاکی: مناقب العارفین، صفحہ ۲۸۵)۔

نویں صدی میں معتزلی مکتبہ فکر نے حضور سرور عالمؐ کے شافع محشر ہونے کے رول سے اختلاف کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ آں حضرتؐ کا یہ وصف نظام کائنات کے دو مرکزی اصولوں میں سے ایک اصول کے منافی ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے کلی انصاف سے ہے۔ اس کے باوجود رسول کریمؐ کے شافع محشر ہونے کا عقیدہ مجموعی طور پر مسلمانوں کی مذہبی زندگی کا مرکز و محور رہا ہے۔ یہ عقیدہ اس ایمان کا آئینہ دار ہے کہ خدائی رحمت اور عفو و درگزر کا اظہار خدا اور نبی کریمؐ کی ذات گرامی کے ذریعے ہوتا ہے اور یہ کہ حضورؐ کے شافع محشر ہونے کا تعلق آپؐ کی رحمت للعالمینی کی حیثیت سے ہے۔ ابو عبداللہ الترمذیؒ نے اپنی کتاب نوادر الاصول میں درست لکھا ہے کہ خدا نے دوسرے پیغمبروں کو

ان کی امتوں کے پاس عطیے یا تحفے کے طور پر بھیجا تھا اور خدا یہ تحفہ اس وقت دیتا ہے جب وہ اپنے بندوں کو کمزور، مظلوم اور بے کس پاتا ہے۔ لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیثیت پچھلے تمام پیغمبروں سے بڑھ کر ہے، آپؐ بنی نوع انسان کے لیے ہدیے کے طور پر مبعوث ہوئے ہیں جس کا مطلب ہے محبت کا تحفہ! خدا اپنے بندوں کو یہ ہدیہ ان کی عزت و تکریم میں اضافے اور ان کے دلوں کو جیتنے کے لیے عطا کرتا ہے۔ پہلی قسم کے تحفے کو وصول کرنے والا شخص احسان مند ہے جب کہ دوسری نوع کا تحفہ لینے والا فرحت اور دل جوئی کے جذبات سے سرشار ہوتا ہے۔ (حکیم الترمذی، نوادر الاصول، صفحہ ۲۹۴)۔

رسول اللہؐ کے اس اعلیٰ اور رفیع الشان مرتبے کی اہمیت کا اس بات سے بھی عندیہ ملتا ہے کہ مسلمان اپنی بعض دعاؤں میں خداوند تعالیٰ کے حضور خصوصی طور پر یہ استدعا کرتے ہیں کہ وہ شافع محشر کی حیثیت سے آپؐ کا مقام برقرار رکھے اور آپؐ کو صحیح معنوں میں مسلمہ شفیع بنائے۔ ایک دعا میں کہا گیا ہے:

اے خدایا! میں تجھ سے رسول پاک کا شافع محشر کا درجہ اور تجھ پر آپؐ کا یقین اور تیرے قرب کا شوق برقرار رکھنے کا سوال کرتا ہوں۔ تو آپؐ کو ہمارا وسیلہ اور میرے، میرے والدین اور تجھ پر ایمان لانے والے تمام مسلمانوں کے لیے شفاعت کا ذریعہ بنا۔ (Padwick: Muslim Devotions, p.411)۔

مراکش کے صوفی الجزولیؒ نے اپنی مقبول کتاب دلائل الخیرات میں حضور نبی کریمؐ پر درود بھیجنے کے لیے یہ دعا لکھی ہے:

اے خدایا! ہمارے آقا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہمارا سب سے قابل اعتماد سفارشی اور سب سے پہلا شافع بنا اور آپؐ کو ان لوگوں میں، جن کی سفارش قبول ہوتی ہے، سب سے پسندیدہ بنا تاکہ آپؐ اپنی امت اور اپنے پیروکاروں کی شفاعت کر سکیں ـــــــــ ایسی شفاعت جس میں تمام پہلے اور پچھلے لوگ شامل ہوں۔ (Padwick: Muslim Devotions, p.422)۔

رسول کریمؐ کے شافع محشر ہونے سے متعلق ابتدائی حدیث کا سب سے متاثر کن پہلو یہ ہے کہ حضورؐ کی شفاعت کسی فرد واحد کے لیے نہیں، پوری امت کے لیے ہے۔ اس ضمن میں درج ذیل روایت کے الفاظ کو بار بار دہرایا جاتا ہے:

خدا نے کائنات کی تخلیق سے ایک ہزار سال پہلے ایک دستاویز لکھی، پھر اسے اپنے تخت پر رکھ دیا اور یہ اعلان کیا ''اے محمدؐ کی امت! دیکھو میری رحمت میرے غضب سے سبقت لے گئی ہے۔ میں تمہارے مانگنے سے پہلے تمہیں دیتا ہوں، تمہیں معافی مانگنے سے پہلے معاف کر دیتا ہوں، تم میں سے جو بھی شخص مجھے ملتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ پرستش کے لائق

صرف خدا کی ذات ہے اور محمدؐ اس کے رسول ہیں، میں اسے جنت میں پہنچا دوں گا۔ (Andrae: Die Person Muhammads, p.243)

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نبی کریمؐ کے بارے میں دوسرے حقائق اور ابتدائی حالات کے علاوہ آپؐ کے شافع محشر ہونے کا عقیدہ بھی فروغ پانے لگا۔ اس سلسلے میں اس حدیث مبارکہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے جس میں کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن آں حضرتؐ لواالحمد (حمد کا پرچم) اٹھائے ہوں گے۔ بعد میں آنے والے شاعروں نے اس پرچم کا بڑی محبت سے تذکرہ کیا جس کے نیچے پوری امت محمدیہ جمع اور قیامت کی ہولناکیوں سے محفوظ ہوگی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپؐ سے پہلے مبعوث ہونے والے تمام پیغمبر بھی حضورؐ کے جھنڈے تلے ہوں گے۔ (یہاں گوئٹے کا ذکر بے محل نہ ہوگا جس نے پیغمبرانہ پیغام کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ پیغمبر لوگوں کو اپنے پرچم کے نیچے جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے اسلام کے لواالحمد کے نظریے کی ابتدائی صورت سامنے آجاتی ہے۔ (Goethe: West Ostlicher Divan)

مسلمانوں نے حضورؐ سے شفاعت کی التجا کرنے کے لیے رقت انگیز الفاظ اور پرسوز جملے دریافت کر لیے ہیں:

ترجمہ: آپؐ ہی اس وقت ہماری شفاعت کرنے والے ہیں

جب تنگ راستے سے پاؤں پھسل رہے ہوں گے تو آپؐ ہی سے وسیلے کی توقع ہوگی

پھر جب مجھے قبر میں رکھ دیا جائے گا تو آپؐ ہی میرے شافع ہوں گے

کیوں کہ قبر میں میں آپؐ کا مہمان ہوں گا اور مہمان کی توقیر کی جاتی ہے

(افلاکی: مناقب العارفین نیز Padwick: Muslim Devotions, p.44)۔

فاضل اسکالروں، وجد آور صوفیوں، مقبول مطربوں اور مغنی شاعروں، ہوشیار صاحب تدبیر لوگوں نے اس امید کے ساتھ ان گنت شعر لکھے ہیں کہ قیامت کے روز آں حضرتؐ ان کی شفاعت کریں گے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے بعض اوقات اعلیٰ فنی مہارت کے ساتھ قافیے استعمال کیے ہیں، کبھی آہ وفغاں کی ہے اور کبھی مشرق کی روایتی مہمان نوازی (جس کا ابھی اوپر تذکرہ ہوا ہے) کے لیے سادہ الفاظ کا سہارا لیا ہے۔ عقیدت مند مسلمان خاتم النبیینؐ کے مہمان ہونے کا دعویٰ اور کوثر کے فرحت بخش حوض سے ایک گھونٹ پانی پینے کی توقع کرتے ہیں۔ (اے ایس حسین: آداب الصوفی، صفحہ ۲۳۵)۔ یہ بات قابل فہم ہے کہ نعتیہ اشعار اور مناقب لکھتے وقت بعض قابل تقلید ضابطے اور ترکیبیں وضع کی گئی ہیں اور نالہ وفغاں کو مسلسل دہرانے کے لیے یک رنگی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسلام کی مذہبی شاعری کی کئی شاخیں حد درجہ دل سوز، خالص اور رقت انگیز ہیں جن میں تمام مخلوقات سے افضل حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

سے التجا کی گئی ہے کہ آپؐ اس ہولناک لمحے میں، جب ہر ذی روح کو داورِ حقیقی کے سامنے پیش ہونا پڑے گا، وسیلہ بن کر خدا کے حضور شفاعت کریں۔ کئی شاعروں نے اس بات پر شکریہ ادا کیا ہے کہ وہ امت مرحومہ کے فرد ہیں۔ رسول کریمؐ کے شافع محشر ہونے کا یہی وہ عقیدہ ہے جس کی وجہ سے مسلمان کے لیے موت آسان ہو جاتی ہے چناں چہ ہندوستان کے عصر حاضر کے ایک مسلمان شاعر شکیل بدآیونی نے حضورؐ کی خدمت میں گلہائے عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ہے:

تمنا ہے کہ مرتے وقت بھی ہم مسکراتے ہوں
زباں پر یا محمدؐ ہو جو اس دنیا سے جاتے ہوں
نہ کیوں اونچا ہو سارے انبیاؑ سے مرتبہ ان کا
سفارش کر کے جو امت کو اپنی بخشواتے ہوں

علم الٰہیات کے ماہرین نے اس ضمن میں اس مسئلے پر خاصی بحث و تمحیص کی ہے کہ آیا رسول کریمؐ کو یا رسول اللہؐ، یا حبیب اللہؐ یا اس قسم کے دوسرے القابات سے پکارا جا سکتا ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ آپؐ زندہ اور حاضر و ناظر ہیں؟ گو کہ پکے اور کٹر روایت پسند لوگ حضورؐ کو اس طرح مخاطب کرنے کے خلاف ہیں لیکن علمائے دین کی اکثریت نے اس کی اجازت دی ہے چناں چہ ۱۹۸۲ء میں جنوبی افریقا میں اس مسئلے پر جو فتویٰ دیا گیا، اس میں کلاسیکی دور کی مستند روایات اور ذرائع کے حوالے سے کئی مثالیں دی گئی ہیں جن میں ان مصنفوں نے، جن کے تقوے اور پرہیز گاری میں کوئی شک و شبہ نہیں، آں حضرتؐ کے لیے صیغہ واحد حاضر استعمال کیا ہے۔ اس ضمن میں قرون وسطیٰ کے شعرا (جن میں مولانا رومیؒ شامل ہیں) بلکہ دیوبند مکتب فکر کے کئی علما نے بھی نبی کریمؐ کو صیغہ واحد حاضر میں خطاب کیا ہے۔ (مسلم ڈائجسٹ جنوری فروری ۱۹۸۱ء، صفحات ۵۵ تا ۵۸)۔ اور واقعہ یہ ہے کہ چند نظمیں ایسی ہیں جن میں رسول کریمؐ پر درود وسلام بھیجا گیا ہے یا حضورؐ کی شفاعت کے لیے استدعا کی گئی ہے البتہ ان نظموں میں صیغہ واحد حاضر استعمال نہیں کیا گیا۔ یہ نظمیں بھی آں حضرتؐ سے محبت اور عقیدت رکھنے والوں کے جذبات کو مہمیز دیتی ہیں۔

دنیائے اسلام میں شاید ہی ایسا کوئی مصنف ہو، خواہ وہ شاعر ہو یا اسکالر، بدعتی اور بھنگی ہو یا شرابی جس نے نبی کریمؐ سے شفاعت کی درخواست نہ کی ہو یا مولانا جامیؒ کی شعری اصطلاح میں ''معافی کی خواستگار سرزمین میں حضورؐ پر درود وسلام کا بیج نہ بویا ہو۔'' (جامیؒ ہفت اورنگ صفحہ ۴۵۱)۔ ان میں سے بعض لوگ، جو خاص طور پر آں حضرتؐ کے بہت قریب تھے، اپنی معروضات پیش کرنے کے سلسلے میں بہت آگے نکل گئے جیسا کہ احمد التجانیؒ نے نہایت لجاجت سے استدعا کی ہے: ''میں اپنے آقا محمد رسول اللہؐ سے التجا کرتا ہوں کہ آپؐ مجھے کسی حساب کتاب کے بغیر جنت میں داخلے کی ضمانت دیں۔ وہ اپنے پورے خاندان، اپنے آباو اجداد اور پیروکاروں کے لیے بھی یہی دعا کرتے ہیں۔

(Abu Nasr: The Tijaniyya, p.43)۔ ان دعاؤں کا مجموعی تاثر گناہوں سے توبہ و استغفار ہے۔ شمالی افریقا کا تاریخ کا عظیم فلسفی ابن خلدون حضورؐ کی خدمت میں یوں ملتمس ہے:

ترجمہ: مجھے اپنی شفاعت سے بہرہ مند کیجیے جس کی مجھے توقع ہے

میرے بدنما گناہوں سے آلودہ نامہ اعمال کے بجائے مجھے خوب صورت صفحہ عنایت کیجیے

ابن خلدون سے ایک سو سال پہلے عفیف الدین الطلسمانی نامی صوفی، جسے کٹر مسلمان اس کے انتہا پسندانہ ''مشرکانہ'' خیالات کے باعث شک و شبہے کی نظروں سے دیکھتے تھے، شکستہ دلی اور مایوسی کے عالم میں آں حضرتؐ سے اس طرح استدعا کرتا ہے:

ترجمہ: میں نے کثرت سے گناہ کیے ہیں لیکن شاید

آپؐ کی شفاعت مجھے جہنم کے شعلوں سے بچا لے

نظم کے آخر میں حضورؐ سے رحم کی درخواست کی گئی ہے:

ترجمہ: میں نے نظر کرم کی امید میں آپؐ سے دعا مانگی ہے

نعوذ باللہ! نعوذ باللہ! ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ آپؐ سے سوال کیا جائے اور آپؐ جواب نہ دیں

سندھ کے شاہ عبداللطیفؒ نے اپنے شعری مجموعے رسالو کا آغاز اس طرح کیا ہے:

ترجمہ: جو لوگ یہ کہتے ہیں: ''خدا وحدہ لاشریک ہے''

ان کے دلوں میں شافع محشر کی حیثیت سے حضورؐ کی محبت پرورش پاتی ہے

کوئی بری جگہ

ان کا مقدر نہیں ہوسکتی

ان کے تھوڑی دیر بعد اردو کا سب سے بڑا غنائیہ شاعر میر تقی میرؔ (وفات ۱۸۱۰ء) اپنے دوسرے دیوان کے شروع میں اس طرح نغمہ سرا ہے:

جب تلک تاثیر کا تھا کچھ گماں   گہ قرآں خواں میرؔ گہ سبحہ خواں

وقت یکساں تو نہیں اے دوستاں   اب یہی ہے ہم زماں ورد زباں

رحمت للعالمینی یا رسولؐ

شفیع المذنبینی یا رسولؐ

اور چترال (پاکستان) کے پہاڑوں میں عہد حاضر کا ایک شاعر مقامی زبان خوور میں آں حضرتؐ کے لیے

لکھی گئی نعت کے مقطع میں کہتا ہے:

ترجمہ: یہ گنہگار آپؐ کی شفاعت کا منتظر ہے!

عالم اسلام کے کئی حکمرانوں نے بھی، جو زہد اور تقوے میں درجہ کمال پر پہنچے ہوئے تھے، حضور نبی کریمؐ کو ہدیہ عقیدت پیش کیا ہے۔ ان میں مصر کا مملوک سلطان قیط بے (وفات ۱۴۹۶عیسوی) بھی شامل ہے جس نے ترک زبان میں ایک سادہ طربیہ نظم میں کہا ہے:

ترجمہ: آپؐ خدا کے محبوب ہیں

سارے دکھ دردوں کے چارہ گر!

دیکھو! یہ بے مثل اور عالی ظرف ہیں

میدان شفاعت کے درمیان کھڑے ہیں!

درویشوں کے بعض سلسلوں کی محافل ذکر میں آں حضرتؐ سے شفاعت کی درخواست کو اجتماعی دعائے مغفرت کا درجہ حاصل ہے۔ اسی طرح شمالی افریقا کے بھک منگا سلسلے کی محفلوں میں بھی رسول اللہؐ سے شفاعت کے لیے دعا کی جاتی ہے۔ ترکی کی مذہبی شاعری میں یونس ایمرے (وفات ۱۳۲۱عیسوی) کے زمانے سے اسی طریق کار پر عمل ہو رہا ہے اور درویشوں کی محفلوں میں اسی طرح شافع محشرؐ سے مغفرت اور بخشش کی دعائیں مانگی جاتیں اور یونس ایمرے کے اشعار پڑھے جاتے ہیں۔ سندھی، پنجابی یا اردو میں بھی یہ شعر کورس کی شکل میں پڑھا جاتا ہے:

ترجمہ: تمام جہان آپؐ کی تمنا کرتے ہیں

اے محمدؐ! ہماری شفاعت کیجیے

شعر گوئی کی دوسری اصناف میں بھی اسی طرح نعتیہ اشعار کہے جاتے ہیں، مثال کے طور پر چھ مصرعوں پر مشتمل مسدس کے آخری شعر میں رسول کریمؐ سے رحم کی استدعا کی جاتی ہے۔ علاقائی روایت میں اس کی ایک مثال پنجابی کی وہ مسدس ہے جس کے آخر میں یہ مصرع دہرایا جاتا ہے:

ترجمہ: یا حضرتؐ! دونوں جہانوں میں بس آپؐ ہی ہمارا سہارا ہیں۔ (تحفہ رحیم یار خاں، صفحات ۱۳تا۱۷)۔

سندھ کے مقام لنواری شریف میں سلسلہ نقشبندیہ کے پیروکار بلوچی شاعر حمل فقیر لغاری (وفات ۱۸۷۲ء) نے سندھی میں لکھی جانے والی ایک نعت میں کوئی ۱۴۱ مقامات کا تذکرہ کیا ہے جہاں نبی کریمؐ کا فیض عام جاری ہے۔ یہ سلسلہ انگلستان سے کاٹھیاواڑ، بالائی سندھ، بمبئی سے لکھنو اور پونا سے کنعان تک محیط ہے۔ نعت کے ہر آخری مصرعے میں رسول کریمؐ سے رحم اور مغفرت کی دعا کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر:

ترجمہ: آپؐ کا نقارہ توران میں بجتا ہے

فارس، عرب اور ایران میں

مکہ، مصر اور ملتان میں

یا مصطفیؐ! مجھ پر کرم کیجیے

بلگھار پر بادل برس رہے ہیں

خزنہ، گنگا اور گرنار

مسقط، بمبئی اور مالابار

یا مصطفیؐ! مجھ پر کرم کیجیے

بابل، بخارا اور بلخ

خیوہ، خراسان اور خلخ

چیونٹیاں اور ملخ (ٹڈی دل) بھی آپؐ کے حکم کی تعمیل کرتی ہیں

یا مصطفیؐ! مجھ پر کرم کیجیے

۸۱ رباعیوں پر مشتمل اس نظم کے آخر میں شاعر رسول کریمؐ سے پھر التماس کرتا ہے کہ آپؐ قیامت کے دن اس کی شفاعت کریں۔

ہندوستان میں ہندو تک سرورِ کونینؐ سے شفاعت کی درخواست کرتے ہیں چناں چہ بیسویں صدی کے شروع میں ایک سندھی لوک شاعر حضورؐ سے یوں عرض کرتا ہے:

ترجمہ: مجھے کفر کی تاریکیوں سے بچائیے

اے خدا کے رسولؐ! میری مدد کیجیے

آپؐ روشن و تاباں نور ہیں

کوئی دوسرا یا تیسرا حضورؐ کا ہمسر نہیں

اے خدا کے نبیؐ! میری مدد کیجیے

اس کا ایک ہم عصر اردو کا نامور شاعر کیفی (پنڈت برج موہن۔ مترجم) سرور کے عالم میں یہ کہتا ہے:

ہے حامی و ممدوح مرا شافعِ محشرؐ

کیفی مجھے اب خوف ہے کیا روزِ جزا کا

رسول خداؐ کے ساتھ دل و جان سے عقیدت رکھنے والے مسلمان بار بار اس بات پر غور کرتے ہیں کہ وہ قیامت کے دن نبی کریمؐ کے حفاظتی پرچم کے نیچے کس طرح پناہ لیں گے؟

ترجمہ: قیامت کے دن آں حضرتؐ مقام محمود پر اس طرح کھڑے ہوں گے
کہ شفاعت کا سبز پرچم آپؐ کے ہاتھ میں ہوگا
نیکوکار لوگ ایک دوسرے کو یہ مژدہ جاں فزا سنائیں گے
کہ محمدؐ سبز پرچم لے کر مقام محمود پر پہنچ گئے ہیں (یونس ایمرے دیوان صفحہ ۵۶۰)

اور رسول اللہؐ کے عقیدت مندوں کو اچھی طرح معلوم ہوگا کہ آگے کیا ہونے والا ہے:

ترجمہ: ''ہائے میری امت! ہائے میری امت!''
حضرت محمدؐ کی زبان مبارک پر یہی الفاظ ہوں گے (یونس ایمرے دیوان صفحہ ۵۵۹)

قرون وسطیٰ کے ترک شاعر یونس ایمرے نے ان مصرعوں میں جن جذبات کا اظہار کیا ہے، افریقا کے مسلمان بھی اس معاملے میں اس کے ہم نوا ہیں۔ سواحلی کی مذہبی شاعری میں حضور سرور کائناتؐ شافع محشر کی حیثیت سے ظاہر ہوتے ہیں جن کے پرچم تلے قیامت کے روز مسلمان فاتحانہ انداز میں جنت میں داخل ہوں گے۔ (Knappert: Swahili Islamic Poetry, 1:37)۔ اور یہی آس مسلمانوں کے حوصلے بلند رکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے کہ قیامت کے دن خداوند تعالیٰ کی حمد کا پرچم حضورؐ کے ہاتھ میں ہوگا اور مسلمان اس کے سائے میں ہوں گے۔

آں حضرتؐ کی مدح میں اشعار لکھنا اور پڑھنا مسلمانوں کی امید اور اعتماد کو تابندہ و فروزاں رکھتا ہے اور اس میں ایک طلسماتی قوت کارفرما ہے۔ چناں چہ ۱۷۰۰عیسوی کے لگ بھگ وادی سندھ کے شہر ٹھٹھہ کے غنی نے فارسی میں کہا:

ترجمہ: یہ میرا ہاتھ ہے اور محمدؐ کے چوغہ مبارک کا پلو!
یہ میری آنکھیں ہیں اور حضورؐ کے خاک پا کی دھول!

عقیدت مندوں نے، جن میں بڑے بوڑھے اور جوان سبھی شامل ہیں، غنی کی اس نظم کو دل و جان سے پسند کیا اور اسے منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے وسیلہ بنایا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ غنی کے قاری نے یہ محسوس کیا کہ یہ شعر پڑھ کر اس نے آں حضرتؐ کے چوغہ مبارک کے کونے کو تھام کر آپؐ کے قدموں کی دھول کو خاک شفا بنا لیا ہے۔ اس قسم کی شاعری کی مثالیں عام ہیں جیسے پشتو کے ایک مقبول رزمیہ گیت میں، جس کے ہر بند میں یہ مصرع دہرایا جاتا ہے، کہا گیا ہے:

ترجمہ: اے نبیؐ! قیامت کے دن
میرا ہاتھ آپ کا دامن پکڑے ہوئے ہوگا

-(Darmesteter: Chants Populaires des Afghans, p.88)

شاعروں نے یہ امید ظاہر کی ہے کہ ان کا نعتیہ کلام اس گنہگار اور رسول کریمؐ کے درمیان، جو اپنے ابر کرم سے مصنف کے گناہوں کو دھو سکتے ہیں، سفارش کا کام دے گا۔ جدید اردو میں نبی کریمؐ کے سب سے بڑے ثنا خوان محسن کاکوروی نے، جن کی لکھی ہوئی نظم خود جبرئیل نے پڑھی ہے، ایک نظم کے مقطع میں یہ جرأت مندانہ اشعار لکھے ہیں:

صفِ محشر میں ترے ساتھ ہو تیرا مداح ہاتھ میں ہو یہی مستانہ قصیدہ یہ غزل
کہیں جبریلؑ اشارے سے کہ ہاں بسم اللہ ''سمتِ کاشی سے چلا جانب متھرا بادل''

محسن کاکوروی کو یہ توقع ہے کہ یہ نظم، جو غیر معمولی طور پر اثر انگیز ہے اور جس میں شاعر نے دو مختلف اسالیب کو نہایت مہارت کے ساتھ استعمال کیا ہے، حضورؐ کے دریائے رحمت کو جوش دلائے گی اور آپؐ اپنے اس غلام کے لیے خصوصی شفقت و رافت کا مظاہرہ کریں گے جس نے آپؐ کی شان میں یہ قصیدہ لکھا ہے۔ (کلیات نعت: مولوی محمد محسن صفحات ۹۵ تا ۱۲۳)۔ کیا حضورؐ کی مدح میں لکھی جانے والی یہ نظم ''بخشش کے پرچم اور کسی مزار پر رکھی گئی شمع'' کے مصداق نہیں ہے؟

لیکن خوب صورت نعتیہ کلام اور بخشش و مغفرت کی دعاؤں کے علاوہ متقی اور پرہیز گار عقیدت مند مسلمانوں نے کئی دوسرے طریقے بھی اختیار کیے ہیں جن کا مقصد اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ ان کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے اور نبی کریمؐ خود ان کی شفاعت کریں گے۔ ان میں سے ایک وہ مہر نبوت ہے جس کے متعلق خلیفہ ابو بکرؓ نے کہا تھا: ''یہ مہر نبوت جس کے کفن میں رکھی جائے، اس کی قبر پر عذاب نہیں ہوگا۔ خدا اس کے چھوٹے بڑے تمام گناہ معاف کر دے گا اور اس کی قبر کو روشنی سے بھر دے گا۔'' (ایس اے بخاری: جواہر الاولیا صفحہ ۲۲۹)۔ مصنف کے مطابق مہر نبوت پر اللہ تعالیٰ کے اسمائے گرامی اس طرح درج ہیں:

یا اللہ	یا رحمٰن	یا رحیم
یا کریم	یا حی	یا قیوم
یا حنان	یا منان	یا دیان
یا سبحان	یا سلطان	یا برہان

ہر چند کہ ہزاروں دعائیں اور نظمیں مسلمانوں کی اس امید کی آئینہ دار ہیں کہ نبی کریمؐ ان کی اور ان کے اہل خاندان

کی شفاعت کریں گے لیکن ان سب میں ایک واسطہ اور ذریعہ ہر چیز سے زیادہ طاقت ور ہے اور وہ ہے رسول اللہؐ اور آپؐ کی آل پر درود و سلام بھیجنا! خود قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے: ''اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اس نبیؐ پر رحمت بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! تم (بھی) ان پر درود بھیجو اور خوب سلام (بھی) بھیجتے رہا کرو۔'' (سورہ الاحزاب آیت ۵۶)۔ کیا کوئی مسلمان خدا تعالیٰ کی مثال (حضورؐ پر درود و سلام بھیجنے) سے بڑھ کر کوئی اور افضل کام کر سکتا ہے؟ مولانا رومیؔ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے: ''خدمت، پرستش اور توجہ کے یہ افعال ہم سے خود سرزد نہیں ہوتے اور نہ ہی ہم ان افعال میں آزاد ہیں......ان افعال کا تعلق خدا سے ہے، وہ ہمارے کام نہیں، خدا کے کام ہیں۔'' (Arberry: Discourses of Rumi, p.79)۔ نبی کریمؐ پر درود و سلام بھیجنے کا سلسلہ اسلام کے ابتدائی زمانے سے رائج ہے اور اسے تسلیہ، الصلوٰۃ علیٰ محمدؐ (یا جمع کی صورت میں) الصلوٰۃ شریفہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے چناں چہ ایک متقی اور پرہیز گار مسلمان آں حضرتؐ پر درود بھیجے بغیر آپؐ کا نام نہیں لیتا۔ تحریری شکل میں رسول اللہؐ کے اسم گرامی کے بعد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور انگریزی میں اکثر S لکھا جاتا ہے۔ سب سے قدیم درود، درود ابراہیمی ہے جس میں یہ دعا کی جاتی ہے: ''اے اللہ! محمدؐ اور آل محمدؐ پر اس طرح درود و صلوٰۃ بھیج جیسا کہ تو نے ابراہیمؑ اور ان کی آل پر بھیجی تھی۔'' اس طرح پیغمبر اسلامؐ کو حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ مربوط کر دیا جاتا ہے جنھوں نے مکہ میں کعبہ تعمیر کیا اور جو اسماعیل علیہ السلام کے ذریعے عربوں کے جد امجد ہیں۔ درود شریف پڑھنے کے لیے صدیوں سے کم و بیش یہی الفاظ دہرائے جا رہے ہیں۔ (Robson: Blessings on the Prophet)۔

مختلف احادیث مبارکہ میں مسلمانوں کو آں حضرتؐ پر درود بھیجنے کی اہمیت سے آگاہ کیا گیا ہے کیوں کہ خود خدا نے ایک مرتبہ رسول کریمؐ سے ان لفظوں میں خطاب کیا: ''اے محمدؐ! کیا آپؐ کو معلوم ہے کہ اگر آپؐ کی امت میں سے کوئی شخص آپؐ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے تو میں اس پر دس مرتبہ رحمتیں بھیجتا ہوں اور اگر کوئی شخص ایک مرتبہ آپؐ کو تسلیمات عرض کرتا ہے تو میں دس مرتبہ اس کو خوش آمدید کہتا ہوں؟ (غزالی: احیا العلوم الدین ۱: ۲۷۸۔۲۷۹)۔ اس خدائی وعدے کو بعد میں مزید تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا اور کہا گیا کہ اگر کوئی مسلمان ایک مرتبہ حضورؐ پر درود و سلام بھیجتا ہے تو اس کے دس درجات بلند ہوتے ہیں، اس کے نامہ اعمال میں دس نیکیوں کا اضافہ کیا جاتا ہے اور اسی طرح ان کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ حضور سرور کائناتؐ نے ایک حدیث میں خود فرمایا ہے: ''جب کوئی مسلمان مجھ پر درود بھیجتا ہے تو فرشتے بھی اس پر اسی قدر سلامتی بھیجتے ہیں۔'' (غزالی: احیا العلوم الدین ۱: ۲۷۸ تا ۲۸۰)۔

غرض اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ تسلیہ کو شروع سے نماز میں مقررہ حیثیت حاصل ہے۔ بعض دوسرے موقعوں پر بھی حضورؐ پر درود و سلام بھیجا جا سکتا ہے، مثال کے طور پر نماز کے لیے اذان سے پہلے درود شریف پڑھنے کا عمل

۱۰۷۱عیسوی سے جاری ہے۔ ایک حدیث میں مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ جمعہ کے روز وہ رسول کریمؐ پر اکثر درود بھیجا کریں کیوں کہ ''اس روز تمہارا درود و سلام میرے سامنے لایا جاتا ہے۔'' نماز میں درود پڑھنا ایک لازمی شرط ہے نیز جب تک دعا میں حضورؐ پر درود نہیں پڑھا جاتا، وہ دعا آسمانوں میں معلق رہتی ہے۔ (Andrae: Die Person Muhammads, p.280) یا جیسا کہ صوفی ابن عطاؒ (وفات ۹۲۲عیسوی) نے کہا ہے: ''دعا کی قبولیت کے لیے اس کے پشتے، پر اور وسیلے ہیں اور اس کے لیے خاص وقت مقرر ہے...... دعا کے قبول ہونے کا وسیلہ نبی کریمؐ پر درود بھیجنا ہے۔''

شروع شروع میں صلوٰۃ علیٰ محمدؐ کو غالباً آں حضرتؐ کی عظمت اور بزرگی میں اضافے کا سبب سمجھا جاتا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے حضورؐ کی تعریف و توصیف کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ حضور سرور کائناتؐ کس مقام پر درود و سلام کو سن کر لطف اٹھاتے ہیں؟ اس مسئلے پر نہایت تفصیل کے ساتھ غور و خوض کیا گیا ہے۔ بعض روایات کے مطابق تمام پیغمبر اپنی قبروں میں زندہ ہیں چناں چہ نبی رحمتؐ روضہ مبارک پر حاضری دینے والوں کے سلام کا جواب دے سکتے ہیں۔ دوسرے مفسروں کا خیال ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خدا کے قریب رہتے ہیں اور ابن عساکرؒ کا کہنا ہے کہ اگر رسول اللہؐ اپنی قبر سے سلام کا جواب دے سکتے ہیں تو آپؐ یقیناً ہر جگہ سے یہ کام کر سکتے ہیں۔ جہاں تک پیغمبروں کی حیات بعد الممات کا سوال ہے، تمام نبی پراسرار طور پر اپنی قبروں میں زندہ اور خدا کے فضل و کرم سے کھاتے پیتے ہیں۔ ابن حزمؒ کا استدلال ہے کہ رسول کریمؐ بھی زندہ ہیں کیوں کہ ہر مسلمان یہ کہتا ہے: ''محمد اللہ کے رسول ہیں۔'' یہ نہیں کہا جاتا کہ محمد اللہ کے رسول تھے۔ (ابن حزم: الفصل فی ملل والنحل ا: ۸۹،۸۸)۔

سرور کائناتؐ کے حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ ہر مسلمان کے لیے تقویت کا باعث ہے اور آپؐ کی زندہ موجودگی پر پختہ یقین کے نتیجے میں درود شریف کو حسین و مرصع الفاظ میں مزین کیا گیا ہے چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی تقریباً تمام ادبی تصانیف کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے الفاظ کے بعد رسول کریمؐ پر درود و سلام سے کیا جاتا ہے اور یہ الفاظ نہایت فنی مہارت کے ساتھ لکھے جاتے ہیں۔ غرض فارسی، ترکی اور اردو کی رزمیہ شاعری میں انہیں خصوصی مقام حاصل ہے۔

علمائے دین نے اس مسئلے پر بھی خاصی بحث و تمحیص کی ہے کہ آیا حضورؐ پر درود بھیجنا زائد از ضرورت ہے؟ چوں کہ آپؐ پہلے ہی ہر لحاظ سے اکمل و کامل ہیں، اس لیے مسلمانوں کی طرف سے آپؐ پر درود بھیجنے سے آپ کی رفعت اور عظمت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کاملیت کا کوئی وجود نہیں۔ اصل اہمیت خدا کے ساتھ موجودگی کو حاصل ہے۔ یہ الفاظ اٹھارویں صدی کے ہندوستان کے عالم دین اور مصلح شاہ ولی اللہؒ کے ہیں جنھوں نے

ان لوگوں کی سرزنش کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حضورؐ پر درود وسلام بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس طرح انہوں نے مسلمانوں کے اکثریتی طبقے کے جذبات کی ترجمانی کی ہے جس کا عقیدہ ہے کہ آں حضرتؐ پر درود بھیجنا بہت ضروری ہے۔ اپنے استدلال کا دفاع کرنے کے لیے انہوں نے امام بصیریؒ کے بردہ شریف سے یہ شعر نقل کیا ہے:

ترجمہ: رسول کریمؐ کی عظمت کی یقیناً کوئی حد نہیں

جس کسی کو منہ سے بولنے کی قدرت حاصل ہے، اسے اس کا اظہار کرنا چاہیے (ولی اللہ: تفہیمات ۱:۱۵)

آخر میں سب مسلمان مولانا رومیؒ کے اس نظریے سے اتفاق کریں گے کہ صلوٰۃ کا مطلب محبوب خداؐ کی قربت حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ وادی سندھ کا ایک لوک شاعر اس طرح رطب اللسان ہے:

ترجمہ: روح کی تسکین کے لیے آپ کا ذکر بے حد ضروری ہے

اے میرے آقاؐ! میں اپنے دکھوں کے مداوے کے لیے آپؐ پر صلوٰۃ بھیجتا ہوں

چناں چہ صوفیوں کے درمیان بھائی چارے اور تقوے و پرہیز گاری کے زیر اثر پرورش پانے والی اعلیٰ شاعری میں صلوٰۃ شریف یا جسے بھارت اور پاکستان میں درود شریف کہا جاتا ہے، ذکر کا جز ولاینفک بن گیا ہے اور عقیدت مند مسلمان لاکھوں کروڑوں مرتبہ آپؐ پر درود وسلام بھیجتے اور اسے خوب صورت دھنوں میں گاتے ہیں۔ مثال کے طور پر شاذلیہ سلسلے کی ذکر کی محفلوں میں صلوٰۃ المشیشیہ کا فجر اور مغرب کی نماز کے بعد ہر روز ورد کیا جاتا ہے۔ یہ درود وسلام قرون وسطیٰ کے مراکش کے بزرگ ابن مشیشؒ پڑھا کرتے تھے۔ تصوف کے کئی سلسلوں میں مغفرت اور بخشش کی اس قسم کی دعائیں بہت مقبول ہیں اور ان کی تاثیر اور اثر پذیری سے انکار ممکن نہیں۔

شاعری میں حضورؐ پر درود بھیجنے اور آپؐ سے شفاعت کی استدعا کرنے کا یہ طریقہ بھی رائج ہے کہ ہر بند کے آخر میں اسے ٹیپ کے مصرعے کے طور پر بار بار دہرایا جاتا ہے اور اس طرح پوری نظم دعائے مغفرت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ درود شریف کے الفاظ قافیے اور ردیف کی ضرورت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ہندوستان کے صف اول کے مورخ مولانا شبلی نعمانی (وفات ۱۹۱۴ء) کی ایک اردو نظم کا یہ آخری شعر ہے:

صل یا رب علیٰ خیر نبی و رسولؐ

صل یا رب علیٰ افضل ہر جن و بشر

درود شریف کو فنی لحاظ سے بہتر اور یاد رکھنے کے قابل بنانے کے لیے قرآن کریم اور احادیث کے مجموعوں سے پچھلی کئی صدیوں میں بے شمار نسخے ترتیب دیے گئے ہیں۔ (سندھ کے مخدوم محمد ہاشم نے اٹھارویں صدی میں ایک نادر درود شریف مرتب کیا تھا)۔ ان مجموعوں کو ترتیب دینے والے متقی اور پارسا مسلمانوں نے یہ درود شریف پڑھنے کے ثواب

اور مختلف اوقات میں مختلف تعداد میں یہ درود شریف پڑھنے کے فوائد کی بھی تصریح کی ہے۔ مسلمانوں میں درود شریف کے مجموعوں میں سب سے مقبول عام کتاب الجزولیؒ کی دلائل الخیرات ہے جو پندرہویں صدی میں لکھی گئی تھی۔ مراکش سے لے کر ملائشیا اور انڈونیشیا تک لاکھوں مسلمان اب بھی اس کتاب کو پڑھتے ہیں۔ (Reader on Islam, pp.530-36)۔ دلائل الخیرات میں اعلیٰ شعری زبان میں حضورؐ پر درود و سلام بھیجا گیا ہے لیکن افسوس کہ اس کتاب کے بہترین ترجمے میں بھی اس کا حسن اور رعنائی ماند پڑ جاتی ہے۔ کتاب میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات گرامی کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے:

ترجمہ: قوی اور طاقت ور ساتھی رکھنے والی ذات اقدس

وہ ذات گرامیؐ جو چپل پہنا کرتی تھی

عقل اور استدلال رکھنے والی

اور ہوش مندی اور معقولیت کی بات کرنے والی ذات

صاحب قوت و ذی وقار

سر پر پگڑی پہننے والی بارعب شخصیت

شب اسریٰ و معراج کا ہیرو......

وہ ذات پاک جس سے ہرنی نے واضح گفتگو کرتے ہوئے شفاعت کی درخواست کی

وہ ذات اقدس جس سے گھوہ نے بالمشافہ بات چیت کی

دعوت اسلام کا سچا مبلغ

سراج منیر......

جو پاک تھا پھر بھی خدا نے اسے دوبارہ پاک صاف کیا

نور علیٰ نور

پھیلتی ہوئی صبح

روشن ستارہ

قابل اعتماد وسیلہ

روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کو شعور وآگہی بخشنے والا

(Padwick: Muslim Devotions, p.146)

مراکش میں اشہب ادالیل نامی ایک تنظیم موجود تھی جس کے فرائض میں مقبول ترین دعائیں پڑھنا شامل تھا۔ دلائل الخیرات بھی طلسماتی اثر رکھتی ہے اور اس میں درج بعض دعاؤں کو نہایت نفاست سے کتابت کر کے اس پر چاندی یا منقش چمڑے کا غلاف چڑھانے کے بعد اسے تبرکاً کسی صندوقچی میں رکھا جاتا ہے۔

درود شریف کے دوسرے نسخوں میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی گئی ہے کہ وہ دین اسلام کے جلیل القدر پیغمبرؐ پر، جن کے بے شمار اسما الحسنیٰ اور خاندانی نام اور القابات ہیں اور جو رحمتوں اور بخششوں کے مستحق ہیں، درود و سلام بھیجے:

اے خدایا! نبی رحمتؐ پر اتنی تعداد میں رحمتیں بھیج جس قدر فضاؤں میں اڑنے والے بادلوں اور تیز رفتار ہواؤں کی تعداد ہے، اس وقت تک جب تک قیامت برپا نہیں ہوتی ...... بارش کے ان قطروں کے بقدر جو تیرے آسمانوں سے تیری زمین پر برستے ہیں اور یہ بارش تو قیامت کے دن تک برستی ہی رہے گی ...... بادِ سحر کے جھونکوں کی تعداد کے برابر اور درختوں، پتوں اور کھیتوں میں کھڑی فصلوں کی نقل و حرکت اور صحراؤں اور زیر کاشت زمین میں تو نے جو کچھ پیدا کیا ہے، ان کے برابر، کائنات کی تخلیق سے لے کر یوم حساب تک۔ (Padwick: Muslim Devotions, p.257)۔

کانسٹینس ای پیڈوک نے، جس نے نہایت عرق ریزی اور احتیاط کے ساتھ درود شریف کے نسخے جمع کیے ہیں، بجا طور پر کہا ہے کہ تسلیہ لازمی اور نجات اخروی اور زہد و پرہیزگاری کی زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ (Padwick: Muslim Devotions,p.154)۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اس خاتون نے پارسائی اور تقوے و پرہیزگاری کے ضمن میں جو عمدہ تجزیہ کیا ہے، وہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات اقدس سے محبت اور عقیدت کے اظہار کا بہترین تعارف اور تمہید ہے چناں چہ وہ لکھتی ہیں:

''اگر کوئی شخص قیامت کے دن دنیا کے تمام لوگوں کے اچھے اعمال کے برابر نیک کام لاتا ہے اور نبی کریمؐ پر درود و سلام کو اپنے ساتھ نہیں لاتا تو اس کے اچھے اعمال اسے لوٹا دیے جائیں گے، قبول نہیں کیے جائیں گے۔''

(Padwick: Muslim Devotions, p.154)۔اسی طرح صوفی مواخات کے بانی عثمان المرغانیؒ، جو آں حضرتؐ سے بے پناہ عقیدت رکھنے کی وجہ سے بہت مشہور ہیں، اپنی ایک نظم میں لکھتے ہیں:

ترجمہ: خدا سب سے زیادہ مقدس و مبارک ـــــ احمدؐ پر اپنی رحمتیں نازل کرے
اپنے منتخب اور چنے ہوئے ـــــ احمدؐ پر اپنی رحمتیں نازل کرے
خدا کی جستجو میں مسلسل سرگرم ـــــ احمدؐ پر اپنی رحمتیں نازل کرے
ہم آپؐ کی جانب محو سفر ہیں ـــــ یا احمدؐ

ہم اپنی ناقہ کو آپؐ ہی کی طرف لے جا رہے ہیں ــــــ یا احمدؐ

ہم آپؐ کے فراق میں گریہ وزاری کر رہے ہیں ــــــ یا احمدؐ (مرغانیؒ: النور البراق صفحہ ۴۴)

لیکن مرغانیؒ سے بھی بہت پہلے کی کہانیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تسلیہ کو انسانی نجات میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ پندرھویں صدی کی ایک کہانی میں کہا گیا ہے:

ایک بزرگ نے خواب میں ایک بھیانک صورت دیکھی اور اس سے پوچھا: ''تم کون ہو؟''

اس نے جواب دیا: ''میں تمہارے برے اعمال ہوں!''

ولی نے کہا: ''اور میں تم سے کس طرح چھٹکارا پا سکتا ہوں؟''

اس نے کہا: ''نبی کریمؐ پر زیادہ سے زیادہ درود و سلام بھیج کر!''

(Padwick: Muslim Devotions, p.155)

مسلمانوں کو یقین ہے کہ اگر ان کے گناہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہی کیوں نہ ہوں، انہیں درود پاک کے طفیل بخش دیا جائے گا۔ اور اگر ایک مسلمان تسلیہ کو بار بار دہراتا ہے تو اس کی قبر چوڑی اور کشادہ اور فرحت بخش باغ میں تبدیل ہو جائے گی اور قیامت کے دن اس کے اعمال کا پلڑا بھاری ہو جائے گا۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ عقیدہ ہے کہ آں حضرتؐ پر درود بھیجنے سے ہر مسلمان آپؐ کے نہایت قریب ہو جاتا ہے اور اسے خواب میں نبی کریمؐ کی زیارت نصیب ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مصنف اپنی کتاب کا خاتمہ درود شریف سے کرتے ہیں:

میں نے یہ کتاب بابرکت ساعتوں میں ختم کی ہے

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ہزاروں سلام! (غواصی: سیف الملوک و بدرالجمال)

دکھنی زبان میں لکھی جانے والی سیف الملوک کے مصنف غواصیؔ نے یہ الفاظ سترہویں صدی کے گولکنڈہ میں لکھے تھے۔ اور تسلیہ کو عملی مقاصد، مثال کے طور پر نظر بد سے بچنے بلکہ آئینہ دیکھتے وقت بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

وہ کتابچے، جن میں مختلف درود شریف درج ہوتے ہیں، اب بھی بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ حال ہی میں ان لوگوں کے لیے، جو عربی زبان نہیں پڑھ سکتے، درود شریف کو رومن حروف میں یا عربی متن کے انگریزی ترجمے کے ساتھ شائع کیا گیا ہے (یہ مشکلات نومسلموں کو پیش آتی ہیں)۔ اس سے مختلف زبان اور رسم الخط کے ماحول میں پرورش پا کر بڑے ہونے والوں، خاص طور پر بھارت کے نومسلموں کا مسئلہ حل ہو گیا ہے (اس کی ایک مثال برنی کی مشکوٰۃ الصلوٰۃ ہے)۔

رسول کریمؐ پر درود و سلام بھیجنے کا طریق کار تقریباً ۱۲۰۰ عیسوی بلکہ اس سے بھی بہت پہلے رائج ہو چکا تھا۔ عظیم

صوفی ابوحفص عمر السہر وردیؒ (وفات ۱۲۳۴ء) نے اپنی تصنیف عوارف المعارف میں، جو صوفیوں میں مذہبی آداب و معاشرت اور تعظیم وتکریم پر مبنی مقبول کتاب ہے، تسلیہ کے مسلسل ورد کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ درج ذیل اقتباس میں مصنف نے مبتدی کو نماز کے لیے وضو کرنے کا صحیح طریقہ بتایا ہے:

وضو کا آغاز مسواک سے کیا جاتا ہے۔ پھر مسلمان مکہ مکرمہ کی طرف منہ کر کے وضو کا باضابطہ آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر کرتا ہے اور یہ دعا مانگتا ہے: ''خدایا! میں پناہ مانگتا ہوں وسوسے ڈالنے والے پیچھے ہٹ جانے والے کے شر سے جو لوگوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں!'' ہاتھ دھوتے وقت یہ دعا مانگی جاتی ہے: ''یا اللہ! میں تجھ سے امن، چین اور رحمت کی دعا کرتا ہوں اور حرماں نصیبی اور تباہی سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔'' منہ پر پانی ڈالتے وقت یہ دعا کی جاتی ہے: ''یا اللہ! حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر رحمتیں اور درود بھیج اور قرآن کریم کی تلاوت کرنے اور اسے اکثر یاد کرنے میں میری مدد فرما!'' ناک میں پانی ڈالتے وقت یہ دعا مانگنی چاہیے: ''اے اللہ! رسول کریمؐ پر درود اور سلامتی بھیج اور مجھے جنت کی خوشبو سے استفادہ کرنے کا موقع دے۔'' پانی پر پھونک مارتے ہوئے یہ دعا کی جاتی ہے: ''یا اللہ! نبی رحمتؐ پر درود وسلام بھیج! میں دوزخ کی عفونت اور برے ٹھکانے سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔'' منہ دھوتے وقت یہ دعا مانگنی چاہیے: ''خدایا! حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر درود بھیج اور اس روز جب تیرے دوستوں کے چہرے سفید ہوں گے، میرا چہرہ بھی سفید بنا دینا اور اس روز میرے منہ کو سیاہ نہ کرنا جب تیرے دشمنوں کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے۔'' دایاں بازو دھوتے وقت مسلمان کو یہ دعا کرنی چاہیے: ''یا اللہ! حضورؐ پر درود بھیج، قیامت کے دن میرا نامہ اعمال میرے دائیں ہاتھ میں پکڑانا اور میرے حساب کتاب کو آسان بنا دینا!'' ۔ بایاں ہاتھ دھوتے وقت یہ دعا مانگنی چاہیے: ''خدایا! میں اس بات سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ میرا نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں یا پیچھے سے پکڑایا جائے۔'' سر پر مسح کرتے وقت یہ دعا کی جاتی ہے: ''یا اللہ! رسول کریمؐ پر اپنی رحمتیں بھیج اور مجھ پر رحم کر! مجھے اس روز اپنے تخت کے نیچے سایہ عطا کرنا جس روز صرف تیرے تخت کا سایہ ہوگا۔'' کانوں کو انگلیوں سے صاف کرتے وقت اس طرح دعا کرنی چاہیے: ''یا اللہ! حضورؐ پر درود بھیج اور مجھے ان لوگوں میں سے بنا جو تیرا کلام سن کر اس پر عمل کرتے ہیں۔ خدایا! مجھے نیکوکار لوگوں کے ساتھ جنت کے نقیب کی آواز سننے والوں میں بنا۔'' گردن پر مسح کرتے وقت یہ دعائیہ الفاظ کہنے چاہییں: ''خدایا! میری گردن کو دوزخ کی آگ سے محفوظ رکھ! میں زنجیروں اور بیڑیوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔'' دایاں پاؤں دھوتے وقت اس طرح دعا کی جائے: ''یا اللہ! رسول کریمؐ پر درود بھیج اور پل صراط پر دوسرے ایمان والوں کے ساتھ میرا قدم مضبوط رکھ!'' بایاں پاؤں دھوتے وقت یہ دعا مانگی جائے: ''اے خدایا! نبی کریمؐ پر درود بھیج! میں اس امکان سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ میرا پاؤں اس روز پل صراط سے پھسل جائے جب منافقوں کے پاؤں پھسل جائیں گے۔''

یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ وضو کے دوران ہر حرکت اور ہر جنبش پر رسول کریمؐ پر درود بھیجنا لازم قرار دیا گیا ہے۔ ہر روز اور سارا سال ادا کی جانے والی تمام عبادات کے دوران بھی اسی طریقے پر عمل کیا جاتا ہے۔

عمر السہر وردیؒ صوفیوں کے ایک نہایت کامیاب سلسلے کے بانی ہیں چناں چہ ان کی طرح صوفیوں کے دوسرے سلاسل میں بھی تسلیہ کو ایک منفرد اور لازمی عنصر کی حیثیت حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا رومیؒ بعض اوقات سماع کے دوران حالت وجد میں ترنم کے ساتھ درود شریف پڑھا کرتے تھے۔ (افلاکی: مناقب العارفین صفحہ ۴۳۰)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ سوڈان میں بعض صوفی درود شریف پڑھتے ہوئے دنیا و مافیہا کی ہر چیز سے بے نیاز ہو جاتے ہیں کیوں کہ وہ شفاعت کے لالچ اور کسی خوف و خطر کے بغیر صرف رسول اللہ کی محبت میں درود پڑھتے ہیں، خالص آپ کی محبت میں! (محمود: الفکر الصوفی فی السودان صفحہ ۶۵)۔ یہ یقیناً تسلیہ کا ایک اہم پہلو ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صوفیوں کے سلسلوں میں صلوٰۃ شریف سے اس سے بھی زیادہ جادوئی اثر پذیری کا عقیدہ موجود ہے۔ شمالی افریقا کے بعض حلقوں میں ارادت مند مسلمان اس امید کے ساتھ ایسے اجتماعات میں شرکت کرتے ہیں کہ وہاں مانگی گئی دعاؤں کو جلد شرف قبولیت حاصل ہوگا۔ ان موقعوں پر قرطبہ کی دعائے تسکین کو ۴۴۴۴ مرتبہ پڑھا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو یقین ہے کہ یہ دعا ''آگ کی طرح تیز رفتاری'' سے قبول ہوتی ہے۔ اس دعا کا متن یہ ہے:

اے خدایا! ہمارے مولا و آقا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) پر کامل درود اور سلامتی بھیج جو مشکلات کو حل کرتے، غم و اندوہ میں تسکین دیتے اور معاملات کو پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ آپؐ کی ذات اقدس کے ذریعے آرزوئیں اور تمنائیں پوری ہوتی ہیں۔ آپؐ ہی کے چہرہ مبارک کے وسیلے سے بادل بارش کے لیے سوال کرتے ہیں۔ پس خدایا! تو آپؐ کی آلؓ اور صحابہؓ پر بخشش اور رحمتیں بھیج۔ (Andrae: Die Person Muhammads, p.388)۔

عہد حاضر میں حمیدیہ شاذلیہ سلسلے کے ارکان ہر شب کو دو گھنٹے تک رسول کریمؐ پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ (Gilselnan: Saint and Sufi in Modern Egypt, pp.14,19)۔ ان سے بھی قابل ذکر دعائیں تجانیہ سلسلے کی ہیں جس کے بانی احمد التجانیؒ کا دعویٰ تھا کہ انہیں ان دعاؤں کی تعلیم خود آں حضرتؐ نے دی ہے۔ اس ضمن میں مختصر دعا صلوٰۃ الفاتح کو خصوصی اہمیت حاصل ہے:

اے اللہ! ہمارے آقا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) پر درود اور رحمتیں بھیج جنہوں نے اسے کھول دیا جسے بند کر دیا گیا تھا، جو خاتم النبیین ہیں، جنہوں نے حق کو حق کے ساتھ فتح دلائی، تیرے صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کی اور آپؐ کی آل پر درود بھیج جو آپؐ کے اعلیٰ مرتبے اور عظمت کے شایان شان ہو۔

اس دعا سے، جو اگر چہ بہت مختصر ہے، درج ذیل فیوض و برکات حاصل ہوتے ہیں:

اس دعا میں آٹھ خصوصیات ہیں ...... جو شخص اسے ایک مرتبہ پڑھے، اسے دور ہائش گاہیں ملیں گی، اسے ایک مرتبہ پڑھنے سے تمام گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ اسے چھ ہزار مرتبہ ذکر اور دعاؤں کا ثواب ملے گا خواہ وہ لمبی ہوں یا چھوٹی، جو شخص اس دعا کو دس مرتبہ پڑھے گا، اسے اس ولی سے زیادہ اجر ملے گا جو دس ہزار برس زندہ رہا لیکن یہ دعا نہ پڑھی ہو۔ ایک مرتبہ یہ دعا پڑھنے کا اجر تمام فرشتوں، انسانوں اور جنوں کی ان دعاؤں کے برابر ہے جو انہوں نے تخلیق کائنات سے لے کر اس دعا کے پڑھنے تک کی ہوں۔ (Abu Nasr: The Tijaniyya, pp.51-52)۔

سب سے بڑھ کر درود شریف جوہرۃ الکامل ہے جو خود رسول کریمؐ نے تجانیؒ کو سکھایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب یہ درود شریف سات مرتبہ پڑھا جائے تو حضور سرور کائناتؐ اور چاروں خلفائے راشدینؓ خود آکر اسے سنتے ہیں۔ (Abu Nasr: The Tijaniyya, pp.52-53)۔ تجانیؒ کو حضورؐ کے ساتھ مسلسل قریبی رابطے میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آتی کیوں کہ ''آں حضرتؐ کی وفات'' کا مطلب صرف یہ ہے کہ آپؐ تمام انسانوں کو دکھائی نہیں دیتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضورؐ اب بھی اسی طرح نظر آتے ہیں جس طرح وفات سے پہلے نظر آتے تھے۔ اصل میں آپؐ ہر جگہ موجود ہیں اور ان لوگوں کو، جو آپؐ کو خصوصی طور پر پسند ہیں، خواب یا دن کی روشنی میں دکھائی دیتے ہیں۔ (Abu Nasr: The Tijaniyya, p.31)۔ کٹر عقاید رکھنے والے مسلمانوں نے البتہ احمد التجانیؒ اور اس کے پیروکاروں کے اس دعوے کی تردید کی ہے کیوں کہ اگر رسول اللہؐ نے تجانیؒ کو ذاتی طور پر کوئی مخصوص درود شریف سکھایا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکمل پیغمبرانہ پیغام پہنچائے بغیر وفات پا گئے تھے جو کفر ہے۔ (Abu Nasr: The Tijaniyya, p.180)۔

گو کہ زیادہ کٹر عقاید رکھنے والے مسلمان ایسے صوفی رہنماؤں کے ان دعووں کو ہمیشہ مبالغہ آرائی سے تعبیر کرتے رہے ہیں کہ حضورؐ کے ساتھ ان کا خصوصی ربط وضبط ہے، اس کے باوجود صوفی شاعروں نے آں حضرتؐ کی شفقت و رافت اور آپؐ پر درود وسلام بھیجنے کی اہمیت کے بارے میں مژدہ فزا خبریں پورے عالم اسلام میں پھیلائی ہیں، مثال کے طور پر برصغیر ہندوستان کے قوال رسول کریمؐ پر درود بھیجنے کے موضوع پر اکثر اظہار خیال کرتے ہیں اور سامعین گرمی جذبات سے مغلوب ہو کر شعروں کے الفاظ کو قوالوں کے ساتھ مل کر گانا شروع کر دیتے ہیں اور اظہار عقیدت کے لیے دائیں ہاتھ کو دل پر رکھ لیتے ہیں:

ترجمہ: اے دل! اس ذات پاک پر درود بھیج جس کی آنکھیں سیاہ ہیں

قیامت کے ہولناک دن کو وہ تمہاری مدد کریں گے

یہ عربی کی ایک مقبول رزمیہ نظم کا مطلع ہے جس میں رسول کریم کو ہدیہ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ تسلیہ کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ پتلیوں کے تماشے میں بھی اسے پڑھنے سے گریز نہیں کیا جاتا حالاں کہ نفسِ مضمون سے قطع نظر یہ ایک غیر مذہبی فعل ہے۔

قرونِ وسطیٰ کے ترک شاعر عاشق پاشا نے اپنے ہم وطنوں کو یاد دلایا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ابتدائے آفرینش سے بھی پہلے موجود تھے چناں چہ اس نظریے کو تصوف کی دنیا میں ایک اہم عنصر کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے:

ترجمہ: آدمؑ ابھی مٹی اور گارا تھے
لیکن احمدؐ اس وقت بھی پیغمبر تھے
آپ کو خدا نے چن لیا تھا
آپؐ پر بے حد و بے شمار درود و سلام

ہماری صدی میں سندھی کا ایک لوک شاعر ''سنہری حروفِ تہجی'' کے عنوان سے لکھی جانے والی نظم میں حرف ''ل'' کے زمرے میں یوں رقم طراز ہے:

ترجمہ: ہمارے محبوب محمدؐ نہایت حسین و دل کش اور خالص رہنما ہیں
محمدؐ لولاک کے شہنشاہ ہیں
محمدؐ تمہیں منزلِ مقصود تک پہنچانے والے ہیں
محمدؐ کسی کو غم زدہ نہیں چھوڑتے
خدایا آپؐ پر درود و سلام بھیج

اور اس کا وادیِ سندھ کا ایک ہم وطن چرواہا بچوں کے گیت کی صورت میں حضورؐ کو گل ہائے عقیدت پیش کرتا ہے۔ پچاس سے زیادہ شعروں میں وہ ان تمام پیغمبروں سے مخاطب ہوتا ہے جن کا تذکرہ قرآن مجید اور بائبل میں ہوا ہے۔ وہ کائنات میں تخلیق کی گئی ہر چیز کو یاد دلاتا ہے کہ اسے رسولِ رحمتؐ پر درود بھیجنا چاہیے:

ترجمہ: اے وہ ذاتِ پاک جسے خدا نے چنا ہے
میرے آقا! آپؐ پر درود اور سلام!
ہر گھڑی، ہر جگہ سے
میرے آقا پر درود و سلام!

Hasnain Sialvi

خضرؑ اور ابراہیمؑ

الیجاہؑ اور اسماعیلؑ

الیسا اور اسرائیل

سب کی طرف سے آپؐ پر درود اور سلام!

چلتے پھرتے اور آرام کے وقت

خواہ یہ دن ہو یا رات

صبح ہو، دوپہر ہو یا شام

میرے آقاؐ! آپؐ پر درود و سلام!

جس قدر بارش کے قطرے ہیں

جس قدر سب مویشیوں پر بال ہیں

صحرا میں ریت کے ذروں کے برابر

میرے آقاؐ! آپؐ پر درود اور سلام!

لوک شاعر اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ نہ صرف پانی، ہوا اور زمین بلکہ آسمان اور زمین بھی زبانِ حال سے حضورؐ پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔

درود شریف کی اہمیت کا اندازہ سندھی کے ایک مختصر لیکن دل آویز جذباتی گیت سے لگایا جا سکتا ہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے، پورے کلاسیکل عربی لٹریچر میں اس موضوع پر اظہار خیال نہیں کیا گیا البتہ ترکی اور ہندوستان کی مسلم روایات میں اس کے اشارے ضرور ملتے ہیں۔ یہ تقریباً ۱۳۰۰عیسوی میں لکھی جانے والی شہد کی ایک مکھی کی کہانی ہے۔ اناطولیہ کے یونس ایمرے نے لکھا ہے کہ شہد کی مکھی اپنے چھتے میں داخل ہونے سے پہلے نبی کریمؐ پر درود اور سلام بھیجتی ہے۔ (یونس ایمرے دیوان صفحہ ۵۲۴)۔ یہ ایک غور طلب اور دل چسپ اشارہ ہے کیوں کہ کئی روایات میں یہ تذکرہ کیا گیا ہے کہ رسول اللہؐ کو شہد بہت مرغوب تھا اور آپؐ نے شہد کی تعریف کی ہے۔ خود قرآن کریم میں حیوانوں میں خدائی الہام اور روحانی وجدان کی مثال پیش کرتے ہوئے شہد کا ذکر کیا گیا ہے۔ (آپؐ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی ہے کہ پہاڑوں میں درختوں اور لوگوں کی بنائی ہوئی اونچی اونچی ٹیٹوں میں اپنے گھر (چھتے) بنا، اور ہر طرح کے میوے کھا اور اپنے رب کی آسان راہوں میں چلتی پھرتی رہ، ان کے پیٹ سے رنگ برنگ کا مشروب نکلتا ہے جس کے رنگ مختلف ہیں اور جس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔ غور و فکر کرنے والوں کے لیے

اس میں بھی بہت بڑی نشانی ہے۔سورہ النحل آیات ۶۸، ۶۹۔مترجم)۔شہد سے رسول اللہ کی رغبت سے متاثر ہو کر شمالی افریقہ کے مسلمان آپؐ کے یوم ولادت کو ''شہد کی ضیافت'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس روز سعید کے موقعے پر میلاد شریف کی تقریبات میں بہت سا شہد استعمال ہوتا ہے۔اس کے علاوہ حضرت علیؓ کی کئی کرامات سے شہد کے ساتھ ان کے خصوصی تعلق کا عندیہ ملتا ہے۔ (Paret: Die Legendare Maghazi Literatur, pp.195-96)۔ایک سندھی شاعر نے، جو ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ پروان چڑھا، ایک نظم میں مدینہ منورہ میں رونما ہونے والے ایک عجیب واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے:

ترجمہ: کتابوں میں ایک خوب صورت کہانی

اس طرح بیان کی گئی ہے

ایک دن مسجد نبویؐ میں

تمام نمازی اور شجاع لوگ جمع تھے

یہ سب لوگ رسول اللہؐ کے مہمان تھے

اس لیے بڑے شاداں اور فرحاں تھے

وہاں انہوں نے اپنے عظیم قائد کا

پورے خلوص اور تپاک کے ساتھ خیر مقدم کیا

سب لوگوں نے کہا: ''آپؐ پر رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں

اے ہمارے شیریں کلام اور دل کش رہنما!''

حضورؐ نہایت خوش دلی سے ان لوگوں کے ساتھ باتیں کر رہے تھے

سب لوگ کس قدر خوش اور مسرور تھے!

آں حضرتؐ نے مہمانوں کی تواضع کے لیے

فوری طور پر انڈے اور روٹیاں تیار کرنے کا حکم دے دیا

لیکن گھر میں کھانے کے لیے کوئی چیز نہیں تھی

جو مہمانوں کو پیش کی جا سکتی

جب ان لوگوں نے یہ صورت حال دیکھی

تو وہ سخت پریشان ہو گئے

اچانک شہد کی ایک ننھی مکھی حاضر خدمت ہوگئی
اور کچھ دیر تک وہاں چکر لگاتی رہی
رسول اللہؐ نے شہد کی مکھی سے دریافت کیا
کہ وہ کس لیے یہاں آئی ہے؟
چناں چہ شہنشاہ عالم کے سامنے
مکھی نے ہر چیز کی کھول کر وضاحت کر دی
اس مرتبہ میں اپنے آقا کے حکم سے
جناب کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں
آپؐ سے التماس ہے کہ ایک خاص غلام کو
میرے ساتھ روانہ کیجیے
پیارے محمدؐ نے موقعے پر موجود
علی شاہؓ سے کہا کہ وہ اس مکھی کے ساتھ چلے جائیں
غرض مکھی ان کے ساتھ آگے آگے اڑنے لگی
اور علی شاہؓ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے
وہ تیزی کے ساتھ ایک درخت کے قریب پہنچ گئی
جو مدینہ منورہ سے زیادہ دور نہیں تھا
علی شاہؓ نے ایک چھڑی کی مدد سے
شہد کے پورے چھتے کو نیچے اتار لیا
پھر آپؐ نے یہ چھتہ مہمانوں کے سامنے پیش کر دیا
جنہوں نے خوشی خوشی اسے کھالیا
پھر رسول کریمؐ نے مکھی سے کہا کہ
وہ اس عجیب و غریب واقعے کی تفصیل بتائے
تمہیں یہ اعزاز و اکرام کس طرح حاصل ہوا ہے؟
اس پوری کہانی کو سچ سچ بتا دو!

اب شہد کی مکھی نے حضورؐ کے سامنے کھڑے ہو کر
اس واقعے کی تفصیلات بیان کرنا شروع کر دیں
یہاں شہد کی جتنی بھی مکھیاں ہیں
میں ان سب کی پیشوا ہوں
ہم درختوں اور جنگلوں پر پرواز کر کے
وہاں سے کڑوا یا میٹھا رس اکٹھا کرتی رہتی ہیں
ہم ان سارے پھولوں کا رس
درختوں پر اپنے چھتوں پر جمع کر لیتی ہیں
لیکن یہ رس ہرگز میٹھا نہیں ہوتا
اور ہم محض اسے خوراک سمجھ کر کھا لیتی ہیں
لیکن جب ہم رسول کریمؐ کا اسم مبارک پکار کر
آپؐ پر درود اور سلام بھیجتی ہیں
تو ہمارا شہد
اس نام کی برکت سے بے حد میٹھا ہو جاتا ہے
اب یہاں موجود سب لوگ بھی حضورؐ پر درود اور سلام بھیجیں
تاکہ اس کی برکت سے آپ بھی شہد کی طرح میٹھے ہو جائیں!
یہ مختصر کہانی ہمیں رسول کریمؐ کے مختلف معجزوں کی طرف واپس لے جاتی ہے جہاں سے ہم نے شفاعت کے تذکرے سے اس باب کا آغاز کیا تھا۔

اسما النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

مذاہب کی تاریخ میں یہ ایک معروف حقیقت ہے کہ ہر شخص کے نام میں ایک مخصوص طاقت مضمر ہوتی ہے اور اس نام کا اس شخصیت کے ساتھ پراسرار تعلق موجود ہوتا ہے۔ کسی شخص کے نام کو جاننا اس کی ذات کو جاننے کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے حضرت آدمؑ کو مخلوق میں سے ہر چیز کا عالم بنانے کے لیے انہیں اس کے نام سکھائے تھے۔ (اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام نام سکھا کر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کر دیا اور فرمایا: اگر تم سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ سورہ البقرۃ آیت ۳۱۔ مترجم)۔ اسی بنا پر عاشق کو اپنے معشوق کا نام بتانے کی اجازت نہیں کیوں کہ وہ یہ نہیں چاہتا کہ کسی کو اس کی محبت کے اسرار تک رسائی ہو۔ چوں کہ نام کسی چیز یا شخص کا حصہ بلکہ بہت اہم جزو ہے، اس لیے اس میں برکت اور اقبال مندی کی قوت موجود ہوتی ہے اور جب کسی کو مخصوص طاقت یا بلند رتبہ حاصل ہو تو اس کا نام بھی ان لوگوں کے لیے پراسرار طور پر کام کرتا ہے جنہیں اس نام سے موسوم کیا گیا ہو۔ (چناں چہ مسیحی روایت میں میری، جان اور پیٹر نام کے لوگ ان خصائص کے حامل ہوتے ہیں)۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ مسلمان حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اسم گرامی کو خصوصی برکت کا سبب سمجھتے ہیں۔ (Andrae: Die Person Muhammads, pp.274-76)۔ ۱۳۰۰ عیسوی میں اناطولیہ کے یونس ایمرے کی لکھی ہوئی مناجات میں کہا گیا ہے:

ترجمہ: یارسول اللہؐ! قیامت کے دن ہماری بخشش فرمانا

آپؐ کا اسم گرامی خوب صورت ہے، آپؐ خود بھی حسین وجمیل ہیں یا محمدؐ!

خدا جو ہمارا آقا ہے، آپؐ کی دعا قبول کرتا ہے

آپؐ کا اسم گرامی خوب صورت ہے، آپؐ خود بھی حسین وجمیل ہیں یا محمدؐ!

یوں لگتا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اسم گرامی سے عقیدت اور محبت کا اظہار حضورؐ کی حیات مقدسہ

سے کیا جا رہا ہے کیوں کہ قاضی عیاضؒ نے کتاب الشفا میں آں حضرتؐ کے شاعر حسانؓ بن ثابت کا ایک شعر نقل کیا ہے جو آپؐ کے اسم مبارک کے متعلق بعد کی تمام قیاس آرائیوں اور تحقیق کی بنیاد ہے:

ترجمہ: خدا نے آپؐ کو عزت واکرام بخشنے کے لیے اپنے نام کا ایک حصہ حضورؐ کو دے دیا
یہی سبب ہے کہ عرش کے مالک کا نام محمود اور آپ کا نام محمدؐ ہے

اس سے مراد یہ ہے کہ محمدؐ فعل حمدہ کی دوسری گردان کے فعل مجہول کی صفت ہے جس کا مطلب ہے: ''تعریف وستائش کے قابل یا بہت زیادہ تعریف کیا گیا۔'' محمود اسی فعل مصدر کی پہلی گردان کے فعل مجہول کی صفت ہے جس کا مطلب ہے: ''وہ جس کی تعریف کی جائے یا وہ جو لائق تعریف ہو۔'' چوں کہ قرآن کریم کی پہلی سورت کا آغاز الحمدللہ سے ہوتا ہے جس کا مطلب ہے: ''سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں یا وہ سب تعریفوں کے لائق ہے'' اس لیے محمود کے معنی ہیں: ''سب سے بڑھ کر تعریف کا مستحق۔'' صوفیائے کرام خدا کی اس صفت اور نبی کریمؐ کے اسم مبارک کے درمیان قواعد زبان کے اس سادہ تعلق پر خصوصی طور پر زور دیتے رہے ہیں اور انہوں نے مختلف طریقوں سے اس کی تشریح کی ہے۔ (Jurji: Pre-Islamic Use of the Name Muhammad)۔ انیسویں صدی کے اردو شاعر طپش اس معاملے میں اس قدر آگے چلے گئے ہیں کہ انہوں نے یہ کہہ دیا:

اگرچہ ہوا آخر اس کا ظہور — و لیکن مقدم ہے سب پر وہ نور
کہاں شان اس کی ہو مجھ سے بیاں — کہ لولاک جس شان میں ہے عیاں

اس رائے کی مختلف طریقوں سے وضاحت ہو سکتی ہے کیوں کہ مسلمانوں کا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اسم گرامی اللہ تعالیٰ کے نام کے بعد براہ راست آتا ہے: لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ مسلمان طویل عرصے سے حضورؐ کی بے مثال حیثیت پر یقین رکھتے ہیں اور نہ صرف علمائے دین اس پر اسرار تعلق اور اس کے اثرات پر غور وفکر کرتے ہیں بلکہ شعرا کرام بھی اشاروں کنایوں میں اس نکتے پر مسلسل اظہار خیال کرتے رہے ہیں، مثال کے طور پر سترہویں صدی کے شروع میں ہندوستان میں نظیریؔ نے کہا تھا:

ترجمہ: شہادت کے کلمے میں خدا نے مصطفیٰؐ کے نام کا اپنے نام کے ساتھ ذکر کیا ہے
اور اس طرح اس نے آدم کی قطعی منزل کا تعین کر دیا ہے

نظیریؔ نے اسی نظم کے اگلے شعر میں ایک نہایت اہم نکتے کا اضافہ کیا ہے:

ترجمہ: خدا نے کلمہ شہادت میں محمدؐ کے اسم گرامی کو اپنے نام کے ساتھ شامل کیا ہے
اس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عیسائیوں سے الگ کر دیا ہے

اکبر کی مذہبی وسیع المشر بی کے بعد یہ مصرے زیادہ کٹر نقطہ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔

نویں صدی میں رسول کریمؐ کی احادیث کے جامع الدارمیؒ نے اپنے مجموعہ احادیث کی تمہید میں کچھ ایسے الفاظ لکھے ہیں جن سے مصر کے عالم دین جلال الدین السیوطیؒ نے چھ صدیوں کے بعد حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اسم گرامی کے راز کی عقدہ کشائی کرتے ہوئے استفادہ کیا ہے:

محمدؐ اور احمدؐ آپؐ کے اسمائے گرامی ہیں۔ آپؐ کی قوم تعریف کی گئی (حمد) قوم ہے۔ اور آپؐ اور آپؐ کی قوم کی نماز تعریف (حمد) سے شروع ہوتی ہے۔ خدا کی فرودگاہ میں لوح محفوظ میں لکھا ہے کہ آپؐ کے خلفاؓ اور آپؐ کے صحابہؓ کو کلام اللہ (قرآن کریم) کا آغاز کرتے وقت سب سے پہلے اللہ کی تعریف لکھنی چاہیے۔ (سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔ سورہ الفاتحہ آیت ا۔ مترجم)۔ اور قیامت کے دن حمد کا پرچم بھی حضورؐ کے ہاتھ میں ہوگا —— اور پھر آں حضرتؐ ہماری شفاعت کے لیے خدا کے حضور سجدہ ریز ہو جائیں گے اور یہ شفاعت قبول کی جائے گی۔ چناں چہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑے ہو کر ایسی نئی حمد وثنا بیان کریں گے جو اس وقت خدا آپؐ پر الہام فرمائے گا۔ اس وقت آپؐ مقام محمود پر کھڑے ہوں گے۔ (عنقریب آپ کا رب آپؐ کو مقام محمود پر کھڑا کرے گا۔ سورہ بنی اسرائیل آیت ۷۹۔ مترجم)۔ اور جب آپؐ سجدے سے سر اٹھائیں گے تو تمام مخلوق، جس میں مسلمان اور کمزور ایمان والے، اولین وآخرین شامل ہوں گے، آپؐ کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان ہو جائے گی۔

(Padwick: Muslim Devotions, p.75)۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اسم گرامی حضورؐ کے لیے پہلے سے کی گئی تمام تعریفوں کے لائق ہے اور آپؐ کے امتی اس جہان اور اگلی دنیا میں اس مبارک نام کے فیوض وبرکات سے استفادہ کرتے رہیں گے۔ یہ نام پاک تخلیق کائنات کے دن سے موجود ہے اور جیسا کہ سنائیؔ نے کہا ہے، جنت میں بھی اس اسم گرامی کی صدائے بازگشت سنائی دیتی رہے گی:

ترجمہ: گردش کرتے ہوئے اجرام سماوی کے تخت پر آپؐ کے لیے جگہ مخصوص ہے

آپؐ کا اسم گرامی تخت خداوندی کے نیچے لکھا ہوا ہے

تصوف کی ایک کتاب میں اس نکتے کی اس طرح وضاحت کی گئی ہے:

حضرت آدمؑ نے اسی نام سے آپؐ کو پکارا اور انہیں آپؐ ہی کے وسیلے سے نجات ملی۔ حوا کے ساتھ شادی کے موقع پر انہوں نے حضورؐ پر درود اور سلام بھیجا ...... اور موسیٰ علیہ السلام اگلی دنیا میں اپنی شفاعت کے لیے آں حضرتؐ کو اسی نام سے پکاریں گے۔ معراج کی حدیث کے مطابق جبریلؑ نے اسی نام سے حضورؐ سے خطاب کیا۔

اور معراج کی رات کو حضرت ابراہیمؑ نے بھی اسی نام سے آپؐ کو پکارا، اور پہاڑوں کا فرشتہ بھی اسی نام سے آپؐ سے مخاطب ہوا اور جب عزرائیلؑ نے آپؐ کی روح قبض کی تو اس نے روتے ہوئے اسی نام سے آپؐ کو خطاب کیا اور کہا: ''میرے لیے یہ کیسی مصیبت ہے، اے محمدؐ!'' اور رسول کریمؐ نے جنت کو کھولنے کے لیے اسی نام سے خود کو جنت کا والی اور محافظ کہا تھا''۔(Padwick: Muslim Devotions, p.43)۔اس کے علاوہ صوفیائے عظام نے اشتقاق کبیر (لفظ کے ہر حرف سے مختلف معنی اخذ کرنا) کے ذریعے محمدؐ کے لفظ ''م'' سے مجد (تعریف وتوصیف) ''ح'' سے رحمت، ''م'' سے ملک اور ''د'' سے دوام کے معنی اخذ کیے ہیں۔

خود نبی کریمؐ سے یہ حدیث منسوب ہے: ''کیا تمہیں اس بات پر حیرت نہیں کہ خدا تعالیٰ مجھے قریش کی گالیوں اور دشنام طرازی سے کس طرح بچاتا ہے۔ یہ لوگ مذمم یعنی قابل ملامت کہہ کر مجھے لعن طعن کرتے ہیں لیکن میں تو محمد یعنی قابل تعریف ہوں۔'' (بیہقی: دلائل النبوت صفحہ ۱۲۱)۔ایک اور حدیث مبارکہ میں رسول کریمؐ نے اپنے نام محمدؐ کے علاوہ احمد (جس کا مصدر حمد ہے) اور الماحی (کہ اللہ تعالیٰ کفر کو میرے سبب سے مٹائے گا) الحاشر (اللہ تعالیٰ انسانوں کا حشر میرے قدموں میں کرے گا) اور العاقب (کیوں کہ میں سارے نبیوں کے آخر میں آیا ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا) بھی بتائے ہیں۔ (بیہقی: دلائل النبوت، صفحہ ۱۲۲)۔

رسول کریمؐ کے اسمائے گرامی میں احمدؐ کے نام کو دین اسلام میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ قرآن کریم کی سورہ الصف کی پانچویں آیت میں کہا گیا ہے: ''اور جب مریم کے بیٹے عیسیٰ نے کہا اے (میری قوم) بنی اسرائیل! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں مجھ سے پہلے کی کتاب تورات کی میں تصدیق کرنے والا ہوں اور اپنے بعد آنے والے ایک رسول کی میں تمہیں خوش خبری سنانے والا ہوں جن کا نام احمدؐ ہے۔ پھر جب وہ ان کے پاس کھلی دلیلیں لائے تو یہ کہنے لگے، یہ تو کھلا جادو ہے۔'' مسلمان ابتدائے اسلام سے اس آیہ کریمہ کو فارقلیط کا حوالہ قرار دیتے ہیں جن کے ظہور کی پیش گوئی انجیل میں کی گئی تھی۔ ''فارقلیط'' کا مطلب ہے: ''سب سے زیادہ تعریف کیا گیا۔'' چناں چہ تورات اور انجیل دونوں میں احمد کو حضورؐ کے اسم گرامی کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ (بیہقی: دلائل النبوت، صفحات ۲۶، ۲۷)۔ مولانا رومیؒ نے مثنوی کی پہلی کتاب میں لکھا ہے کہ پرانے زمانے کے بعض عیسائی انجیل مقدس میں احمد کے نام کو چوما کرتے تھے اور اس اسم گرامی کی برکت سے وہ عقوبت اور ایذا رسانیوں سے بچ جاتے تھے۔ اصل میں احمد محمدؐ کا آسمانی نام ہے۔ اس نام نامی کے گرد تصوف کا نہایت پیچیدہ لٹریچر موجود ہے جس کا ہم اس وقت مشاہدہ کریں گے۔ احمدؐ آپ کا روحانی نام ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ تمام پیغمبروں کا بھی نام ہے (جو حضورؐ کے نور قدیم کا حصہ ہیں)۔(Goldziher: Himlische und irdische Namer)۔

نجم رضی دیا نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مختلف اسمائے گرامی کی نہایت دقیق اور انوکھی تفصیل لکھی ہے: (Razi: The Path of God's Bondsmen, p.249)۔

محمد ابن اسحاق کے مطابق حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جوانی میں الامین یعنی سچا اور قابل اعتماد کہا جاتا تھا کیوں کہ آپؐ کے دوست آپؐ کے اعلیٰ اوصاف سے بے حد متاثر تھے اور انہیں یقین تھا کہ آپؐ کی ذات پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عالم اسلام میں بچوں کا نام اکثر امین کیوں رکھا جاتا ہے؟

نبی کریمؐ نے اپنے جو نام خود بتائے ہیں، ان کے علاوہ مسلمان حضورؐ کو بے شمار ناموں سے پکارتے ہیں اور ان کا یہ دعویٰ ہے کہ انہوں نے یہ اسمائے گرامی قرآن حکیم یا احادیث سے اخذ کیے ہیں۔ آپؐ کے جو نام قرآن مجید سے لیے گئے ہیں، بلاشبہ وہ بہت اہم ہیں۔ قرآن پاک میں محمدؐ اور احمدؐ کے علاوہ سورہ بنی اسرائیل کی پہلی اور سورہ النجم کی دسویں آیت میں آپؐ کو عبدہٗ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ ان دونوں آیات میں حضورؐ کے سفر معراج کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ سورہ طٰہٰ اور سورہ یٰسین کے شروع میں پراسرار بے ربط حروف کو بھی آں حضرتؐ کے اسمائے گرامی میں شمار کیا گیا ہے۔ بیسویں سورہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے: ''طٰہٰ۔ ہم نے یہ قرآن تجھ پر اس لیے نہیں اتارا کہ تو مشقت میں پڑ جائے۔'' قرآن حکیم کی ۳۶ ویں سورہ یٰسین، جسے قرآن کا دل کہا جاتا ہے، اس طرح شروع ہوتی ہے: ''یٰسین۔ قسم ہے قرآن باحکمت کی۔'' اس سورت کا آغاز بھی حضورؐ کے ساتھ خطاب سے ہوتا ہے۔ (Massignon: La Philosophic Qrientale d' Avicenne, p.11 about Yasin)۔ چناں چہ مسلمانوں نے طٰہٰ اور یٰسین کو بھی رسول کریمؐ کے اسمائے گرامی میں شامل کرلیا ہے اور کئی مصنفوں نے ان الفاظ کے پوشیدہ معانی پر گہرا غور وخوض کیا ہے، مثال کے طور پر طٰہٰ کو طاہر اور ہادی کے لفظوں کا مخفف قرار دیا گیا ہے۔ ترک شاعر خاقانی اپنے حلیہ شریف میں لکھتا ہے:

ترجمہ: صنوبر کا درخت اس طرح چلتا آیا کہ طٰہٰ کا توغ (پرچم) اس کے پاس تھا

وہ ہوا میں پھریرے اڑاتا جھومتا ہوا آ رہا تھا (توغ شاہی پرچم کو کہتے ہیں جسے بیل کی دم سے بنایا جاتا ہے)

اور ہندوستان میں امیر خسروؒ نے تین سو سال پہلے یاسین کے لفظ کو حرف ''س'' یعنی دانتوں کی تشریح کے ضمن میں باہم مربوط کر دیا ہے کیوں کہ صرف ''س'' کی ساخت دانتوں کے ساتھ گہری مماثلت رکھتی ہے۔ حضورؐ کے یہ اسمائے گرامی دنیائے اسلام کے دور افتادہ علاقوں میں اب بھی استعمال ہوتے ہیں اور خلدآباد (ہندوستان) کے قوالوں کی طرح ان شعروں کو بار بار دہرایا جاتا ہے:

ترجمہ: خدا نے قرآن کریم میں ان قابل تعریف ناموں کے ساتھ کس طرح آپؐ کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ بعض اوقات وہ آپؐ سے طٰہٰ اور بعض دفعہ یٰسین کے نام سے مخاطب ہوتا ہے......

اسی طرح گلگت کے ایک پاکباز ہم عصر شاعر نے مقامی زبان شینا میں لکھی جانے والی ایک نعت میں حضورؐ کے اسمائے گرامی کا تذکرہ کیا ہے۔

بعد کے زمانے میں حٰم کے لفظ کو، جس سے سورہ المومن، سورہ حم السجدہ، سورہ الشوریٰ، سورہ الزخرف، سورہ الدخان، سورہ الجاثیہ اور سورہ الاحقاف کا آغاز ہوتا ہے، آں حضرتؐ کے اسمائے گرامی میں شامل کر لیا گیا اور یہ ظاہر کیا گیا کہ حٰم کے حروف ''حبیبی محمدؐ'' کا مخفف ہیں۔ ان اسمائے پاک کو بعض اوقات خوب صورت خطاطی میں آرائشی طغروں کی صورت میں لکھا جاتا ہے۔ رسول کریمؐ کے لقب ''حبیب'' سے کئی اور نام بھی اخذ کیے گئے ہیں جن میں حبیب اللہ اور حبیب الرحمٰن شامل ہیں جو حضورؐ کے اسم گرامی محمدؐ کے مترادف ہیں۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) سے عقیدت و شیفتگی کا ایک خاص اور اہم سرچشمہ قرآن کریم کی سورہ الاحزاب کی ۴۵ ویں آیت ہے جس میں آں حضرتؐ کو بشیر (خوش خبریاں سنانے والا) اور نذیر (آگاہ کرنے والا) کہا گیا ہے۔ حضورؐ کے یہ دونوں اسمائے گرامی برصغیر ہندوستان میں خاص طور پر بہت مقبول ہیں اور وہاں بچوں کے اکثر یہ نام رکھے جاتے ہیں (بشیر احمد اور نذیر احمد)۔ سورہ الاحزاب کی ۴۶ ویں آیت میں رسول کریمؐ کو سراجاً منیرا (روشن چراغ) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور یہ اسم گرامی بھی مسلمانوں میں بہت مقبول ہے مثلاً سراج الدین، سراج الدولہ اور سراج الاسلام وغیرہ۔ منیر کے لفظ کو اکیلے یا کسی دوسرے نام کے ساتھ ملا کر استعمال کیا جاتا ہے جیسے منیر الدین احمد۔

نبی کریمؐ کو مصطفےٰ اور مجتبیٰ کے ناموں سے بھی پکارا جاتا ہے اور یہ دونوں اسما النبیؐ مسلمانوں میں بہت مقبول ہیں۔ بعض سورتوں کے تعارفی الفاظ میں بھی خدا مختلف ناموں سے آپؐ سے مخاطب ہوا ہے جیسے سورہ مدثر کے شروع میں یـــایھـــا المدثر (اے کپڑا اوڑھنے والے) یا سورہ مزمل کے آغاز میں یـــایھـــا المزمل (اے کپڑے میں لپٹنے والے)۔ آپؐ کے یہ دونوں نام ہندوستان میں خاص طور پر رکھے جاتے ہیں۔

چودھویں صدی میں تاریخ دان صفدی نے ایک طویل نظم لکھی جس میں اس نے رسول اللہؐ کے تمام ناموں کو شمار کیا ہے۔ اس سے پہلے مسلمانوں نے یہ دریافت کیا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اسما الشریفہ کی تعداد ۹۹ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ۹۹ اسما الحسنٰی کے برابر ہے۔ آپؐ کا جب بھی کوئی نام لیا جاتا ہے تو اس کے بعد تسلیہ (درود وسلام) پڑھا جاتا ہے کیوں کہ تحریری صورت میں یا گفتگو کے دوران جب بھی حضورؐ کے اسم گرامی کا ذکر آئے تو آپؐ پر درود شریف پڑھنا لازم ہے۔ آں حضرتؐ کے ۹۹ میں سے دو اسمائے گرامی رؤف اور رحیم خدا کے ناموں میں بھی شامل ہیں اور جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے، اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو یہ نام خصوصی انعام اور عطیے کی علامت کے طور پر عطا کیے ہیں۔ مولانا جامیؒ اس قدر آگے چلے گئے ہیں کہ انہوں نے یہ دعویٰ کر دیا ہے کہ حضورؐ کا حسن و جمال خدا کے سب سے بڑے نام کا آئینہ ہے۔ عہد حاضر میں قرآن مجید کے ایسے کئی نسخے شائع ہوئے ہیں جن کے شروع میں اللہ تعالیٰ کے ۹۹ اسما الحسنٰی اور آخری دو صفحوں پر رسول کریمؐ کے اسمائے گرامی درج ہیں۔

اوچ (پاکستان) میں سترہویں صدی کے سہروردیہ سلسلہ تصوف کے ایک بزرگ نے جواہر الاولیا نام سے

ایک کتاب لکھی تھی جس میں آں حضرتؐ کے ۱۹۹ اسمائے گرامی کی صفات اور فیوض و برکات پر مبنی ایک دل چسپ باب باندھا گیا ہے۔ یہ نام یا ان میں سے بعض اسما النبیؐ نقش اور تعویذ کے طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں۔ (Staples: Muhammad, A Talismanic Force)۔ مصنف نے ان اسما کے استعمال کے متعلق مختلف روایات بھی بیان کی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق عبدالقادر جیلانیؒ نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص دن اور رات کو ایک ایک مرتبہ ان ناموں کا ورد کرے تو وہ ہر قسم کی مصیبت سے محفوظ رہے گا اور اس کے ایمان کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ مصنف کے جدامجد اوچ کے مخدوم جہانیاں کے مطابق نماز فجر کے بعد اسما النبیؐ پڑھنے سے ہر بڑے اور چھوٹے، کھلے اور خفیہ تمام گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ اور سلطان سید محمود نصیرالدین بخاری نے کہا ہے کہ جو شخص ظہر کی نماز کے بعد سات مرتبہ حضورؐ کے اسمائے گرامی کا ورد کرے گا، وہ پرندوں یا چوپایوں سے کبھی ہراساں نہیں ہوگا۔ ایک اور صوفی سے یہ بیان منسوب ہے کہ مغرب کی نماز کے بعد اسما النبیؐ پڑھنے سے علم، حلم اور ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن نماز عشا کے بعد بارہ مرتبہ حضورؐ کے ۹۹ ناموں کا ورد کرنے کا جو اجر وثواب ہے، اس کے متعلق رسول کریمؐ نے مخدوم جہانیاں کو اس وقت بتایا جب وہ مدینہ منورہ میں قیام پذیر تھے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے وعدہ کیا کہ آپؐ ورد کرنے والے اس شخص کو جنت میں لے جائیں گے اور اس کے بغیر جنت میں داخل نہیں ہوں گے۔

لیکن ۱۹۹ اسمائے گرامی نبی کریمؐ کے لیے ناکافی تھے چناں چہ شروع میں دوسو اور بعد میں ایک ہزار ناموں کا اضافہ کر دیا گیا۔ عام مسلمانوں کا تو یہ عقیدہ ہے کہ کائنات کی ہر مخلوق آپؐ کو ایک مخصوص نام سے پکارتی ہے۔ مچھلیوں کے لیے آپؐ عبدالقدوس، پرندوں کے لیے عبدالغفار، جنگلی چوپایوں کے لیے عبدالسلام اور جنوں بھوتوں کے لیے عبدالقہار ہیں۔ (عبدالحق محدث دہلوی: مدارج النبوت صفحات ۲۹۳ تا ۳۰۸)۔

شاعر حضرات بھی اپنے محبوب پیغمبرؐ کے نئے نام دریافت کرنے کی مسلسل اور ان تھک جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ حضرت ام معبدؓ کے واقعے میں، جب حضورؐ نے اس کی بانجھ بکری سے دودھ دوہیا تھا، آپؐ کو "نسیم وسیم" کہا گیا ہے۔ تیرھویں صدی کے وسط میں سعدیؔ نے بوستان کے شروع میں ایک مشہور نظم میں ان الفاظ کو توسیع شدہ شکل میں استعمال کرتے ہوئے آں حضرتؐ کو ان القابات سے خطاب کیا ہے:

وسیم، قسیم، جسیم، نسیم

سعدیؔ کی بوستان میں، جس کا شمار عجم کی مقبول ترین کتابوں میں ہوتا ہے، نبی کریمؐ کے اسمائے گرامی کو اس قدر نمایاں اور شیریں زبان میں بیان کیا گیا ہے کہ حضورؐ کے یہ نام مختصر عرصے میں زبان زد خاص و عام ہو گئے اور آپؐ کی جامع صفات یا تو تنہا یا دوسرے لفظوں کے ساتھ ملا کر استعمال ہونے لگیں جیسے جسیم الدین۔

بعد میں، خاص طور پر غیر عرب مسلمانوں میں رسول اللہؐ کے آبائی وطن کی مناسبت سے القابات کا اکثر حوالہ دیا

جانے لگا اور آں حضرت کو اپنے خاندان کی نسبت سے قریشی، مطلبی (آپؐ کے دادا عبدالمطلب کے حوالے سے)، ہاشمی (قبیلہ بنو ہاشم کے حوالے سے)، مکی، مدنی یا محض عرب کہا جانے لگا۔ ان مقامات کا حوالہ دیتے ہوئے، جہاں زمین پر حضورؐ کا ظہور ہوا اور جہاں آپؐ نے قیام فرمایا، نظامی نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''اے وہ ذات کہ جس نے مدنی برقعہ اور مکی نقاب اوڑھ رکھی ہے۔'' اس کے بعد شاعر آپؐ سے درخواست کرتا ہے: ''آپ یمنی چوغے سے اپنا سر باہر نکالیں'' کیوں کہ ان بدترین دنوں میں امت کو آپ کی اشد ضرورت ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جامی نے ان القابات کو زیادہ فنی انداز میں پیش کیا ہے۔ بعد میں فارسی، خاص طور پر ہندوستان میں فارسی اور اردو بول چال میں یہ القابات کثرت سے استعمال ہونے لگے کیوں کہ ان کی نعتیہ شاعری اس قسم کی اصطلاحوں سے بھری پڑی ہے: ''اے بطحا کے صنم'' (مکہ کے اردگرد کی وادی کو بطحا کہا جاتا ہے)۔

مولانا جامی آں حضرت کی مدح میں یوں رطب اللسان ہیں:

ترجمہ: اے وہ ذات پاکؐ جن کا چہرہ چاند کی طرح روشن و تاباں ہے، مکہ کی سرزمین سے آپ کا ظہور ہوا

مدینہ کے گہوارے میں آپؐ نے قیام کیا، وہ ذات کہ آپؐ یمنی چادر اوڑھے رہتے تھے

سورج آپؐ پر رشک کرتا ہے، آپؐ بطحا کے چاند اور یثرب (مدینہ) کے سورج ہیں

آپؐ عرب کی تلوار نکال سکتے ہیں کیوں کہ آپؐ فصاحت و بلاغت کے حامل ہیں

اور فارسیوں کو شکار کر سکتے ہیں کیوں کہ آپؐ صاحب تمکنت و شان و شوکت ہیں

ان نظریات کو ہزاروں شعروں میں دہرایا گیا ہے لیکن جامی کے کلام میں نبی کریمؐ کے حسن و جمال کی تعریف کی گئی ہے جب کہ ہندوستانی روایت میں ایسے شعروں کے ذریعے مسلمانوں کو ان کے دین کی سرزمین دیار عرب کی یاددہانی کرائی جاتی ہے۔

مسلمان شاعروں اور نثر نگاروں، صوفیوں اور غیر صوفیوں نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے، جنھیں عام طور پر رسول اکرمؐ یا رسالت مآبؐ کہا جاتا ہے، جس قدر محبت آمیز اور قابل ستائش القابات استعمال کیے ہیں، ان سب کو یک جا کرنا ایک مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ مثال کے طور پر حضورؐ کو سرور کائنات، چمنستان محبت کی بلبل، عالم وحدانیت کا آفتاب، عاشقوں کے آقا، دونوں جہانوں کے اجرام سماوی کا مرکز و محور، پیغمبری کے مرغزاروں کا گلاب کا پھول اور اس جیسے کئی القابات سے پکارا جاتا ہے۔ شاعر اور صوفیہ حضرات اپنی تصانیف کی نوعیت کو مدنظر رکھ کر آپؐ کے لیے موزوں نام کا انتخاب کرتے ہیں مثلاً ایک رجزیہ نظم میں آں حضرتؐ کی قوت اور صبر و تحمل اور ایک عشقیہ غزل میں آپؐ کے حسن، رعنائی اور لطف و کرم کو اجاگر کیا جاتا ہے۔

چوں کہ رسول اللہؐ کا اسم مبارک نہایت بابرکت ہے، اس لیے تقریباً ہر لڑکے کا یہی نام رکھا جاتا ہے یا اس کے ہم پلہ

یا اس سے ماخوذ نام پسند کیے جاتے ہیں۔ شیعہ اسلام کے چھٹے امام حضرت جعفر صادقؒ سے مروی ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن خدا یہ اعلان کرے گا: جس شخص کا نام محمدؐ ہے، وہ اٹھے اور جنت میں داخل ہو جائے۔ مراکش میں کہا جاتا ہے کہ اگر کسی مکان یا خیمے میں محمد نامی کوئی شخص رہتا ہے، وہاں اس وقت تک فرشتے موجود رہتے ہیں جب تک کوئی کالا کتا یا موسیقاروں اور رقاصوں کا کوئی طائفہ انہیں نکال باہر نہیں کرتا۔

جیسا کہ بردہ کے شاعر بصیریؒ نے اپنی مشہور نظم میں کہا ہے، جن لوگوں کا نام محمد ہے، رسول کریمؐ کا ان کے ساتھ خصوصی تعلق ہے:

ترجمہ: جب سے میرا نام محمد رکھا گیا ہے، میری طرف سے آپؐ پر ذمے داری عاید ہوتی ہے

آپؐ تمام مخلوقات میں اپنی ذمے داریاں اور فرائض پورے کرنے میں کامل ترین انسان ہیں

ایک رقت انگیز واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے اسم مبارک کی طاقت پر کس قدر بھروسا ہے! اس واقعے کا تعلق دنیائے عرب کے گیارہویں صدی کے سب سے بڑے مذہبی شاعر عبدالرحیم البرعیؒ سے ہے۔ جب ان کا نوجوان بیٹا محمد سخت بیمار ہو گیا تو انہوں نے آں حضرتؐ سے رجوع کر لیا اور ایک پرسوز نظم لکھی جس کے آخری اشعار کا ترجمہ یہ ہے:

میرا بیٹا جس کا نام آپؐ پر ہے سخت مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہے

آپؐ اس کے رخساروں پر بہنے والے آنسوؤں پر رحم کریں

اور واقعہ یہ ہے کہ اس کے بعد ان کا بیٹا شفایاب ہو گیا۔ فارسی، ترکی اور ہندوستان کی مسلم شاعری میں ایسے بے شمار واقعات کو نقل کیا جا سکتا ہے۔

لیکن ہر لڑکے کے لیے محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے اسم گرامی کے استعمال کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ ظہور اسلام کے ابتدائی برسوں سے ہی یہ خدشہ ظاہر کیا جانے لگا تھا کہ مسلمانوں میں آں حضرتؐ کے نام نامی کے مسلسل استعمال کی وجہ سے آپؐ کے نام کی بے ادبی اور بے حرمتی ہو سکتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان ابتدائی پیغمبروں مثلاً موسیٰؑ، سلیمانؑ اور عیسیٰؑ کی نسبت سے اپنے بچوں کے نام رکھتے ہیں لیکن جب والدین اپنے بیٹے محمد کو جھڑکتے یا اسے برا بھلا کہتے یا محمد نام کے کسی شخص کو جھوٹا یا بدکار کہا جاتا تو کیا اس سے دوسرے مسلمان غضب ناک نہیں ہوتے ہوں گے؟ اس مشکل پر قابو پانے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ رسول کریمؐ کے نام کے ساتھ کسی تعظیمی لفظ کا اضافہ کر دیا جائے جیسے سیدی یا حضرت یا حضورؐ کے نام کے بعد ہمیشہ تسلیہ پڑھا جائے یا آپؐ کو صرف رسول کریمؐ کہا جائے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کا دوسرا طریقہ یہ تھا کہ آپؐ کے اسم گرامی کے الفاظ کو زبان سے مختلف انداز میں ادا کیا جائے۔ چناں چہ مراکش میں کئی لوگوں کے ذاتی نام می حمد یا صرف مولا یا اس قسم کے کسی دوسرے مخفف سے ماخوذ

ہیں۔(Fischer: Vergo tlishung und Tabuisierung der Namen Muhammads, p.332)۔مغربی افریقا میں حمد و جیسے نام رائج ہیں۔ترکی میں مہمت کو عموماً نجی طور پر استعمال کیا جاتا ہے جب کہ محمد کے نام کو صرف رسول اللہؐ کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔اس نام کو مختصر بھی کیا جا سکتا ہے، خاص طور پر اس صورت میں جب اسے کسی دوسرے نام کے ساتھ ملایا جائے جیسے ایم این راشد: م ن راشد۔میم کو حضورؐ کے اسم گرامی میں سب سے اہم حرف کی حیثیت حاصل ہے۔میم کو مصطفےٰ کے مخفف کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے جیسے ایم کمال۔ترکی میں بیک تش سلسلے کے زیر اہتمام میم دعاسی (میم کے لیے دعا) کی خصوصی محفلیں منعقد ہوتی ہیں جن میں حرف میم کے اسرار پر گفتگو کی جاتی ہے۔ (Birge: The Bektashi Order of Dervishes, p268)۔

دوسرے تمام عربوں کی طرح حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بھی کنیت ہے (ایک نام جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فلاں شخص فلاں بیٹے کا باپ ہے)۔حضورؐ کی کنیت ابوالقاسم تھی۔اس مسئلے پر خاصا غور وخوض ہوا ہے لیکن متفقہ طور پر کبھی یہ طے نہیں ہو سکا کہ آیا کسی بچے کا نام آں حضرتؐ کے اصل نام محمدؐ کی کنیت پر رکھا جا سکتا ہے (یعنی محمد ابوالقاسم) یا آیا کسی لڑکے کے نام کو صرف ایک نام تک ہی محدود رکھنا چاہیے؟ (Nicholson: Study in Islamic Mysticism, p.105)۔لیکن محمد امین کے نام سے اکثر بچوں کو موسوم کیا گیا ہے۔

مسلمانوں کا عمومی عقیدہ یہ ہے کہ نبی کریمؐ کے اسم گرامی کا ورد کرنے والے شخص پر رحمتیں اور برکتیں نازل ہوتی ہیں۔اردو کی قدیم نظم چرخی نامہ کی آخری سطروں میں، جس کو اسلام کی تعلیمات اجاگر کرنے کے لیے چرخے سے منسوب کیا گیا ہے، نیک اور پارسا لوگوں کو انتباہ کیا گیا ہے:

ترجمہ: تم درویشوں کے گھر میں غلام ہو
اللہ اور اس کے رسول کا ہر سانس میں نام لیا کرو (Eaton: Sufis of Bijapur, p.171)۔

لیکن دوسری طرف ایسے شاعر اور صوفیائے عظام موجود ہیں جو اس اندیشے کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ حضورؐ کو کون سا مقدس اور مکرم نام لے کر پکاریں۔چناں چہ سولہویں صدی کے آخر میں ہندوستان میں عرفیؔ نے یہ شعر کہا:

ہزار بار بہ شویم دہن ز مشک و گلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمالِ بے ادبیست

ترجمہ: اگر میں ایک ہزار مرتبہ بھی اپنے منہ کو مشک اور گلاب سے دھولوں
پھر بھی آپ کا نام لینا کمال بے ادبی ہے (عرفیؔ کے دیوان میں یہ شعر نہیں ہے۔مترجم)

عرفیؔ کے کوئی تین سو سال بعد غالبؔ نے رسول کریمؐ کی شان میں ۱۰۱ اشعروں کا قصیدہ لکھا جس کے آخر میں انہوں نے خبردار کیا ہے کہ حضورؐ کی تعظیم وتکریم کو پیش نظر رکھا جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپؐ کے تقدس اور احترام کی

حدوں کو پھلانگ جاؤ، اس جیسے گناہ گار کو خاموشی اختیار کرنی چاہیے اور آں حضرتؐ سے، جن کی تعریف خود خدا کرتا ہے، ہم کلام نہیں ہونا چاہیے۔

صوفیائے کرام نے رسول اللہؐ کے اسمائے گرامی کے تصوفانہ اور علامتی اوصاف پر ابتدا ہی سے غور وفکر شروع کر دیا تھا۔ اور حلاج وہ پہلا شخص ہے جس نے حروف کے لحاظ سے اسما النبیؐ کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ (حلاج: طاسین السراج در کتاب الطواسین صفحہ ۱۴)۔ کیا بنی نوع انسان کے باپ حضرت آدمؑ کو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نام سے پیدا نہیں کیا گیا تھا؟ انسان کا سر حرف ''م'' کی طرح گول ہے، اس کے ہاتھ حـــــ، اس کی کمر ''م'' اور باقی جسم د کی مانند ہے۔ غرض پوری نسل انسانی کو حضورؐ کے نام سے تخلیق کیا گیا ہے۔ (Jurji: Illumination in Islamic Mysticism, p.84) ابن عربی نے آں حضرتؐ کے نام کے حروف کی غالباً سب سے بہترین تصوفانہ تشریح کی ہے:

پہلی میم سر کے مصداق ہے جس سے مراد عالم ملکوت الاعلیٰ اور العقل الاکبر ہے۔ سینہ اور ہاتھ حـ سے مشابہہ اور صاحب جمال وجلال کا تخت ہے۔ اس کی عددی قیمت آٹھ ہے جو اس تخت کو اٹھانے والے فرشتوں کی تعداد کے برابر ہے۔ دوسری میم انسانی پیٹ کو ظاہر کرتی ہے اور وہ عالم الملک ہے جب کہ کولہے، ٹانگیں اور پاؤں حرف د کی نمائندگی کرتے ہیں اور یہ جسمانی ساخت خدا کے ازلی فرمان کی رو سے عمل میں آئی ہے۔ (Deladrier: La Profession de Foid Ibn Arabi, p.128)۔ اسی طرح خطاطی کی صورت میں حضورؐ کا اسم گرامی انسان کو سجدے کی حالت میں ظاہر کرتا ہے۔

علم تصوف کی رو سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اس اسم گرامی میں ان ۳۱۳ انبیا کے نام شامل ہیں جو پیغمبر تھے۔ (Jurji: Illumination in Islamic Mysticism,p.86)۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ جب آدم علیہ السلام کو تخلیق کیا گیا تو انہوں نے آں حضرتؐ کا نام پہلے سے لکھا ہوا دیکھا۔ اس کا تذکرہ لوک شاعری میں بھی کیا گیا ہے، مثال کے طور پر وادی سندھ کی اٹھارویں صدی کی ایک نظم میں کہا گیا ہے:

ترجمہ: تخت پر اور تمام میناروں پر
محمدؐ کا اسم مبارک تبرک کے طور پر لکھا گیا ہے
تمام درختوں پر اور ہر ایک پتے پر
محمدؐ کا اسم گرامی تبرک کے طور پر لکھا گیا ہے

یہی نظریہ مصر کی ایک افسانوی رزمیہ نظم میں پیش کیا گیا ہے:

ترجمہ: یا رسول اللہؐ! آپؐ کا نام خدا نے چنا ہے

آسمانوں کی رفعتوں پر آپ کا نام موجود ہے

فارسی کے قدیم شاعروں میں نظامی نے احمدؐ کے نام کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے:

ترجمہ: کیا یہ احمدؐ نہیں ہیں، ایمانداری اور قول و قرار میں الف کی طرح پکے

تمام پیغمبروں میں اول اور آخر

یہ ذومعنی بات نہایت ذہانت کے ساتھ کہی گئی ہے کیوں کہ لفظ انبیا کے شروع اور آخر میں الف کا لفظ آتا ہے جو احمدؐ کا بھی پہلا حرف ہے چناں چہ احمدؐ کے دہرے کردار کی گرامر کے لحاظ سے بھی تصدیق ہوتی ہے۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے اسمائے گرامی کے بارے میں مزید تحقیق ایران کے عظیم صوفی شاعر فریدالدین عطارؒ نے کی ہے۔ انہوں نے اپنی تصنیف (۱۲۰۰عیسوی) میں اس ضمن میں پہلی مرتبہ بعض ایسے پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جنہیں بعد میں آنے والی صدیوں میں بے حد پذیرائی ملی ہے۔ عطارؒ نے مصیبت نامہ میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ دونوں جہانوں کی تخلیق محمدؐ کی دومیموں سے ہوئی ہے کیوں کہ لفظ عالم میں صرف ایک میم ہے لہٰذا دومیموں سے مراد دونوں جہان ہیں، یہ دنیا اور اگلا جہان! عطارؒ کے تین سو سال بعد جامیؔ نے بھی اسی نظریے سے استفادہ کیا تاہم انہوں نے معمول کے مطابق پیچیدہ استدلال کے ذریعے رسول کریمؐ کے اسم گرامی احمدؐ کی مزید صراحت کی ہے (جس کا نظامیؔ نے اپنی نظم میں نہایت مہارت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے)۔ جامیؔ کہتے ہیں کہ احمدؐ کا پہلا حرف الف نقطہ احدیت سے عالم وجود میں آیا ہے۔ (فن خطاطی میں تمام حروف کی پیائش پہلے نقطے سے کی جاتی ہے اور الف کا حرف وہ پیمانہ ہے جس سے دوسرے حروف کو ناپا اور متشکل کیا جاتا ہے)۔ یہ الف ایک دائرے کے قطر کی طرح سیدھا ہے جو خطاطی کی روایتی صورت ہے۔ غرض الف کا حرف خدا کے مخفی خزانے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے، نصف حصہ ابھی عالم وجود میں نہیں آیا، وہ مخفی ذات خداوندی ہے اور ہماری قوت مدرکہ اس کا احاطہ نہیں کر سکتی جب کہ دوسرا حصہ ناگہانی حادثات کی دنیا ہے۔ رسول کریمؐ کی ذات یا حقیقت محمدیہ ان دونوں جہانوں کا مقام اتصال ہے۔ (بعد میں کئی نقشبندی صوفیوں نے حقیقت محمدیہ کی تشریح کرتے ہوئے اسے حضورؐ کا پہلا اور آخری ظہور قرار دیا ہے جس سے خالص عشق تک حد درجہ قربت کا اظہار ہوتا ہے)۔

اب ہم عطارؒ کی طرف لوٹ جاتے ہیں جنہوں نے ایک ایسی حدیث روایت کی ہے جو مشرق کے اسلامی ملکوں میں تصوف کی فکری پیش رفت میں بے حد اہم ہے اور جس کا تعلق آں حضرتؐ کے اسم گرامی احمدؐ سے ہے۔ یہ ایک حدیث قدسی ہے جس کا مطلب ہے خدا کی طرف سے قرآن کے علاوہ وحی! اس حدیث مبارکہ میں رسول کریمؐ نے فرمایا ہے: ''انا احمد بلا میم''، یعنی ''میں بغیر میم کے احمد ہوں۔'' احد سے مراد ایک ہے۔ ''احمدؐ خدا کے پیغمبر ہیں'' اور عطارؒ نے یہ بات بار بار دہرائی ہے (عطارؒ: منطق الطیر) اور انہیں معلوم ہے کہ جب:

ترجمہ: تجلی نور کا شعلہ تابندہ وفروزاں ظاہر ہو گیا

تو احمدؐ کی میم نظروں سے غائب ہو گئی

اس کا مطلب یہ ہے کہ باقی صرف خدا رہ گیا!

اگر چہ یہ حدیث قدسی احادیث کے ابتدائی مجموعوں میں شامل نہیں اور یہ صرف بارھویں صدی میں پہلی بار شائع ہوئی تھی، اس کے باوجود دنیائے اسلام کے فارسی بولنے والے علاقوں میں اسے بے حد پذیرائی ملی ہے اور شاید ہی ایسی کوئی اور حدیث ہو جسے اس قدر زیادہ نقل کیا گیا ہو۔ اس حدیث قدسی سے ثابت ہوتا ہے کہ احمدؐ کو صرف ایک حرف میم نے احد (اللہ) سے جدا کر رکھا ہے۔ عربی کے عددی نظام کے تحت میم کی عددی قیمت چالیس ہے جو صبر واستقلال، مصائب، پختگی، کاملیت اور تیاری کی علامت ہیں۔ (اسرائیلی چالیس برس تک صحرا میں مارے مارے پھرتے رہے، عیسیٰ علیہ السلام نے چالیس دن ایک بیابان میں گزارے، حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر چالیس سال کی عمر میں وحی نازل ہوئی، عیسائیوں میں ایسٹر سے پہلے چالیس دن کا زمانہ مجاہدہ نفس میں گزارا جاتا ہے۔ صوفیائے کرام چالیس دن تک دنیوی امور سے کنارہ کش رہتے ہیں جسے اربعین یا چلہ کہتے ہیں)۔ ان تمام واقعات اور روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ چالیس کے عدد کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ (Karahan: Islam Edeleiyatinda Kirk Hadis)۔ مسلمانوں کے علم تصوف کی رو سے چالیس کے عدد کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ انسان کو اپنے اصل کی طرف مراجعت کرنے کے لیے چالیس قدم اٹھانا پڑتے ہیں۔ عطارؒ نے مصیبت نامہ میں اور بعد میں ابن عربی نے اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ احمدؐ کی میم میں ان تمام اسرار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور جیسا کہ جامیؔ نے کہا ہے: ''یہ آپ ؐ کی تعلیمات کا سرچشمہ ہے جس کے لیے استدلال میں تشنگی پائی جاتی ہے۔'' بعد میں پنجاب کے ایک شاعر نے میم کو پوری انسانیت کا دوشالہ قرار دیا ہے۔ (Ramakrishna: Punjabi Sufi Poets, p.99)۔ اللہ نے یہ شال حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو آپ ؐ کی تخلیق کے وقت حضورؐ کے مثالی رول کی وجہ سے پہنائی تھی۔ امیر خسروؒ نے ایک مختلف نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ میم کی گول شکل آں حضرتؐ کی مہر نبوت کی آئینہ دار ہے اور اسے اکثر ''حرف ناگہانی'' کہا جاتا ہے۔ مولانا رومیؒ کہتے ہیں: ''احمد ایک نقاب ہیں'' جس کے ذریعے آپؐ احد تک پہنچنے کے آرزومند ہیں۔ انہوں نے اپنی نثر کی کتاب فیہ ما فیہ میں اس حدیث قدسی کے اسرار پر تفصیل سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے: ''کاملیت میں ہر اضافہ اصل میں زوال کے مترادف ہے...... احد کامل ہے جب کہ احمدؐ ابھی تک کاملیت کی جستجو میں ہیں۔ جب میم کا پردہ ہٹا دیا جائے تو آپ ؐ کامل واکمل بن جاتے ہیں۔(Arberry: Discourses of Rumi, p.226)۔

ان گنت شاعروں نے عطارؒ کی پیروی کرتے ہوئے حدیث قدسی انا احمد بلا میم سے عقیدت اور محبت کا اظہار

کیا ہے۔ محسن کاکوروی نے حضورؐ کو ہدیہ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ہے: ''نام احمدؐ بہ زباں، سر بلا میم بہ صدر''
سولہویں صدی کے شروع میں ازبک حکمران شیبانی نے اس حدیث قدسی کا تذکرہ کیا ہے اور اسی طرح جدید اردو کے
شعرا نے اس حدیث کا اکثر حوالہ دیا ہے۔ ترکی کے لوک شاعر اس حدیث کے ساتھ اس قدر محبت کرتے ہیں جیسے
پنجاب یا ایران کے درباری شعرا!

سندھ کے صوفی عبداللطیفؒ نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور اسی طرح ان کے ایک سو سال بعد دہلی کے نفیس اور
سلیقہ مند شاعر مرزا غالبؔ نے اس حدیث کا عقیدت سے ذکر کیا ہے۔ (Schimmel: Ghalib's Qasida in Praise of the Prophet, p.209)۔

جامیؔ نے نبی کریمؐ کے اسمائے گرامی میں سب سے زیادہ دلچسپی لی ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ محمد کی پہلی
میم لفظ ملک (بادشاہی) کی علامت ہے۔ ح سے، جس کی عددی قیمت آٹھ ہے، یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریمؐ نے اس
شش جہات دنیا سے آٹھ جنتوں کی طرف آٹھ کھڑکیاں کھولی ہیں جب کہ حرف د سے ظاہر ہوتا ہے کہ سچے مومنوں کے
سر حضورؐ کے مبارک قدموں کو چھو رہے ہیں۔ جامیؔ نے آں حضرتؐ کے اسمائے مبارکہ کی مزید تفصیل بیان کرتے
ہوئے کہا ہے کہ آپؐ کے نام کی دونوں میموں کے درمیان ح کا حرف ایک حور کے چہرے کی مانند ہے جس کے دو
کاکل ہیں جب کہ آخری حرف د کا تعلق دل سے ہے۔ لیکن جامیؔ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ابن عربی سے
ورثے میں ملنے والے نظریات کی پیروی کرتے ہوئے کہا ہے کہ قرآن کریم کی سورہ فاتحہ کا پہلا لفظ الحمد اور دوسری
سورہ البقرہ کے پراسرار ابتدائی حروف ال م کے درمیان ایک حیرت انگیز اتحاد پایا جاتا ہے۔ سورہ البقرہ کا ال اور الحمد کے
ابتدائی حروف ایک جیسے ہیں، الحمد کا چوتھا حرف میم ہے چناں چہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نام الحمد سے ماخوذ ہے۔ اس
طرح حضورؐ کا اسم گرامی، ان لوگوں کے لیے جو پڑھنا جانتے ہیں، قرآن مجید کا پہلا لفظ ہے۔ دوسری طرف دیکھا جائے تو
سورہ البقرہ کے ابتدائی حروف ال م اللہ (الف) اور محمدؐ (میم) کے درمیان عشق اور فریفتگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ حرف ل،
جو محبت کو یکجا کرنے کا مخفی حرف ہے، اسے جبریلؑ کی علامت قرار دیا گیا ہے جو حضورؐ کے لیے وحی لاتے تھے۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اسم گرامی میں حرف میم کی پراسرار خصوصیات تمام مسلمانوں، خاص طور پر
ہندوستان میں بدستور روحانی فیضان اور تقویت کا سرچشمہ رہی ہیں۔ (Canteins: La Veie des lettres: p.35)۔
شمالی ہندوستان میں نقشبندیہ سلسلے کے رہنما احمد سرہندیؒ نے سترہویں صدی کے شروع میں حضورؐ کے اسم مبارک میں دو
میموں کی بنیاد پر ایک تجدیدی علم معرفت کو فروغ دیا۔ (دیکھیے نواں باب نیز Friedmann: Shaykh Ahmad Sirhindi, p.15)۔ اگرچہ یہ نظریہ بہت دور افتادہ معلوم ہوتا ہے، اس کے باوجود اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ
کیا حرف میم کے تصوفانہ جوہر نے بصیریؒ کو اپنی مشہور نظم بردہ میں میم کے حرف کو قافیے کے طور پر منتخب کرنے کی طرف

راغب نہیں کیا تھا؟ بصیریؒ کی طرح سنائیؒ نے بھی رسول پاکؐ کی شان میں لکھے جانے والے بعض قصیدوں میں اسی قافیے کا انتخاب کیا ہے۔

صوفیوں کے نزدیک حضورؐ کے اسم مبارک کا آخری حرف د بھی حد درجہ معنی خیز ہے۔ اس حرف کی عددی قیمت چار ہے اور اسے آں حضرتؐ کے نام میں چوتھی پوزیشن حاصل ہے۔ (Deladriere: La Profession de Foid Ibn Arabi, p.14)۔ اس کے علاوہ قرآن کریم میں رسول اللہ کا چار مرتبہ نام لیا گیا ہے۔ (مستقیم زادہ: تحفۃ الخطاطین صفحہ ۴)۔ انیسویں صدی کے ہندوستان کے مرزا غالبؔ علم معرفت کے میدان میں اس قدر آگے نکل گئے ہیں کہ ان کے مطابق حق کا کوئی بھی متلاشی احمدؐ سے احد تک پہنچتا ہے۔ اور جب حرف احدیت کے الف کو حذف کر دیا جائے تو ح اور د کے حروف باقی رہ جاتے ہیں جن کی عددی قیمت بالترتیب آٹھ اور چار اور کل عددی قیمت بارہ ہو جاتی ہے جو شیعوں کے اماموں کی تعداد بارہ کے برابر ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ احمدؐ نام میں ایک مکمل اصولی اور قطعی خلاصہ موجود ہے۔ (Schimmel: Ghalibs Qasida in Praise of the Prophet)۔ ابن عربی نے، جو ایک اچھے سنی صوفی تھے، رسول کریمؐ کے اسم پاک میں امامیہ شیعہ علم معرفت کے کسی اصول اور عقیدے کی موجودگی کا انکشاف نہیں کیا بلکہ انہوں نے غالبؔ کے مقابلے میں علم الاعداد کی بہتر اسکیم پیش کی ہے۔ ابن عربی کا کہنا ہے کہ د (=۴) حرف ح (=۸) کا نصف ہے جب کہ م (=۴۰) حرف د کی عددی قیمت کے دس گنا کے برابر ہے چناں چہ دو میمیں (=۸۰) حرف ح کی عددی قیمت کے دس گنا کے برابر ہیں۔

رسول کریمؐ کے اسم گرامی سے عقیدت اور شیفتگی نے اسلامی کلچر کے کئی پہلوؤں پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ عربی کے حروف تہجی کے محاسن کی بنا پر خطاطوں کو نہ صرف آپؐ کے اسم مبارک کو نفاست کے ساتھ شکستہ خط بلکہ مربع نما خط کوفی میں لکھنے کا موقع فراہم کیا ہے تا کہ اسے ٹائیلوں اور اینٹوں کی دیواروں پر (اللہ کے نام کے ساتھ اور شیعہ حلقوں میں حضرت علیؓ کے نام کے ساتھ) نقش کیا جا سکے۔ آپؐ کے نام پاک کو دائرہ نما طرز اور دیواروں پر گلاب کے نقش کی صورت میں بھی منعکس کیا جاتا ہے۔

محمد اقبالؒ ۱۹۱۲ء میں جب اردو کی عظیم نظم جواب شکوہ میں مسلمانوں سے یہ کہہ رہے تھے:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

اس وقت وہ قطب شاہی بادشاہ محمد قلی کے اسی قسم کے خیالات سے بے حد متاثر ہوئے تھے جن کا اظہار انہوں نے ۱۱۰۰عیسوی کے لگ بھگ دکن میں کیا تھا:

اسم محمدؐ تھے اہے، جگ میں سو خاقانی مجھے
بندہ نبیؐ کا جم رہے، سہتی ہے سلطانی مجھے

اصل میں خود محمد قلی کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرون وسطیٰ سے لے کر آج تک مسلمان نہ صرف اپنے لڑکوں کے نام حضورؐ کے مختلف ناموں پر رکھتے ہیں بلکہ انہوں نے غیر عرب علاقوں میں خاص طور پر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے نوکر یا غلام جیسے نئے نام بھی رکھ لیے ہیں، محمد قلی کا نام بھی اسی نسبت سے رکھا گیا ہے یعنی محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کا نوکر! اسی طرح، غلام رسول، غلام سرور، آل احمد، یار محمد، غلام یٰسین، عبدالنبی اور عبدالرسول یا عبدالمحمد جیسے نام بھی کثرت سے رکھے جاتے ہیں حالاں کہ عبدل کے لفظ کو صرف خدا کے ناموں کے ساتھ ملانا چاہیے جیسے عبدالرب النبی۔ بھارت اور پاکستان میں تو نور محمد نام بھی رکھا جاتا ہے۔ دوسری طرف پاکستان اور بھارت میں نبی بخش یا رسول بخش جیسے مذکر ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نام کا حامل بچہ ''رسول کریمؐ کا تحفہ'' ہے جس کے والدین نے حضورؐ کو گڑگڑا کر مدد کے لیے پکارا تھا۔ غرض نبی کریمؐ کا اسم گرامی مسلمانوں کے ہر گھر میں موجود ہے۔

رسول اللہؐ کے مقدس اسمائے گرامی کی کئی مثالوں کی روشنی میں مناسب یہی ہے کہ ہم اس باب کا ـــــ جس میں لامحدود پیمانے پر توسیع ہوسکتی ہے ـــــ غواصی دکھنی کی اس نعت پر خاتمہ کردیں جو انہوں نے سیف الملوک کی کہانی کے شروع میں سادہ رجز یہ بحر متقارب (---/---/---/---/) میں لکھی ہے:

ترجمہ: اے خالص اور اصلی محمدؐ، اے مصطفیٰؐ

آپؐ صحیح معنوں میں احمدؐ ہیں، مجتبیٰؐ ہیں

آپؐ طٰہٰ، یاسین اور ابطاہی ہیں

اے امیؐ، اے مکیؐ، اے سچے پیغمبرؐ!

آپؐ اول و آخر ہیں، آپؐ شہنشاہ ہیں

آپؐ ظاہر اور باطن ہیں، آپؐ بے مثل پیغمبرؐ ہیں!

آپؐ ہاشمی نبی اور قریشی ہیں

آپؐ جو بھی کہیں، خدا آپ کی بات مانتا ہے......

اور آپؐ تینوں جہانوں کے سچے مولا اور آقا ہیں

دین کا گھر آپؐ کے سبب پھلتا پھولتا ہے......

سب فرشتے پروانے ہیں جو آپؐ کے نور کے گرد چکر لگاتے ہیں

تمام ولی آپؐ کے سامنے مٹی ہیں، آپؐ سورج ہیں

اور غواصی کا یہ آخری شعر ہمیں اسلامی تعلیمات کے ایک نہایت اہم پہلو نور محمدیؐ یعنی حضورؐ کی تاباں اور نورانی فطری صفات کی طرف لے جاتا ہے۔

ساتواں باب

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نور اور صوفیوں کی روایات

علم تصوف کے مرکزی موضوعات میں سے ایک مضمون (اگر یہ مرکزی موضوع نہیں ہے) کا تعلق نور محمدؐ سے ہے۔(Andrae: Die person Muhammads, pp.319-21)۔ یہ نور سورج کی روشنی کے مصداق ہے جس کے گرد ہر چیز گھومتی ہے۔ اسم محمدؐ کا یہ وہی نور ہے جس کا محمد اقبالؒ اور ان سے پہلے ان گنت شاعر حضرات اپنے اپنے کلام میں تذکرہ کر چکے ہیں۔ اس نظریے نے عارفانہ اسلام کے ہر علمی اور ادبی اسلوب اور کلام وسخن میں رنگ آمیزی کی ہے اور ظہور اسلام سے لے کر موجودہ صدی تک لوک اسلام پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ (اکرام: ارمغان پاک صفحہ ۱۲۸)۔

بھارت یا پاکستان جانے والا کوئی بھی شخص قوالی کی محفل کا اثر انگیز مشاہدہ کر سکتا ہے جہاں حضور سرور کائناتؐ کو موسیقی کے ذریعے نذرانہ عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ پیشرو قوال اور اس کے ساتھیوں میں بتدریج ہیجانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کے بعد قوالی سننے والوں میں سے اکثر لوگوں پر تقریباً وجد طاری ہو جاتا ہے۔ ان محفلوں میں فارسی کی ایک غزل عام طور پر گائی جاتی ہے جو قرون وسطیٰ کے ہندوستانی شاعر اور موسیقار امیر خسروؒ نے لکھی ہے۔ ہندوستان کی موسیقی ان کے زیر بار ہے کیوں کہ انہوں نے اس موسیقی میں جوش اور ولولہ پیدا کیا ہے۔ غزل کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم

ترجمہ: میں نہیں جانتا کہ کیا مقام تھا جہاں میں رات کو تھا

اس کے بعد شاعر نے ایک نہایت پراسرار شبینہ محفل کا ذکر کیا ہے جس میں خدا خود ساقی کے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ امیر خسروؒ نے اس غزل کے آخر میں یہ حیرت انگیز مصرع کہا ہے:

محمدؐ شمع محفل بود ......

ترجمہ: حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس محفل کی زینت تھے

امیر خسروؒ نے اس شعر میں حضورؐ کو شمع محفل کہا ہے جس کی روشنی سے یہ دنیا، جس میں سامعین اکٹھے ہوئے ہیں، تاریکی دور ہونے کے بعد روشن وتاباں ہو جاتی ہے، یہ ایک ایسی شمع فروزاں ہے جس کے گرد سر زدہ پروانوں کی طرح انسانی دلوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔

رسول کریم کو تعریف وتوصیف کے نورانی پردوں میں ڈھانپنے کے لیے آپ کی محبوب شخصیت کے گرد اعلیٰ اوصاف پر مبنی تذکروں کا ہالہ کھینچا گیا ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت کا یہ عام عقیدہ ہے کہ حضورؐ کا تعلق نور کے کرے سے ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ خود قرآن مجید میں آں حضرتؐ کو سراجاً منیر (روشن چراغ) کہا گیا ہے۔ (اے نبیؐ! یقیناً ہم نے ہی آپ کو (رسول بنا کر) گواہیاں دینے والا، خوش خبریاں سنانے والا، آگاہ کرنے والا بھیجا ہے۔ اور اللہ کے حکم سے اس کی طرف بلانے والا اور روشن چراغ۔ سورہ الاحزاب آیات ۴۵، ۴۶۔ مترجم)۔ حسانؓ بن ثابت نے بھی قرآن کریم کی پیروی کرتے ہوئے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تاریکیوں میں روشنی اور صداقت لانے والی شخصیت قرار دیا ہے۔ (اسی طرح سورہ المائدہ کی پندرہویں آیت میں کہا گیا ہے: ''اے اہل کتاب! یقیناً تمہارے پاس ہمارا رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آ چکا جو تمہارے سامنے کتاب اللہ کی بکثرت ایسی باتیں ظاہر کر رہا ہے جنہیں تم چھپا رہے تھے اور بہت سی باتوں سے درگزر کرتا ہے، تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور اور واضح کتاب آ چکی ہے۔ مترجم)۔

ترجمہ: آپؐ پر خدا کی جانب سے نور اور واضح کتاب نازل ہوئی ہے (حسانؓ بن ثابت دیوان نمبر ۵)

اس کے علاوہ معرکہ بدر کی تفصیلات کے ضمن میں حضرت حسانؓ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس روز حضورؐ کا چہرہ مبارک پورے چاند بدر کی طرح چمک رہا تھا۔ انہوں نے اس نور افشاں کا بھی ذکر کیا ہے جو آں حضرتؐ کی پیدائش کے موقعے پر چمکا تھا۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کا لٹریچر میں بار بار تذکرہ ہوا ہے:

ترجمہ: وہ ذات پاک جو رحمتوں اور بخششوں کے نور کی طرف رہنمائی کرتی ہے (حسانؓ بن ثابت دیوان ۱۳۱)

یہ شعری بیان نور سے متعلق قرآنی آیت کی صوفیانہ تفسیر کی تمہید ہے جسے آٹھویں صدی کے عالم دین مقاتلؒ نے متعارف کرایا تھا۔ یوں لگتا ہے کہ وہ قرآن پاک کی سورہ نور میں نبی کریمؐ کے بارے میں نازل ہونے والے ان قرآنی الفاظ کے پہلے مفسر ہیں:

اللہ نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا، اس کے نور کی مثال مثل ایک طاق کے ہے جس میں چراغ ہو اور چراغ شیشے کی قندیل میں ہو اور شیشہ مثل چمکتے ہوئے روشن ستارے کے ہو، وہ چراغ ایک بابرکت درخت زیتون کے تیل

سے جلایا جاتا ہو جو درخت نہ مشرقی ہے نہ مغربی، خود وہ تیل قریب ہے کہ آپ ہی روشنی دینے لگے اگر چہ اسے آگ نہ بھی چھوئے، نور پر نور ہے، اللہ تعالیٰ اپنے نور کی طرف رہنمائی کرتا ہے جسے چاہے، لوگوں (کے سمجھانے) کو یہ مثالیں اللہ تعالیٰ بیان فرمارہا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کے حال سے بخوبی واقف ہے۔

مقاتلؒ کی نظروں میں یہی چراغ مصباح ہے جسے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے رمزیہ علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یہ آپؐ ہی کی ذات بابرکات ہے جس کے ذریعے یہ خدائی نور دنیا میں چمکتا ہے اور یہ حضورؐ ہی کی ذات اقدس ہے جس کی وساطت سے اس نور کے منبع کی جانب بنی نوع انسان کی رہنمائی کی گئی ہے۔ (افلاکی: مناقب العارفین صفحہ ۲۸۷)۔ یہ دستور اور عقیدہ کہ ''دین اسلام کا تعلق نہ مشرق سے ہے نہ مغرب سے'' اصل میں رسول کریمؐ کی جامع صفات کا آئینہ دار ہے کیوں کہ آں حضرتؐ کا تعلق کسی خاص قوم یا نسل سے نہیں بلکہ آپؐ کی ذات پاک کون و مکاں کی تمام سرحدوں سے ماورا ہے۔ (حلاّج: طاسین السراج در کتاب الطواسین صفحہ ۱۲)۔ آج تک اس حقیقت کو پوری طرح تسلیم کیا جاتا ہے کہ نبی کریمؐ کا سب سے عمومی لقب نور الہدیٰ (ہدایت کا نور) ہے۔ کیا حضورؐ نے خود اس نور کا تذکرہ نہیں کیا جو آپؐ کے جسم اطہر میں اتر گیا تھا؟ حضورؐ کی یہ وہی پسندیدہ دعا ہے جو ایک کے بعد آنے والی دوسری صدی میں عقیدت مند مسلمانوں کی سب سے بیش قیمت متاع ہے:

یا اللہ! میرے دل کو اپنے نور سے بھر دے، اور میری روح کو اپنے نور سے منور کر دے، میری زبان کو اپنے نور سے لبریز کر دے، میری آنکھوں کو اپنے نور سے روشن کر دے، میرے کانوں میں اپنا نور ڈال دے، میرے دائیں اور بائیں جانب اپنا نور رکھ دے، میرے پیچھے اور میرے آگے اپنا نور دھر دے، میرے اوپر اور میرے نیچے اپنا نور مزین کر دے، میرے رگ و پے کو اپنے نور سے سرشار کر دے، میرے گوشت پوست میں اپنا نور بھر دے، میرے خون میں اپنا نور دوڑا دے، میرے بالوں اور میری کھال میں اپنا نور داخل کر دے! مجھے اپنا نور عطا فرما، میرے نور میں اضافہ فرما اور مجھے نور بنادے! (Padwick: Muslim Devotions, p.212)۔

مقاتلؒ کی شرح اور تفسیر کی بنیاد پر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نورانی کردار سے متعلق نظریات نویں صدی کے آخری عشروں میں پروان چڑھنے لگے۔ یہ عراق کے صوفی سہل التستریؒ (وفات ۸۹۶عیسوی) تھے جنہوں نے نور محمدیؐ کی اصطلاح کے تناظر میں اس پورے مسئلے کا جائزہ لیا۔ ان کے نظریات بھی سورہ نور سے ماخوذ تھے۔ دور حاضر میں سہل التستریؒ کے ترجمان بوورنگ Bowering نے اپنی کتاب The Prophet of Islam میں پیغمبر اسلامؐ کے رول کا جائزہ لیتے ہوئے تستریؒ کے نظریے کی اس طرح وضاحت کی ہے:

تستریؒ کا دعویٰ ہے کہ خدا، جو قائم بالذات اور واحد مطلق یکتا اور ماورائے ادراک حقیقت ہے، الوہیت اور

احدیت کا نور اور انسانی رسائی سے باہر ایک راز ہے۔ ازل سے پہلے اس کا ظہور مثل نور ہ (اس کے نور کی مانند) ہوا جس سے مراد نور محمدؐ ہے۔ ازل سے پہلے نور محمدؐ کے مبدا اور منبع کی صورت گری خدا کی موجودگی میں تو اس نور کے ابتدائی عشق سے کی جا سکتی ہے جس نے بعد میں خدائی نور کے ایک شفاف مینار ''عمود'' کی شکل اختیار کر لی چناں چہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اولیں تخلیق اسی نور سے ہوئی ہے۔ سورہ نور کی اصطلاح کی تشریح کرتے ہوئے تستریؒ نے لکھا ہے: ''جب خدا نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تخلیق کرنے کا ارادہ کر لیا تو اس نے اپنے نور سے ایک نور کو پیدا کر دیا۔ جب یہ نور حجاب الاعظم کے قریب پہنچا تو وہ خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔ خدا نے اس کے سجدے سے نور کے شفاف شیشے کی مانند ایک طاقت ور ستون کو پیدا کر دیا جو ظاہر اور باطن میں نیم شفاف تھا جس میں روشنی گزر سکے لیکن آر پار دکھائی نہ دے۔''

دل چسپ بات یہ ہے کہ تستریؒ نے قرآن کریم کی سورہ النجم کو بھی نور محمدؐ سے باہم مربوط کر دیا ہے۔ انہوں نے حضورؐ کے ابتدائی مشاہدے یا سفر معراج کے ضمن میں اس سورہ کی تشریح نہیں کی بلکہ ان کا دعویٰ ہے کہ سورہ النجم کی ۱۳ویں آیت میں جو کہا گیا ہے: ''اس نے اسے ایک مرتبہ اور بھی دیکھا تھا'' اس سے مراد یہ ہے کہ نبی کریمؐ نے کون (وقت) کی تخلیق کے موقعے پر اللہ کو اس وقت دیکھا تھا جب نور محمدؐ کا مینار خدا کے سامنے کھڑا تھا۔

لاکھوں سال پہلے کائنات کی تخلیق سے قبل حضورؐ نے خدا کے سامنے کھڑے ہو کر عبودیت کا اقرار کیا اور یہ کہ ''سدرۃ المنتہیٰ'' کے پاس (سورہ النجم آیت ۱۴) بیری کا ایک درخت ہے جو انسانی علم وادراک کی آخری حد ہے۔

پھر جب تخلیق کائنات کا عمل شروع ہوا تو خدا نے نور محمدؐ سے آدمؑ کو تخلیق کیا۔

پیغمبروں کا نور، نور محمدؐ سے ہے اور آسمانی بادشاہت ملکوت کا نور، نور محمدؐ سے ہے اور اس دنیا اور اگلی دنیا کا نور، نور محمدؐ سے ہے۔

بوورنگ نے تستریؒ کے نظریے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''آخر جب لازمانی میں پیغمبروں کی ارواح اور روحانی کائنات کی تخلیق کا عمل مکمل ہو گیا تو اس کے بعد حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جسم اطہر کو آدمؑ کی مٹی سے، جو خود نور محمدؐ سے لی گئی تھی، دنیاوی اور خاکی ہیئت میں متشکل کر دیا گیا۔ اس طرح تخلیق نور کا عمل پایہ تکمیل تک پہنچ گیا چناں چہ پہلے انسان کو نور محمدؐ کے بلوریں قالب میں ڈھال کر آدمؑ کی مجموعی شخصیت وجود میں آ گئی۔'' (Bowering: The Prophet of Islam, p.54)۔

اس کا مطلب یہ ہے، جیسا کہ ابن عربیؒ نے تستریؒ کے تین سو سال بعد کہا کہ رسول کریمؐ کی حیثیت انسانی نسل کے بیج بیدھر کی سی ہے۔ (Deladriere: La Profession de Foid Ibn-Arabi,p.130)۔ اور شاعر حضرات اس

قول متناقض کو اشارے کنائے میں کہنے سے کبھی نہیں تھکتے کہ اگر چہ بظاہر آپ آدمؑ کی اولاد ہیں لیکن اصل میں حضورؐ کا جوہر آدم علیہ السلام سے پہلے موجود تھا۔

تستریؒ کی حد درجہ بلند فکری اور تحقیق کو، جس نے تصوفانہ خیالات پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں، ان کے مرید حلاجؔ نے کتاب الطّواسین کے پہلے باب طاسین السراج میں زیادہ صراحت کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے:

ترجمہ: آپؐ پوشیدہ ہستی کے نور سے ایک روشن چراغ تھے...... روشن و تاباں چاند جس کا محل کرہ اسرار سے ہے۔ حق (خدا) نے آپؐ کو اعلیٰ اوصاف کے باعث امی کے لقب سے یاد کیا ہے

پیغمبری کے چراغ حضورؐ کے نور سے فروزاں ہیں اور کوئی اور آپؐ کے نور سے زیادہ روشن و تاباں نہیں

اس حقیقت کو پوری طرح ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ یہ الفاظ آں حضرتؐ کی رحلت کے بعد تین سو سال سے بھی کم مدت میں لکھے گئے تھے اور اس وقت سے لے کر آج تک اس نورانی پیغمبرؐ کا تذکرہ تصوف اور شاعری کی ہر کتاب میں ہر جگہ کیا جاتا ہے۔ اپنے رفیع الشان مرتبے کے متعلق خود حضورؐ کے کئی ارشادات موجود ہیں، مثال کے طور پر آپؐ نے فرمایا: ''خدا نے سب سے پہلے جو چیز تخلیق کی، وہ میرا نور تھا۔'' ایک اور حدیث کے مطابق رسول اللہؐ نے فرمایا: ''میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں۔'' اس میں کوئی شک نہیں کہ آپؐ کا رول اسلام کے مرکزی سورج یا مکمل چاند جیسا ہے۔ حلاجؔ کے دوست شبلیؔ نے، جو اپنے مرکز سے قدرے منحرف ہو گئے تھے، بستر مرگ پر ایک ایسا شعر پڑھا جو اب بھی قوالیوں میں گایا جاتا ہے:

ترجمہ: جس گھر میں آپؐ کا بسیرا ہو اُسے کسی چراغ کی ضرورت نہیں
اور قیامت کے دن جب گواہیاں لائی جائیں گی
تو آپؐ کا چہرہ انور ہی میرا گواہ ہو گا

گو کہ اس شعر کو رسول کریمؐ کی مدح سرائی قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن اس کا اہم پہلو یہ ہے کہ اسے اس وقت سے حضورؐ کے رخ روشن کا بالواسطہ حوالہ سمجھا جا رہا ہے۔

ابن عربیؒ نے بعد میں آنے والے صوفیوں میں نور محمدؐ کے مرکزی کردار کے نظریے کو فروغ دیا: ''پہلا نور غیر مرئی کے پردے اور مادی صورت میں موجود ہونے کے علم سے ظاہر ہوا تھا۔ یہ ہمارے پیغمبر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نور تھا۔'' ابن عربیؒ اپنے عقیدے اور ایمان کا اقرار کرتے ہوئے سراجاً منیر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا آفتاب سے موازنہ کرتے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ عقل، ارواح، الہام و وجدان اور شعور ذات، یہ سب چیزیں محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جوہر نور سے پروان چڑھتی ہیں اور حضورؐ ہی آفتاب موجودات ہیں۔

ابن عربیؒ اور ان کے شارح عبدالکریم الجیلیؒ کے نظریات پورے عالم اسلام کی شاعری پر آج تک اثر انداز ہوتے رہے ہیں اور بے شمار شاعروں نے حضورؐ کی اس طرح تعریف کی ہے کہ بعض اوقات غیر مسلموں کو اس پر صدمہ نہیں، حیرت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جیلیؒ نے حقیقت الحقائق کا ذکر کیا ہے جو اصل میں حقیقت محمدیہ اور ازل سے پہلے سفید یاقوت (یاقوت بیضا) کے مصداق ہے۔ خدا نے اس پر نظر ڈالی تو وہ لہروں اور پانی کی دوسری اشیا میں تحلیل ہو گیا جس سے کائنات کی دیگر مخلوقات وجود میں آ گئیں۔ (جیلیؒ جنہیں نکلسن نے Studies in Islamic Mysticism, p.122 میں نقل کیا ہے)۔ لیکن یہ روایت بہت پرانی ہو چکی تھی کیوں کہ ثعلبیؒ نے سنہ ایک ہزار عیسوی کے فوراً بعد جو کتاب عرائس البیان لکھی، اس میں ایک رنگین افسانوی حکایت بیان کی گئی ہے جس میں مرکزی کردار ایک ''چمک دار ہیرے'' کا ہے۔ ابن عربیؒ کے ایک ہم عصر نجم رضی دیا نے، جو ابن عربیؒ کے پیروکار نہیں تھے، شاعرانہ انداز میں تخلیق کائنات کا ایسا ہی قصہ بیان کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نور محمدؐ سے نکلنے والے پسینے کے موتی جیسے قطروں سے وہ مادہ پیدا ہوا جس سے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی تخلیق کیے گئے تھے۔ (Goldziher: Neuplatonische Und gnostische Element in Hadith)۔ یہی وہ روایت ہے جس کی بنیاد پر ترکی اور بنگال کے شاعر نور محمدؐ کے حیرت انگیز رول کے متعلق نغمہ سرا ہوئے ہیں، مثال کے طور پر خاقانیؔ نے ترک زبان میں لکھے گئے حلیہ میں کہا ہے:

ترجمہ: خدا (حق) کو اس نور سے محبت تھی اس لیے اس نے کہا ہے: ''میرے محبوب دوست (حبیبی)''!

اور وہ اس نور پر عاشق ہو گیا......

اور پھر اس اساسی نور سے جلال خداوندی اور شرم وحیا کے باعث پسینے کے قطرے بہنے لگے اور ہر قطرے سے ایک نبی پیدا ہو گیا۔ بعد میں اس نور سے حرارت، سمندروں، آبی بخارات اور اجرام سماوی نے جنم لیا۔

ابن عربیؒ سے پہلے صوفیائے عظام نے ازل سے پہلے کے مینارہ نور کے بارے میں تستریؒ کے خیالات کا محبت آمیز لفظوں میں تذکرہ کیا ہے اور قرون وسطیٰ کی فارسی شاعری میں عطارؒ کی طرف سے منطق الطیر کے تعارف میں لکھے گئے ان شعروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ پراثر اور دل نشین انداز میں حضورؐ کی مدح سرائی کی گئی:

ترجمہ: غیر مرئی بحر عمیق سے سب سے پہلے جو ظاہر ہوا
وہ خالص نور تھا — اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہونا چاہیے
اس پرشکوہ نور نے آثار وعلامات کو بے نقاب کیا — عرش
کرسی، لوح اور قلم اسی سے پیدا ہوئے
اس خالص نور کے ایک حصے سے کل عالم

اور دوسرے حصے سے آدمؑ اور نسل انسانی پیدا ہوئی

جب یہ عظیم نور چمکا تو

اپنے خالق کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا

مدتوں یہ نور سجدے کی حالت میں پڑا رہا

رکوع و سجود کی حالت میں کئی زمانے بیت گئے

برسوں یہ نور سیدھا ہو کر دعا کرتا

اور مدتوں خدا کی توحید کا اقرار کرتا رہا

نور کے اس بحرِ عمیق کی یہ دعا

آپؐ کی امت کے لیے عبادت کا سرچشمہ بن گئی

نہ صرف بڑے بڑے فاضل شاعر بلکہ اپنا ہی کلام گا کر سنانے والے مغنی اور مطرب بھی نورِ محمدؐ کے تذکرے میں پیش پیش رہے اور یہ لوگ صف اول کے شاعروں پر بھی سبقت لے گئے۔ چناں چہ تیرہویں صدی کے آخر میں یونس ایمرے نے خدا کی زبان میں کہا:

ترجمہ: میں نے آپؐ کو اپنے نور سے پیدا کیا ہے

میں کل بھی آپؐ سے محبت کرتا تھا اور کل بھی محبت کروں گا

آپؐ کے بغیر میں ان دنیاؤں کا کیا کروں گا؟

میرے محمدؐ! میرے نور سے بنے احمدؐ!

تقریباً اسی زمانے میں ہندوستان کے ایک صوفی نے فارسی میں لکھا:

ترجمہ: یہ خدا (حق) کا نور ہے جسے پیغمبر کی ذات میں متشکل کیا گیا ہے

ٹھیک اسی طرح جیسے چاندنی سورج سے مستعار لی گئی ہے

سندھ کا کلہوڑا شہزادہ سرفراز خان، جس نے ۱۷۷۴ء میں قید کے دوران حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رقت انگیز حمد و ثنا لکھی ہے، اپنے ان گنت پیشرو شاعروں کی تائید کرتے ہوئے کہتا ہے:

ترجمہ: آپؐ کا نور ہر چیز سے پہلے روشن و تاباں تھا

اس وقت نہ تو کوئی مخلوق تھی، نہ کوئی فرشتہ تھا اور نہ ہی زمین و آسمان موجود تھے

مولانا رومیؒ نے رسول کریمؐ کے اولیں نور کے حیرت انگیز محاسن بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

ترجمہ: اگر حضورؐ کے نور کی لاکھوں کروڑوں شاخوں میں سے صرف ایک شاخ سے پردہ ہٹ جائے
تو ہزاروں عیسائی پادری کفر والحاد کے پیرہن فوری طور پر پھاڑ دیں

اسی طرح جامیؔ آں حضرتؐ کی مدح سرائی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نور محمدؐ مسلمانوں کے حالات کو تبدیل کرسکتا ہے:

ترجمہ: جس کسی پر آپؐ کی رحمت اور شفقت کا سورج (مہر) چمکے
طلوع سحر کی طرح پوری دنیا میں اس کا چہرہ سرخ وسفید ہوگا

اور ان سے پہلے رومیؔ نے پھر یہ سوال کیا تھا:

ترجمہ: ہم کسی غلطی کے کس طرح مرتکب ہوسکتے ہیں؟
ہمیں تو احمدؐ کے نور نے گھیرے میں لے رکھا ہے

یہ نور محمدؐ کی خصوصیت میں شراکت ہی ہے جو ایک سچے مسلمان کا طرۂ امتیاز ہے اور جب وہ اپنے آپ کو نور قدیم میں غرق کردیتا ہے تو دوزخ اسے کہے گی: ''تمہارے نور نے میری آگ کو سرد کردیا ہے۔'' (فروزانفر: احادیث مثنوی نمبر ۱۳۴)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آگ تخلیق کی گئی ہے اور اس کا خاصا یہ ہے کہ وہ بجھ جاتی ہے لیکن اس کے برعکس حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نور چوں کہ ازل سے پہلے عالم وجود میں آیا تھا، اس لیے اس میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوسکتی۔

ایک مختلف سطح پر نورالانوار کی حیثیت سے نبی کریمؐ کے مقام کو اس افسانوی داستان کے ساتھ منسلک کردیا گیا ہے کہ حضورؐ کا سایہ نہیں تھا۔(Paret: Die Legendare Maghazi Literatur, p.174)۔ نجم رضی نے آں حضرتؐ کے اس معجزے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: ''نبی کریمؐ کے بارے میں ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ آپؐ آفتاب تھے اس لیے سورج کا کوئی سایہ نہیں ہوتا۔'' ایک اور نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو چوں کہ آپؐ ''دین اسلام کے شہنشاہ'' تھے اور بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے، اس لیے سائے کا سایہ نہیں ہوا کرتا۔ (Razi: The Path of God's Bondsmen, p.156)۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپؐ کا نور تاریک رات میں ایک چراغ کی مثل ہے۔ خوش نویسوں نے فطری طور پر یہ محسوس کیا ہے کہ نور محمدؐ کے سبب رسول کریمؐ کے کسی بھی حقیقی اسم گرامی محمدؐ، احمدؐ، حامدؐ اور محمودؐ اور حضورؐ کے لقب رسول اللہؐ پر عربی تحریر میں کوئی نقطہ نہیں ہے چناں چہ جب بھی آں حضرتؐ کا اسم مبارک لکھا جائے تو آپؐ کا نور کسی نقطے سے آلودہ نہیں ہوتا۔

بعض علاقوں میں نور محمدؐ کے بارے میں خیال آرائیاں کی گئی ہیں یا آپؐ کے رسالت کے اعلیٰ منصب کے سلسلے میں دیومالائی نظریہ پروان چڑھا ہے چناں چہ بنگال کے پندرھویں صدی کے صوفی شاعر شیخ چاند نے لکھا ہے کہ تخلیق کے عمل کے آغاز سے متعلق نظریہ راسخ الاعتقاد اور شاعرانہ ذہن نہ رکھنے والے مسلمانوں کے لیے یقیناً قابل قبول نہیں البتہ ابن عربیؒ اور ان کے جانشینوں کی تحریروں میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، وہ کم و بیش تمام مسلمانوں میں یکساں طور پر معروف و مقبول ہیں:

ترجمہ: نور کے رب (اللہ) نے، جس کے ہاتھ میں چھڑی تھی، مشرق کی طرف دیکھا

تو نور محمدؐ سے تخلیق کا عمل شروع ہو گیا

اس نور کو خود اللہ اپنے دل سے عالم وجود میں لایا تھا

نور محمدؐ کو شعور، شوق، ولولے، عقل، مقصدیت، قوت اور موت کے خصائص سے کس طرح بہرہ مند کیا گیا، اس کا تذکرہ کرنے کے بعد شاعر کہتا ہے:

ترجمہ: پھر خدا نے کن کا لفظ کہا

چناں چہ یہ دو حروف (کاف اور نون) پیدا ہو گئے

غرض ان دو حرفوں کو ملا کر خدا نے اپنی خواہش کا اظہار فرمایا

کاف کا حرف کلمہ اور نون کا حرف نور کی نمائندگی کرتا ہے

اللہ نے نور سے محبت کے سبب اس کائنات کو تخلیق کیا

نور کے حسن کو دیکھ کر وہ مسحور ہو گیا

پس وہ اس نور کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس کی طرف دیکھا......

ان شعروں سے شیخ چاند اور خاقانی کے خیالات میں مماثلت کی عکاسی ہوتی ہے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ایک طرف سہل التستریؒ، حلاجؒ اور ابن عربیؒ کے خیالات کے درمیان تضادات پائے جاتے ہیں تو دوسری طرف اماموں کے نور سے متعلق شیعوں کے عقاید بھی قرین قیاس ہیں البتہ ان میں ٹھیک ٹھیک ربط پیدا کرنا بہت مشکل ہے۔ اسی طرح ان یونانی اور مسیحی نظریات کے اثرات کا تعین کرنا بھی ایک مشکل کام ہے جو نور سے متعلق پورے صوفیانہ نظام اور ان روایات پر اثر انداز ہوئے ہیں جن میں حضور سرور کونینؐ کی ذات اقدس کو انسان سے ماورا بلند ترین مرتبے پر متمکن کیا گیا ہے۔ پیغمبروں کے متعلق صوفیانہ نظریات کے اس پہلو پر خاصی تحقیق ہو چکی ہے لیکن مکمل تاریخی تصویر ابھی تک نا تمام ہے۔

i- Goldziher: Neuplatonische und gnostisehe elemente in hadith

ii- Andrae: Die Person Muhammads

iii- Nyberg: Ibn-al-Arabi

iv- Nicholson: Studies in Islamic Mysticism

اس نظریے کو فروغ دینے کے پس منظر میں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام مخلوقات میں نورِ حقیقی ہیں، آپ کو ہر لحاظ سے بلند ترین مرتبے پر سرفراز اور انسانوں میں سب سے بلند مقام پر فائز کرنے کی خواہش کارفرما ہے۔ لیکن اس رجحان کو فروغ دیتے وقت اس حقیقت کو فراموش کر دیا گیا کہ بعض ابتدائی صوفیوں نے، جن میں رابعہ بصریؒ (وفات ۸۰۱ عیسوی) شامل ہیں، یہ دعویٰ کیا تھا کہ خدا کی محبت نے ان کی روح کو اس قدر لبریز کر دیا ہے کہ اب رسول کریمؐ کی محبت کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ (عطار: منطق الطیر نیز نکلسن The Idea of Personality)۔ لیکن ایک صدی کے بعد جب ایک صوفی الخرازؒ نے خواب میں حضورؐ سے یہی کہا تو انہیں یہ جواب ملا: ''جو کوئی خدا سے محبت کرتا ہے، اسے مجھ سے محبت کرنی چاہیے۔'' بعد میں آنے والے کئی صوفی بھی رسول کریمؐ کو بلند ترین مرتبے پر فائز شخصیت قرار دینے سے خوف زدہ تھے، مثال کے طور پر شبلیؒ نے نماز کے لیے اذان دیتے ہوئے (جو دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصے میں خدا کی وحدانیت اور دوسرے حصے میں آں حضرتؐ کی رسالت کا اقرار کیا گیا ہے) خدا سے مخاطب ہو کر کہا: ''یا اللہ! اگر تیرا حکم نہ ہوتا تو میں تیرے سوا کسی اور کا ذکر نہ کرتا۔'' (قشیریؒ: رسالہ صفحہ ۱۷)۔ لیکن بعد میں آنے والے کئی صوفیوں نے ان خدشوں کو دور کر دیا کہ رسول کریمؐ کا نمایاں طور پر ذکر کرنے سے خدا کی وحدانیت کو، جو بے مثل ہے، کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے؟ علی بن عثمان الہجویریؒ نے بایزیدؒ کے آسمانی سفر کا حوالہ دیا ہے جس میں انہوں نے گھبراہٹ میں خدا سے یہ سوال کیا تھا: ''مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' خدا نے جواب میں کہا: ''اے ابو یزید! تمہیں اپنی ذات سے رہائی پانے کے لیے میرے محبوبؐ کی پیروی کرنی چاہیے۔ اس کے پاؤں کی خاک کو اپنی آنکھوں سے لگاؤ اور اس کی مسلسل اتباع کرتے رہو۔'' (علی ہجویریؒ: کشف المحجوب صفحہ ۲۸۳)۔

کم سے کم مقاتلؒ کے زمانے سے رسول کریمؐ کی تصوفانہ تکریم میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہونے لگا۔ اب کئی احادیث نقل ہونے لگیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ حقیقی معنوں میں تخلیق کائنات کا مقصد اور اول و آخر ہیں۔ ایک حدیث کے مطابق آں حضرتؐ نے فرمایا: ''میں اس وقت بھی پیغمبر تھا جب آدمؑ ابھی پانی اور مٹی میں تھے''۔ (یعنی ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے)۔ (ابونعیم: دلائل الخیرات صفحہ ۱۶)۔

رسول کریمؐ سے یہ حدیث بھی مروی ہے: ''خدا نے سب سے پہلے جو چیز تخلیق کی، وہ میری روح تھی۔'' لیکن

آپؐ سے بعض متضاد بیانات بھی منسوب ہیں: ''خدا نے سب سے پہلے جو چیز تخلیق کی، وہ قلم (جو حضورؐ کی روح کے مماثل ہے) تھا یا عقل۔'' نجم رضی نے ان بظاہر تینوں متضاد احادیث کو نہایت مہارت کے ساتھ یک جا کرتے ہوئے آں حضرتؐ سے متعلق ان حدیثوں کی اس طرح تشریح کی ہے: ''جب خدائے ذوالجلال نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی روح کو تخلیق کیا اور محبت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو شرم سے اس کے دو حصے ہو گئے۔ خدا کے قلم کا ایک حصہ رسول کریمؐ کی روح اور دوسرا حصہ حضورؐ کی عقل بن گیا۔ (Razi: The Path of God's Bondsmen, p.78)

اس سارے عمل میں اس حدیث قدسی (وہ وحی جو قرآن کے علاوہ ہو) کو مرکزی حیثیت حاصل ہے جس میں خدا نے کہا ہے: ''لولاک ماخلقنا الافلاک'' یعنی اگر میں آپؐ کو پیدا نہ کرتا تو افلاک کو تخلیق نہ کرتا۔ (فروزانفر: احادیث مثنوی نمبر ۵۴۶)۔ یہ روایت شعری کلام میں خاص طور پر مرکزی اہمیت اختیار کر گئی کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اکثر ''لولاک کا سلطان'' یا سلطان دوجہاں کہا جاتا ہے۔ ایک اور حدیث قدسی، جو حضورؐ کے اعلیٰ ترین منصب کا ثبوت ہے اور جسے اکثر نقل کیا جاتا ہے، تمام مسلمانوں، خاص طور پر ہندوستان میں بہت مقبول ہے: ''اے محمد! عرش معلیٰ سے لے کر تحت الثریٰ تک ہر چیز میری رضا کی طلب گار ہے اور میں آپؐ کی رضامندی کا آرزومند ہوں۔''

متاخر صوفیوں اور شاعروں نے اس حدیث قدسی کا بلا تامل حضورؐ کی ذات پر اطلاق کیا ہے جس میں کہا گیا ہے: ''کنت کنزاً مخفی، میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا اور میں چاہتا تھا کہ مجھے پہچانا جائے چناں چہ میں نے دنیا کو تخلیق کر لیا۔'' (فروزانفر: احادیث مثنوی نمبر ۷۰)۔ ازل سے پہلے تنہائی میں خدا کی یہ خواہش تھی کہ وہ پہچانا جائے اور اس کے ساتھ محبت کی جائے، سو اس نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنے نور اور حسن کے آئینے کے طور پر پیدا کیا — ایک ایسا آئینہ جس میں وہ محبت بھری نظروں سے خود کو دیکھ سکے۔ چناں چہ اس حدیث کی کہ ''جس نے مجھے دیکھا، اس نے حق (خدا) کو دیکھا'' یہ تشریح کی گئی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حقیقی معنوں میں حسن لایزال کا کامل نمونہ اور خدا کے تمام اسمائے حسنیٰ اور صفات ربانی کا مظہر ہیں جن کے ذریعے خدائی جمال اور کاملیت کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ ابن عربیؒ نے ''چھپے ہوئے خزانے'' کی حدیث قدسی کو اپنے فکری نظام کا مرکز و محور بنایا ہے اور ان کے جانشین اور شعری ترجمان مولانا جامیؔ اور کئی دوسرے شاعروں نے اس حدیث کی روشنی میں اشعار لکھے ہیں:

ترجمہ: ''میں ایک مخفی خزانہ تھا'' اس سے آپؐ کی حقیقی فطرت واضح ہوگئی ہے

آپؐ کی ذات پاک ہی نور حقیقی کا پرتو ہے

نبی کریمؐ کو تخلیق کائنات کا ثمر اور بیج یا بلند و بالا درخت بھی سمجھا جاتا ہے جو کائنات یا زندگی کے درخت سے متعلق قدیم افسانوی داستانوں کا عکس ہے۔ مولانا رومیؒ نے ساحل سمندر پر موجود ایک درخت کے بارے میں کسی کے خواب کی یہ تشریح کی ہے: ''لامحدود سمندر خدائے ذوالجلال کی عظمت اور بلند درخت حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات بابرکات کی ترجمانی کرتا ہے جب کہ اس درخت کی شاخیں پیغمبروں کے مرتبے اور اولیا کے مقام کی آئینہ دار ہیں، بڑے بڑے پرندے، ان کی ارواح اور طرح طرح کے نغمہ و آہنگ میں مدح سرائی سے ان کی زبانوں کے اسرار و رموز کی عکاسی ہوتی ہے۔ (افلاکی: مناقب العارفین صفحہ ۳۷۹)۔ واقعہ یہ ہے کہ قرون وسطیٰ کے مسلمان اس جیسے بے شمار نظریات سے روشناس تھے جن کا پیغمبر اسلامؐ کی حیات طیبہ کے تاریخی حقائق سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اس کی مثال ہندوستان میں مسلمانوں کا لٹریچر ہے۔ (ابن عربی شجرۃ الکون: Razi: The Path of God's Bondsmen, pp.92,159,390)۔ سولہویں صدی میں منجھن نے نور محمدؐ کا ذکر کرتے ہوئے اپنی رزمیہ نظم میں لکھا ہے:

ترجمہ: محمدؐ کائنات کے درخت کی اساس اور جڑ ہیں
پوری کائنات آپؐ کی شاخ کی مانند ہے
خدا نے نولاکھ کا تاج حضورؐ کے سر پر پہنایا
دنیا میں ایسا کوئی نہیں جو آپؐ کے مثل ہو
آپؐ جسم کے مانند ہیں اور پوری دنیا آپؐ کا عکس ہے
آپؐ ہی مخفی خالق ہیں جنہیں ہر کوئی پہچانتا ہے
اس حقیقت کو کوئی نہیں جانتا کہ محمدؐ اصل میں خدا کا مظہر ہیں
جو دکھائی بھی دیتے ہیں اور نظروں سے اوجھل بھی ہیں، آپؐ کی کوئی حد نہیں
اسی نے محمدؐ کی شکل و صورت اختیار کر لی ہے
اسی صورت کا نام محمدؐ ہے......

(White: Sufism in Medieval Hindi Literature, pp.128-29)

اس عقیدے کو کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا جوہر ازل سے موجود تھا، سب سے پہلے سہل التستریؒ اور حلاجؒ نے تفصیل کے ساتھ پیش کیا۔ الثعلبیؒ جیسے مصنفوں نے نہایت فصیح و بلیغ الفاظ میں اس کی تحسین کی اور ابن عربیؒ نے اسے باضابطہ اور منظم انداز میں ترتیب دیا۔ اس کے بعد یہ عقیدہ تصوف کے رگ و پے میں سرایت کر گیا

چناں چہ انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان میں نقشبندی سلسلہ تصوف کے ایک بزرگ نے اپنی کتاب ''شان محبوب'' میں لکھا ہے:

محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جوہر کا بیج نیستی کی زمین میں پوشیدہ اور غیر مرئی تھا۔ جب ہستی مطلق اور محبوب حقیقی (خدا) کا سورج اس پر چمکا اور جب اس بیج کو، جو ''تمام جہانوں کے لیے رحمت'' ہے، بحر کرم کا پانی ملا تو اس نے لاوجود کی زمین سے اپنا سر اٹھایا چناں چہ زمین سے عرش اور مشرق سے مغرب کے درمیان ہر چیز محمدی جوہر کے مقدس رحم سے عالم وجود میں آ گئی۔ اس وقت خدا نے لولاک کہہ کر حضورؐ سے فرمایا کہ اگر میں آپؐ کو پیدا نہ کرتا تو کچھ بھی پیدا نہ کرتا:

محمدؐ نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا

ابن عربیؒ کے بعد تصوف کی دنیا میں رسول کریمؐ کا ازلی جوہر، جسے حقیقت محمدیہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، پیغمبرانہ سرگرمیوں کا سرچشمہ بن گیا۔ حقیقت محمدیہ (اس اصطلاح کا ترجمہ عام طور پر ''اولیں محمدؐ'' کیا جاتا ہے) کا ظہور سب سے پہلے آدمؑ اور ان کے بعد دوسرے تمام پیغمبروں میں ہوا یہاں تک کہ ایک مرتبہ پھر تاریخی محمدؐ میں یہ نور ظاہر ہوا اور یہی نور بالآخر تخلیق کائنات کا حرف اول اور حرف آخر ثابت ہوا۔ ایک پیغمبر کی حیثیت سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ظہور ازل سے پہلے کے نور محمدؐ کی جامعیت اور کاملیت کا مظہر ہے اور یہ آپؐ ہی کا وجود اطہر ہے جس کی بدولت گردش تخلیق اپنے منطقی انجام تک پہنچی ہے کیوں کہ آپؐ خاتم النبیین ہیں۔ عربی روایت میں ابن فرید (وفات ۱۲۳۵ء) وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے چناں چہ وہ اپنی کتاب ''تیئیہ'' میں لکھتے ہیں:

ترجمہ: اورسابق پیغمبروں میں ایسا کوئی نبی نہیں تھا جس نے اپنی قوم کو حق کی دعوت دی
اور اس میں محمدؐ کا لطف وکرم شامل نہ ہو کیوں کہ یہ سب نبی آپؐ ہی کے پیروکار تھے

i- Nicholson: Studies in Islamic Mysticism, pp.253-54

ii- Ibn al-Farid's, Taiyya

iii- Andrae: Die Person Muhammads, p.353

بعد کی شاعری میں ان نظریات کو تواتر کے ساتھ دہرایا گیا۔ فارسی زبان میں یہ جامیؔ تھے جنھیں یہ موضوع خاص طور پر بہت پسند تھا چناں چہ انھوں نے اپنی طویل رزمیہ نظموں میں حضورؐ کے اس معجزانہ پہلو کو اجاگر کیا۔ مولانا جامیؔ کے مطابق آں حضرتؐ سے پہلے جتنے بھی پیغمبر اس دنیا میں تشریف لائے، ان کا پیغام محض حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جامع پیغام کا ایک ٹکڑا تھا:

ترجمہ: حضورؐ کا نور آدمؑ کی پیشانی سے ظاہر ہوا

چناں چہ فرشتے آپؐ کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے

نوحؑ جب طوفان کی زد میں آ گئے

توانہوں نے کشتی چلاتے ہوئے آپؐ ہی سے امداد طلب کی

آپؐ ہی کے لطف و کرم کی خوشبو ابراہیمؑ تک پہنچی

اور آتش نمرود میں ان کا گلاب کھل اٹھا

حضورؐ کے لطف و عنایات کے دربار میں

یوسفؑ کی حیثیت محض سترہ درہم کے غلام کی سی تھی

یہ آپؐ ہی کا نور تھا جس نے موسیٰؑ کی آگ کو روشن کیا

اور یہ آپؐ ہی کے لب مبارک تھے جنہوں نے عیسیٰؑ کو مردے زندہ کرنے کا سبق سکھایا

مولانا جامیؔ کے یہ اشعار یہ سمجھنے میں ہماری معاونت کر سکتے ہیں کہ بعد میں آنے والے صوفیائے کرام حقیقت محمدیہ کے ساتھ یک جا ہونے کے لیے کیوں جدوجہد کرتے رہے ہیں جسے راہ حق کے متلاشی اب آخری مقام سمجھنے لگے تھے۔ اس راہ پر چل کر وہ بلندیوں کو چھونے لگے اور آخر کار پچھلے تمام پیغمبروں کے مراحل طے کر کے ان پر سبقت لے گئے۔ غرض صوفی ایک لمحے یہ محسوس کر سکتا ہے کہ وہ موسیٰؑ اور کسی دوسرے وقت ابراہیمؑ یا نوحؑ کے مقام پر پہنچ گیا ہے اور طوفان کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ صوفی یا صوفیائے عظام کسی ایک مقام پر ہی ٹھہرے رہیں کیوں کہ بلند پروازی اور حقیقت محمدیہ کے ساتھ یک جائی صرف چند ایک لوگوں کا ہی مقدر ہو سکتی ہے۔ بعض ممتاز صوفیوں نے حقیقت محمدیہ کی جانب پرواز کے واقعات بیان کیے ہیں اور تصوف کے مختلف سلسلوں کے رہنماؤں نے اپنی شاعری میں مختلف مقامات اور احوال کا تذکرہ کیا ہے۔ (افلاکی: مناقب العارفین صفحہ ۶۱۴)۔ چناں چہ مصر میں تصوف کے ایک سلسلے کے بانی ابراہیم الدسوقیؒ نے تیرہویں صدی میں کہا:

ترجمہ: ہاں! مجھے آدمؑ سے پہلے آپؐ سے محبت تھی

میں عرش کی بلندیوں پر احمدؐ کے نور کے ساتھ تھا

ابن عربیؒ کے زیر اثر، جن کا دعویٰ تھا کہ وہ سرورِ کونینؐ کی مکمل فطرت یا التابع الجامعیہ اور مقام محمدی یا المقام المحمدی کے وارث ہیں، اس صنف کی شاعری کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ خود ابن عربیؒ کو ۳۳ سال کی عمر میں (۹۸-۱۱۹۷ء) میں اعلا الاعلیٰ کی موجودگی میں خلعت فاخرہ پہنا کر مقام محمدی کا وارث بنایا گیا تھا اور وہ علیٰ قلب محمدؐ پر

خاتم الاولیا بن گئے۔(Deladrier: La Profession de Foid Ibn Arabi, p.49)۔اس دعوے کے بعد ان کے نظریات میں جرأت اور مبہم جوئی کا عنصر غالب آ گیا البتہ یہ بات خاص طور پر دل چسپ ہے کہ ان کے نو جوان ہم عصر شمس تبریزؒ نے، جو مولانا رومیؔ کے طاقت ور محرک تھے، اپنے تبصرے میں کہا: اگر چہ ابن عربی کا بیان ہے کہ ''محمدؐ ہمارے چلمن بردار ہیں'' اس کے باوجود ''انہوں نے حقیقی معنوں میں رسول کریمؐ کی اتباع نہیں کی۔'' یہ ایک ایسا الزام ہے جسے صوفی مخالف مسلمان آج تک دہرار ہے ہیں۔ (افلاکی: مناقب العارفین صفحہ ۲۹۶)۔

ابن عربی کے نظام میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک جامع الصفات شخصیت ہیں جنہیں ''سب سے مقدس و برتر اور اعلیٰ ذات خداوندی نے پروان چڑھایا ہے'' (الفائد الاقدس الاعلیٰ)۔ آپؐ ایک کامل انسان ہیں جن میں خدائی صفات اور اسمائے حسنیٰ بدرجہ اتم موجود ہیں اور ان صفات کا آپؐ کی ذات میں مکمل عکس دکھائی دیتا ہے۔

i- Deladrier: La Profession de Foid Ibn-Arabi, p.49

ii- Nicholson: Study in Islamic Mysticism

iii- S.Q.A. Hussain: The Pantheistic Monism of Ibn-al Arabi, p.58

چناں چہ حقیقت محمدیہ کے ساتھ یک جا ہونے والوں نے یہ دعویٰ کر دیا کہ انہیں حضورؐ کی مکمل فطرت ودیعت ہوئی ہے یا انہوں نے الجامعی کا لقب اختیار کر کے خود کو ممیز کر لیا (جیسا کہ میر دردؔ نے پیغمبروں کے مختلف مدارج اور روحانی منازل طے کرنے کے سلسلے میں تفصیلات بیان کی ہیں۔ (دردؔ: علم الکتاب صفحہ ۵۰۵ نیز این میری شمل: Mystical Dimensions of Islam, pp.377-78)۔ ان نظریات میں رسول کریمؐ کو ایک ایسی شخصیت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو کائنات کی ہر صفت کا مظہر یا آئینہ کائنات ہیں جس میں پوری کائنات سموئی ہوئی ہو۔ وہ حقیقی معنوں میں ایک ایسا آئینہ ہیں جنہیں خدا نے اپنی تعریف و توصیف کے لیے تخلیق کیا ہے، جیسا کہ ابن عربی کے مرید کاشانیؒ نے سورہ الاعراف کی ۵۴ ویں آیت (بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے سب آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا ہے، پھر عرش پر قائم ہوا۔ مترجم) کی تفسیر کرتے ہوئے کہا ہے: ''عرش پر کون قائم ہوا تھا؟'' اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دل کے عرش پر، خدا نے حضورؐ کو اپنے تمام محاسن سے متصف کر کے اپنے آپ کو مکمل طور پر ظاہر کر دیا۔ (افلاکی: مناقب العارفین، صفحہ ۲۶۵)۔

ایک انسان کامل کی حیثیت سے رسول کریمؐ کا منصب خدا اور کائنات کے درمیان رابطہ کار جیسا ہے یا اسے برزخ کے نام سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے جو ناگزیر اور حادثاتی وجود کے مابین ایک خاکنائے کی مانند ہے۔ ابن عربیؒ کے مکتبہ فکر

کی رو سے ایک درمیانی واسطے کی حیثیت سے حضور سرور کائناتؐ کا رول کلمہ شہادت کے ہر لفظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ (Schuon: Le Soufisme p.113)۔اس اعتبار سے رسول اللہؐ ان دہری خصوصیات کے حامل ہیں: غور وفکر کرنے والا اور اخذ یا قبول کرنے والا۔ آپؐ خدائی الہام کے پیکر اور اس دنیا میں خدا کی منشا کو نافذ کرنے میں سرگرم ہیں۔ چوں کہ آپؐ تخلیق کائنات کا اولیں سرچشمہ ہیں، اس لیے فلسفے کی طرف مائل صوفیوں کے نزدیک آپؐ کا علم آفاقی عقل کے برابر ہے البتہ بعض اوقات حمدیہ شاعری میں آفاقی عقل کو بھی آپؐ کے مقابلے میں طفل شیر خوار کہا گیا ہے۔ اور گو سب سے پہلے آپؐ کو تخلیق کیا گیا تھا لیکن بشریت کے لبادے میں آپ کو سب سے آخر میں بھیجا گیا۔ اس دہرے رول میں آپؐ کو خدا کے تمام اسمائے حسنیٰ سے متصف کیا گیا ہے جب کہ اس کے برعکس ایک نارمل انسان صرف ایک مرتبہ عالم وجود میں آتا ہے۔ چناں چہ قرآن کریم کی سورہ المائدہ کی تیسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے: ''آج میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنا انعام بھرپور کر دیا اور تمہارے لیے اسلام کے دین ہونے پر رضامند ہو گیا۔'' یہ آیت حجۃ الوداع کے موقعے پر آں حضرتؐ پر نازل ہوئی تھی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول کریمؐ پیغمبری کے سب سے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خاتم النبیین کی حیثیت سے بھی رسالت کے پیغام کو تکمیلی صورت میں انسانوں تک پہنچایا ہے۔ جس طرح علم ریاضی کی ایک رقم میں تمام اعداد موجود ہوتے ہیں، ٹھیک اسی طرح خاتم النبیین ہونے کے ناتے آپؐ میں گزشتہ پیغمبروں کے تمام اوصاف یک جا کر دیے گئے تھے۔ یہ تمام پیغمبر عزت وتکریم کے لحاظ سے بھی آپؐ کے ساتھ شامل ہیں۔

صوفیوں نے نثر اور بعد میں شاعری میں ازلی اور ابدی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جو تفصیلات بیان کی ہیں، وہ نہایت پرشکوہ اور حد سے زیادہ تعریف وتوصیف سے لبریز ہیں اور ان کا شعری حسن روشن وتاباں ہے۔ لیکن یہ حمد وثنا رسول کریمؐ کے ان سنجیدہ اور متین بیانات کے بالکل برعکس ہے جن میں حضورؐ نے فرمایا تھا: ''میں تو صرف ایک انسان ہوں جس پر خدا کی طرف سے وحی نازل ہوتی ہے۔'' اس ضمن میں تصوف کے ایک اہم سلسلے قادریہ کے بانی عبدالقادر جیلانیؒ (جن کے عقیدت مندوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، وہ بارہویں صدی میں ابن عربیؒ کی پیدائش کے ایک سال بعد فوت ہوئے) کی بلند پایہ تحریروں میں سے ایک مثال (بہجۃ الاسرار) یہاں پیش کی جاتی ہے:

رسول کریمؐ کو جمال وجلال کی تمام اعلیٰ خوبیوں سے سرفراز کیا گیا تھا، آپؐ کو تمام کلمات عطا کیے گئے، خیمہ افلاک حضورؐ کے نام گرامی کی بدولت ایستادہ ہے۔ آپؐ فرشتے (جبریلؑ) کی کتاب کے کلمہ کا راز اور ان کلمات کا معنی ہیں جن کے ذریعے زمین وآسمان تخلیق کیے گئے تھے۔ آپؐ اس کاتب تقدیر کا قلم ہیں جس نے تخلیق کی گئی تمام چیزوں کے نام لکھے ہیں۔ دنیا کی نظروں میں آپؐ ایک مبتدی ہیں، ایک ایسا آقا جس نے وجود کائنات پر اپنی مہر ثبت کی ہے۔ آپؐ

وہ ہیں جنہیں وحی کے پستانوں سے دودھ پلایا گیا ہے۔ آپؐ ازل کے بھید کو جاننے والے ہیں، ابدیت، لامحدود اور لازمانی کی زبان کے ترجمان ہیں۔ آپؐ ہی خدا کی حمد کا پرچم (لواالحمد) اٹھائے ہوں گے۔ آپؐ رسالت کے جھومر کا مرکزی ہیرا اور پیغمبروں کے تاج کا نگینہ ہیں۔ آپؐ علت کے اعتبار سے اول اور وجود کے لحاظ سے آخر ہیں۔ آپؐ کو غم واندوہ کا پردہ چاک کرنے، مشکلات کو آسان کرنے، دلوں سے غم کا غبار دور کرنے، روح کی افسردگی کو تسکین دینے، روحوں کے آئینے کو چمکانے، دلوں کی تاریکیوں کو منور کرنے، دل کے غریب کو دولت مند کرنے اور ارواح کو بیڑیوں سے آزاد کرنے کی غرض سے ناموس اکبر کے ساتھ اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔(Andrae: Die Person Muhammads pp.338-39)۔

جیسا کہ حدیث قدسی میں ارشاد ہوا ہے، محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی تخلیق کائنات کا واحد مطمحِ نظر اور منزل مقصود ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ ایک حقیقت ہے کہ صرف آپؐ ہی کی ذات گرامی کی وجہ سے اس دنیا کا وجود قائم ودائم ہے اور یہ صرف آپؐ ہی کی ذات بابرکات ہے جو خدا اور بندوں کے درمیان رابطے کا واحد ذریعہ ہے۔

سید حسین نصر نے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ یہ سب تشریحات، جو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تاریخی تصویر سے لگا نہیں کھاتیں، وہ ہر لحاظ سے منطقی ہیں کیوں کہ مسلمانوں کو اپنے پیغمبرؐ سے بے حد عقیدت ہے اور گو کہ قرآن کریم میں حضورؐ کو یہ یاددہانی کرائی گئی ہے اور آں حضرتؐ نے بھی یہ فرمایا ہے کہ ''میں بھی تمہاری طرح بشر ہوں'' لیکن متقی اور پرہیز گار مسلمانوں نے اس آیہ مبارکہ کے فوراً بعد یہ کہا ہے: ''آپؐ کا یہ ارشاد بالکل سچ ہے لیکن آپؐ کا مرتبہ پتھروں کے درمیان لعل یاقوت کی مانند ہے۔'' (Nasr: Ideals and Realities of Islam, p.88)۔ اگرچہ نبی کریمؐ بظاہر دوسرے انسانوں جیسے ہیں لیکن باطنی طور پر آپؐ خدائی نور کے حامل ہیں جس کی شعاعیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تیزی سے نظر آنے لگی ہیں۔ سید حسین نصر اُن ان گنت مسلمان صوفیوں اور شاعروں کے ہم نوا ہیں جو ان سے پہلے اسی قسم کے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ غالبؔ نے جب انیسویں صدی کی دہلی میں حضورؐ کو امام کہہ کر پکارا جو تسبیح کے دانوں میں ممتاز اور منفرد مقام رکھتا لیکن تسبیح کا جزو لاینفک ہے تو اس کی مراد یہ تھی کہ رسالت مآبؐ کو ''پتھروں میں یاقوت'' کا درجہ حاصل ہے۔ مغرب کے قارئین کو اس موازنے کا مطلب سمجھنے کے لیے یہ بات پوری طرح ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ مشرقی روایات میں لعل یاقوت سورج کی شعاعوں کو صبر وتحمل سے جذب کر کے عام پتھروں سے ممتاز مقام حاصل کرتا ہے چناں چہ سورج کی روشنی پتھر کی ہیئت کو مکمل طور پر تبدیل کر دیتی ہے۔ اس تشریح کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ رسول کریمؐ ایک انسان کی حیثیت سے خدائی نور کو منعکس کرتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ نور زیادہ معنی خیز اور بامقصد ہو جاتا ہے۔

اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ رسول اللہؐ کی اس دہری فطرت کا یہ نظریہ، جہاں تک ہمیں معلوم

ہے، سب سے پہلے حلاجؒ نے پیش کیا تھا جس کے مطابق حضورؐ سراج (چراغ) اور نبوت کے مدارج پر فائز ہیں۔ آپؐ ازل سے پہلے موجود تھے لیکن پیغمبر کی حیثیت سے آپؐ کا رول زمین پر ظہور کے بعد شروع ہوا۔ (حلاج: کتاب الطواسین)۔

کئی حضرات صوفیہ کے نظریے کے مطابق حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بعض اوقات مطاع (جس کی اطاعت کی جائے) کہا گیا ہے۔ یہ لقب قرآن کریم کی تعلیمات سے ماخوذ ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی اطاعت کرنے کا حکم دیا ہے۔ (میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے والے چلنے پھرنے والے ستاروں کی اور رات کی جب جانے لگے اور صبح کی جب چمکنے لگے یقیناً یہ ایک بزرگ رسول کا کہا ہوا ہے جو قوت والا ہے، عرش والے (اللہ) کے نزدیک بلند مرتبہ ہے۔ جس کی (آسمانوں میں) اطاعت کی جاتی ہے، امین ہے۔ سورہ التکویر آیات ۱۵ تا ۲۱۔ مترجم)۔ سعدیؔ کے نزدیک آپؐ رسول مطاعون ہیں (جس رسول کی اطاعت کی جائے) اور جامیؔ آپؐ کو انسانوں کے لیے مطاع اور خدا کے لیے مطیع کہہ کر پکارتے ہیں۔

غزالیؔ کی دقیق کتاب مشکوٰۃ الانوار (چراغوں کے لیے طاق) میں قرآن حکیم کی سورہ نور کے مطابق حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیثیت کے بارے میں رمز و کنائے کی تشریح کرتے ہوئے مطاع کو عقل سلیم کی ایک نوع قرار دیا گیا ہے ــــ ایک ایسی ذات جسے دنیا کی رہنمائی کا فریضہ سونپا گیا ہو۔ ایک ایسی آفاقی قوت جس پر نظام کائنات اور اس کی گردش کا دار و مدار ہو۔ خدا اور مطاع کے درمیان تعلق کا موازنہ نور کے ناقابلِ رسائی جوہر اور سورج کی مرئی روشنی سے کیا جا سکتا ہے۔ (Gairdner: Al-Ghazzali's Miskkat-al-anwar: Nicholson: Studies in Islamic Mysticism, p.11)۔ غزالیؔ کی اس کتاب کے ابتدائی شارح ان کے نظریات سے الجھن میں پڑ گئے اور اسلام، ایمان اور عرفان سے متعلق ان کے خیالات کے بارے میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہو گئے جن کے خلاف وہ ان تھک جدوجہد کرتے رہے تھے۔ لیکن نبی کریمؐ کے ساتھ عقیدت اور محبت کی تاریخ کے سلسلے میں ان کے نظریات دوسرے حضرات صوفیہ کے عقاید سے گہری مماثلت رکھتے تھے۔

ابن عربیؔ کے بعد ان کے پیروکاروں نے، جن میں چودھویں صدی کے آخر میں عبدالکریم الجیلیؔ کے انسانِ کامل کے نظریے کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، پوری قوت کے ساتھ اس نکتے کی وضاحت کی کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کائنات میں سب سے پہلے تخلیق کیا گیا: انسانوں کی نظر میں آپؐ کی حیثیت ایک مبتدی کی ہے لیکن اصل میں آپؐ کامل انسان ہیں، آپؐ کا وجود خدا اور انسانوں کے درمیان رابطے کے لیے ضروری ہے جن کے ذریعے خدا ظاہر ہو، جانا جائے اور اس سے محبت کی جائے۔ عبدالکریم الجیلیؔ نے آں حضرتؐ کے متعلق اپنے نظریات اجمالاً

اس طرح بیان کیے ہیں:

ذرات وطبیعیات کا مادہ، الوہیات کا فلک اطلس، اوج ربوبیات کے برجوں کا منطقہ، بلندیوں اور ترقیوں کے فخر کے آسمان علم ودرایت کا آفتاب، کمال ونہایت کا ماہِ کامل، ہدایت وبرگزیدگی کا ستارہ، حرارت ارادہ کی آگ، غیب وشہادت کی زندگی کا پانی، رحمت وربوبیت کے سانس کی بادِ صبا، زمین ذلت وعبودیت کی طینت، سبع مثانی (سورہ فاتحہ) کا صاحب، کنجیوں اور (عذاب ونعیم کی) جوڑہ جوڑہ آیات کا مالک، کمال کا مظہر، جمال وجلال کا مقتضا، یہ سب اسی مکرم ومعظم رسولؐ کے القاب ہیں:

ترجمہ: وہ معنئ حسن کا آئینہ، ہر عالی شے کا مظہر
کمال کی جلوہ گاہ، چشمہ شیریں ہے
وہ قطب ہے فلک محاسن پر، جب سے اس کا آفتاب طلوع ہوا پھر غروب نہیں ہوا
ہر کمال جو اس کے مجموعی حسن سے پراگندہ ہوا ہے، رائی کے ایک دانے سے تعبیر کیا جاتا ہے
رحمت ہو اللہ تعالیٰ کی اس پر اور اس کی آل اور اصحاب پر جو اس کے احوال، افعال اور اقوال میں اس کے قائم مقام ہوئے

مسلمانوں کا یہ عقیدہ کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جنبشِ کائنات کا اصول ہیں، رسول کریمؐ کی شان میں لکھے گئے نعتیہ کلام کی اساس ہے اور یہ نعتیں نہ صرف عربی بلکہ فارسی، ترکی اور اردو زبانوں میں بھی پڑھی جاتی ہیں۔ حضورؐ کی پیدائش اور سفر معراج سے متعلق نعتیہ کلام سے ان کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے اور بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شعرا کرام آں حضرتؐ کو پرشکوہ ناموں اور القابات سے پکارنے اور حد سے زیادہ تعریف کرنے کے معاملے میں علمائے دین سے بھی سبقت لے گئے ہیں۔ ابن عربیؒ سے بہت پہلے سنائیؒ اور عطارؒ نے نبی کریمؐ کی مدح وثنا میں جو اشعار لکھے، ان میں آپؐ کے فقر واستغنا کے پہلو کو نہایت عقیدت کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ کے بارے میں یہ نظریات بہت پہلے سے رائج تھے۔ ابن عربیؒ کے بعد، جن کی تعلیمات کو تیزی کے ساتھ پھیلتے صوفیوں کے مختلف سلسلوں میں تسلیم کیا گیا اور ان کی تشہیر کی گئی ہے، ان نظریات کی تصوف کی ہر سطح پر پذیرائی ہوئی ہے اور مراکش سے لے کر ہندوستان تک کے شاعروں نے نعتیہ شاعری میں ان کا بھرپور اظہار کیا ہے۔

بعد میں آنے والے صوفی شاعروں نے رسول کریمؐ کو اس سپیدۂ سحر کے طور پر پیش کیا ہے جو تخلیق کی گئی زندگی کی رات اور ربانی نور کے دن کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتا ہے اور جس سے خدائی دن کا آغاز ہوتا ہے چناں چہ سندھ میں اٹھارویں صدی کا ایک نقشبندی صوفی کہتا ہے:

ترجمہ: حقیقت محمدیہ کے عجائبات بھی نرالے اور قابل تعریف ہیں

آپ کو مولا اور آقا نہیں کہا جا سکتا

لیکن آپ مخلوق بھی نہیں ہیں

آپ کی حیثیت اس طلوع سحر کی سی ہے

جو دن اور رات کو یک جا کرتی ہے

مختلف حیثیتوں سے نبی کریم کا رول مختلف ہے، خاتم النبیین کی حیثیت سے اس دنیا کے لیے آپ کا درجہ انگوٹھی میں نگینے کا ہے کیوں کہ بادشاہ اس نگینے پر لکھی گئی تحریر سے خزانوں پر اپنی مہر ثبت کرتا ہے۔ ابن عربی کی معرکۃ الآرا کتاب فصوص الحکم کے بعد آنے والی صدیوں میں اسلامی لٹریچر میں مہر نبوت سے متعلق بیش بہا مواد شائع ہوا ہے لیکن ان تمام مصنفوں نے ابن عربی سے ہی فیضان حاصل کیا ہے۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے رول کی عارفانہ تشریح کے ضمن میں قرآنی تلمیحات کے مسلسل نئے معانی ظاہر کیے گئے ہیں۔ قرآن کریم کی ۵۴ ویں سورہ القمر کی پہلی آیت "قیامت قریب آ گئی اور چاند پھٹ گیا" ہو، ۹۳ ویں سورہ الضحیٰ میں "قسم ہے چاشت کے وقت کی" ہو، سورہ بنی اسرائیل میں "پاک ہے وہ اللہ جو اپنے بندے کو رات ہی رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے آس پاس ہم نے برکت دے رکھی ہے، اس لیے کہ ہم اسے اپنی قدرت کے بعض نمونے دکھائیں یقیناً اللہ تعالیٰ ہی خوب دیکھنے سننے والا ہے" ہو، سورہ نجم ہو یا قرآن حکیم کی سورہ الکوثر، مفسروں نے ان کی تشریح کے سلسلے میں ہمیشہ جرأت مندانہ انداز اختیار کیا ہے۔ قرآن مجید کی مختصر سورہ الکوثر حضرات صوفیہ میں ہمیشہ مقبول رہی ہے اور بیشتر صوفیائے عظام کا خیال ہے کہ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کے لیے نہایت عظیم الشان نعمتوں کا ذکر کیا ہے اور اس مقصد کے لیے بے حد خوب صورت الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ لفظ کوثر کا مصدر کثر یعنی کثرت اور بہتات ہے۔ اسے جنت کے متبرک حوض کے نام سے موسوم کیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ آں حضرتؐ کے خصوصی امتیاز کی بھی علامت ہے۔ اس سورہ مبارکہ میں حضورؐ کے دشمن اور بدگو کو ابتر کہا گیا ہے۔ (ابتر ایسے شخص کو کہتے ہیں جو مقطوع النسل یا مقطوع الذکر ہو یعنی اس کی ذات پر ہی اس کی نسل کا خاتمہ ہو جائے۔ مترجم)۔ اس سورہ کی مثالی تشریح اٹھارویں صدی میں سندھ کے نقشبندی صوفی عبدالرحیم گرہوری نے کی ہے۔ انہوں نے سندھی کی ایک طویل نظم میں سورہ الکوثر کی جو تفسیر بیان کی ہے، اس میں جامیؔ کے پرشکوہ کلام کا یقیناً نمایاں اثر ظاہر ہوتا ہے جو خود بھی نقشبندی سلسلے کے رکن تھے۔ لیکن اس معاملے میں وہ ہرات کے استاد سے بھی آگے نکل گئے ہیں چناں چہ انہوں نے حضورؐ کی شان میں اللہ تعالیٰ سے یہ شاندار الفاظ منسوب کیے ہیں:

ترجمہ: میں نے اتنے زیادہ انعام واکرام آپ ؐ کے سوا کسی اور کو نہیں دیے
آپ ؐ حوضِ کوثر کے ساقی ہیں، دلیری سے اسے تقسیم کرتے رہیے
اے میرے حبیب ؐ! میں نے اختیارات کی چابیاں آپ ؐ کے ہاتھ میں دے دی ہیں
زمین وآسمان کے علوم احمد ؐ کے لیے تحفہ ہیں
اے دوست! میں نے فلسفیوں کا گوہر اور آدم کی کیمیا آپ کو عطا کی ہے
عیسیٰ کو اس اکسیر کے ایک مختصر حصے سے نوازا گیا تھا
جس سے مردے زندہ ہو جاتے اور بہرے سننے لگتے تھے
وہ اندھوں کو چشم بینا دیتے اور کوڑھیوں کو شفایاب کرتے تھے
جو کچھ تورات میں بیان ہوا وہ اس سمندر سے ایک گھونٹ کے مصداق ہے
یوسف کا تمام تر حسن و جمال اس تحفے کی ایک علامت تھا
اے احمد ؐ! آپ ؐ کی محبت کا صرف ایک چھوٹا سا حصہ زلیخا تک پہنچا ہے
جنت اس سمندر کا ایک حصہ ہے جیسے سمندر کی برف
دوزخ آپ ؐ کے دروازے پر ایک بھکاری کی مانند ہاتھ پھیلا کر مانگتی ہے
آپ ؐ کی اجازت کے بغیر اس میں کافروں کو جلانے کی طاقت نہیں
جنت محبت بھری نظر کی طرح آپ ؐ کے پروقار ظہور کا نام ہے
اے پاک دامن ذات! آپ ؐ کی نگاہ غضب دوزخ کی مانند ہے
آسمان، زمین، عرش، کرسی، جن و بشر اور فرشتے
اے میرے محبوب ؐ! ہمیشہ آپ ؐ ہی کے محتاج ہیں
انسانیت کو آپ ؐ ہی کے نور کی بدولت شرف ملا
اے میرے محبوب ؐ! غنچے اور پھول آپ ؐ ہی کی وجہ سے مہک رہے ہیں

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ازلی مقام اور کائنات کی تاریخ میں آپ ؐ کی مرکزی حیثیت کے متعلق اس قسم کے رفیع الشان نظریات کی بدولت عین ممکن تھا کہ آپ ؐ کے بارے میں بے سروپا افسانوی صورت گری کی جاتی، خاص طور پر عوام کی سطح پر فرضی قصے کہانیاں وضع کی جاتیں لہٰذا ان حالات میں ہمہ اوست ''وہی سب کچھ ہے'' کا ایرانی نظریہ پروان چڑھنے لگا اور جاہل مطربوں اور شاعروں نے اس نظریے کی آڑ میں وہ کچھ کہنا شروع کر

دیا ہے ''ملحدانہ'' بیانات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ دراصل اس کام میں ان کی یہ خواہش کارفرما تھی کہ جس قدر ممکن ہو، نبی کریم کی زیادہ سے زیادہ تعریف و تحسین کی جائے۔ لیکن زیادہ سنجیدہ اور متین علما اور اسکالرز اس کارروائی کے خطرات سے پوری طرح آگاہ تھے۔ جب ایک شاعر نے یہ کہنے کی جرأت کر دی:

ترجمہ: اس دنیا کے ہادی و رہنما کے مرتبے کا کیسے علم ہو سکتا ہے؟

اگر تم اللہ تک پہنچنا چاہتے ہو تو محمدؐ ہی کو اللہ جان لو

تو اس خطرے سے کس طرح چشم پوشی کی جا سکتی تھی؟

ابن عربی کے نہایت مخلص پیروکاروں پر بھی غالباً ایسے خیالات کا اظہار کرنے سے کپکپی طاری ہو جاتی کیوں کہ ''مالک بہ ہر صورت مالک ہے اور غلام، غلام ہوتا ہے!''

ایسا لگتا ہے کہ پورا عالم اسلام، خاص طور پر ہندوستانی ماحول حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے متعلق تخلیق کائنات کے قصے کی مذہبی زیب و زیبائش، آراستگی اور خیال آرائی سے بخوبی آگاہ تھا اور یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ قرون وسطیٰ کے بنگالی شاعر شیخ چاند، جن کے نور محمدؐ کے بارے میں خیالات کا پہلے تذکرہ ہو چکا ہے، ازل سے موجود نبی کریمؐ کے جسم اطہر سے کائنات کی تخلیق کا ویدوں کے قدیم نظریات کے پس منظر میں جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں:

ترجمہ: سات آسمان حضورؐ کے جسم مبارک کے سات حصوں سے تخلیق کیے گئے

پہلا آسمان دہن میں سے اور دوسرا پیشانی کے اوپر بنایا گیا

تیسرا آسمان نتھنوں میں، چوتھا بالائی ہونٹ

پانچواں فلک آپؐ کے گلے میں

چھٹا سینہ مبارک کے اندر

اور ساتواں آسمان ناف میں ہے

عبدالکریم الجیلی کے کلاسیکل نظام میں فرشتوں کو رسول کریمؐ کی روحانی قوتوں سے تخلیق کیا گیا تھا۔ (اسرافیل کو حضورؐ کے قلب مبارک اور عزرائیل کو آپؐ کی عقل سلیم سے پیدا کیا گیا وغیرہ۔ (Nicholson: Studies in Islamic Mysticism, pp.115-16)۔ شیخ چاند اپنے سامعین کو بتاتے ہیں کہ ملائکہ کو آں حضرتؐ کے جسم اطہر سے تخلیق کیا گیا ہے:

ترجمہ: اسرافیل کو آپؐ کی ناک

عزرائیل کو کان

جبرئیل کو دہن

اور میکائیل کو آپ کی آنکھوں سے پیدا کیا گیا

ان میں سے ہر مقرب فرشتے کے ساتھ مزید ستر ہزار ملائکہ تخلیق کیے گئے

ہر فرشتے اور اس کے جسم کے ہر بال سے ایک اور فرشتہ پیدا کیا گیا

۳۰ کروڑ بالوں سے ۳۰ کروڑ فرشتے پیدا کیے گئے

اس طرح کائنات کی تخلیق کے عمل کا آغاز نور محمدؐ سے ہوا

اور جیسا کہ مصنف نے آگے چل کر لکھا ہے، یہ تمام مخلوق حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مرید بن گئی۔ رسول اللہؐ کے بلند ترین اور بے نظیر مرتبے کی روشنی میں ہمیں اس بات پر حیرت کا اظہار نہیں کرنا چاہیے کہ حضورؐ کے اسم مبارک کو ان گنت دعاؤں سے یاد کیا جاتا ہے یہاں تک کہ کامیابی اور امداد کے حصول کی خاطر لکھے گئے تعویذوں میں بھی آپؐ کا نام استعمال ہوتا ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال فارسی میں مناجات کن فیکون کے عنوان سے لکھی جانے والی وہ طویل دعا ہے جس میں نہ صرف رسول کریمؐ کے تمام اسمائے گرامی بلکہ صحابہ کرامؓ، اماموںؒ اور ولیوں کے ناموں کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے اور حضورؐ کا اسم مبارک واسطے اور وسیلے کے طور پر لکھا گیا ہے:

ترجمہ: محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے کردار (خو) اور آپؐ کے گیسوؤں کے صدقے

آپؐ کے دل اور مٹی (گِل) کے وسیلے سے

آپؐ کے جمال اور کمال کے صدقے

آپؐ کے ذوق اور شوق کی وساطت سے

آپؐ کی طریقت اور شریعت کے طفیل

آپؐ کے تاج اور معراج کے صدقے

آپؐ کے سفر اور ظفر کی وساطت سے

آپؐ کی شفاعت اور شجاعت کے طفیل (ایس بی بخاری: جواہر الاولیا، صفحات ۴۷۴ تا ۴۹۱)

ان سے بہت پہلے قاضی عیاضؒ نے الشفا میں، جس کا حوالہ تور آندرے نے اپنی کتاب Die Person Muhammads میں دیا ہے، لکھا ہے کہ حضرت آدمؑ نے جنت سے نکالے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ سے بحق محمدؐ (محمدؐ کے وسیلے سے۔ مترجم) معافی کی دعا کی تھی۔

بیماریوں اور دکھ درد سے نجات کے لیے خدا سے ایک اور دعا مانگی جاتی ہے، جس میں کہا جاتا ہے:

ترجمہ: دنیا میں کوئی بیماری اور تکلیف ایسی نہیں ہے، جس کا مداوا نہ ہو

خدایا! اپنے پیغمبرؐ کے صدقے مجھے ان دکھوں سے نجات دلا!

حضورؐ کے اسم گرامی کے بعد صحابہ کرامؓ کے ناموں کا واسطہ دیا جاتا ہے اور ایک ایک صحابیؓ کا نام لیا جاتا ہے۔ اس طرح تمام صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ کے ناموں کے وسیلے سے دعا ختم کی جاتی ہے (یا آں حضرتؐ کے اسم مبارک کے بعد تصوف کے تمام سلسلوں کے بانیوں کا نام لیا جاتا ہے) لیکن ان تمام دعاؤں میں نبی کریمؐ کے نام کا واسطہ دیا جاتا ہے۔ غرض آپؐ کے وسیلے کو تمام دعاؤں میں مرکزی نقطے کا درجہ حاصل ہے۔ ان دعاؤں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ متقی اور پرہیزگار مسلمانوں کو حضورؐ کی ذات گرامی پر کس قدر پختہ یقین ہے، وہ آپؐ پر بھروسا کرتے ہیں جو انبیا کے سلسلے کی پہلی اور آخری کڑی ہیں۔

یہ بات نہایت حیرت انگیز ہے کہ اسلام کی تصوفانہ روایت، خاص طور پر تیرہویں صدی کے بعد حضرات صوفیہ میں آپؐ کو جو مرکزی اور اساسی مقام حاصل ہے، اس کے باوجود بہت سے بیرونی ناقد اس حقیقت سے غافل رہے کہ مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں آں حضرتؐ کے رول کو کس قدر بلندی اور رفعت حاصل ہے! یہ بات ہندوستان میں مسلمانوں کی شاعری کے بعض ہندو مبصروں کی مثال سے واضح ہوگئی ہے۔ ہر چند کہ کئی ہندو مسلمان اولیائے کرام سے گہری عقیدت رکھتے تھے اور انہوں نے اردو اور سندھی میں حضورؐ کی شان میں نعتیں بھی لکھی ہیں، اس کے باوجود یوں لگتا ہے کہ بہت سے ہندو پیغمبر اسلامؐ کی ذات پاک سے مسلمانوں کی دلی عقیدت کا صحیح ادراک نہیں کر سکے۔ اس کی ایک مثال لیلا رام وطن مل کی ہے جس نے ۱۸۸۹ عیسوی میں سندھی کے صوفی شاعر شاہ عبداللطیفؒ کے متعلق پہلی جامع کتاب شائع کی تھی۔ اس نے نہایت منکسرانہ انداز میں لکھا ہے:

شاہ لطیف نے بھی اپنے رسالو میں مختلف مقامات پر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پیغمبر بلکہ اس سے بھی بڑھ کر بلند ترین شخصیت کی حیثیت سے تسلیم کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کی تعریف و توصیف میں کہے گئے کئی اشعار زبان کے اعتبار سے عامیانہ اور غیر معیاری ہیں بلکہ اصل میں یہ شعر ہمارے شاعر نے نہیں کہے...... لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں کئی اصلی اور حقیقی اشعار موجود ہیں جن میں ہمارے شاعر نے پیغمبرؐ پر مکمل ایمان کا اظہار کیا ہے...... راسخ العقیدہ مسلمان آپؐ کو خدا کا سب سے عظیم المرتبت پیغمبر کہہ سکتے ہیں، وہ اپنے وحدت الوجودی نظریات کی روشنی میں مسلسل یہ کہتے رہے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی نجات کا واحد ذریعہ ہیں...... ممکن ہے کہ شاہ لطیف بتدریج اور دھیرے دھیرے اپنے مریدوں کو تصوف کے اعلیٰ مرتبے تک پہنچانے کے

لیے ان کے ذہن میں سب سے پہلے اپنے پیغمبرؐ کی عظمت کا نقش بٹھانے کے آرزومند ہوں۔

سندھی اور پنجابی کی صوفیانہ شاعری کے دوسرے تمام ہندو شارحین کی طرح لیلا رام وطن مل بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ صوفی ازم کم وبیش وحدت الوجودی فلسفے کی ایک شکل ہے اور یہ کہ تصوف کو ویدانت نظریے (جس میں کائنات اور خدا کو ایک سمجھتے ہیں) کی روشنی میں اسلامی سانچے میں ڈھال لیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ لوگ اسلام کی ظاہری شکل وصورت کے متعلق کچھ علم رکھتے ہوں لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ مسلمان نبی کریمؐ کے شافع محشر، آپؐ کے نور، انسان کامل اور پہلے اور آخری پیغمبرؐ ہونے کے ناتے آپؐ کے ساتھ کس قدر عقیدت رکھتے ہیں جس کا وہ کئی صدیوں سے مختلف النوع صورتوں اور علامتوں کے ذریعے مسلسل اظہار کرتے چلے آ رہے ہیں اور اسے دنیائے اسلام کے وسیع حلقوں کے دینی مشاہدے میں فیصلہ کن عنصر کی حیثیت حاصل ہے۔

لیکن ہمیں اس اہم حقیقت کو ہمیشہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ اگرچہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بلندترین اور روشن وتاباں رفعتوں پر فائز کیا گیا ہے اور جس طرح مسیحیت میں عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کی نشانی قرار دیا گیا ہے، اسی طرح مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق رسول کریمؐ کو تمام مخلوقات میں افضل ترین مقام حاصل ہے، آپؐ انسان کامل ہونے کے باوجود عبدہٗ یعنی اللہ کے بندے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کل مخلوقات میں آپؐ اللہ تعالیٰ کے محبوب ترین انسان ہیں۔ گو کہ بعض شاعر حضرات اپنے جوش عقیدت میں مدح وثنا کے مناسب حدود کو پار کر جاتے ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی روایت میں مسیحی عقیدے کی طرح حلول کرنے کا کوئی وجود نہیں تھا اور نہ ہی یہ ممکن ہے۔ کٹر مسلمان کئی صدیوں سے رسول اللہؐ کی ذات سے حد درجہ صوفیانہ عقیدت واحترام کے بڑھتے ہوئے رجحان سے ناخوش ہیں اور وہ اسے مبالغہ آرائی پر محمول کرتے ہیں جو اسلام کی حقیقی روح کے منافی ہے۔ وہ بجا طور پر یہ کہتے ہیں کہ اسلام کا مرکز ومحور حضورؐ کی شخصیت نہیں، خدا کا وہ کلام ہے جو وحی کی صورت میں آں حضرتؐ پر نازل ہوا اور قرآن کریم میں محفوظ ہے البتہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعری کی تشکیل، مسلمانوں کے تقوے اور پرہیزگاری اور انسانی نصب العین کے حصول کے ضمن میں رسول کریمؐ کے ساتھ بے پناہ محبت اور عقیدت کو فیصلہ کن عنصر کی حیثیت حاصل ہے جس کے ذریعے وہ اپنے قابل قدر جذبات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ تمام مسلمان نبی کریمؐ کی حیات مقدسہ کے انسانی پہلو اور آپؐ کے ساتھ ذاتی رابطے کے امکان کی بدولت، جو خدا کے مقابلے میں کہیں زیادہ قابل رسائی ہیں، طمانیت اور آسودگی کے احساس سے مسرور نظر آتے ہیں ——— زمانہ بعد کے اسلامی تصوف کا ''ایمان وعرفان'' کا یہ رجحان غالباً منطقی نتیجہ ہے کیوں کہ انسان اور شخصی خدا کے درمیان، جو بیک وقت خالق،

پروردگار اور منصف ہے، براہ راست ملاقات بظاہر ممکن نہیں چناں چہ خدا پرست تخیل نے نبی کریمؐ کی ذات بابرکات
کے ساتھ عقیدت کی جانب رخ کر لیا جو تمام تر تصوفانہ شان و شوکت کے ساتھ اب بھی ایک ایسی شخصیت کے طور پر
ہمارے سامنے ہیں جن کی طرف اُن کی ہم عصر مخلوق محبت، امید اور تحسین کے جذبات سے سرشار ہو کر متوجہ ہو سکتی
ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان ہمیشہ نئے، رنگین اور وجد آور لفظوں میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔

میلادالنبیؐ کی تقریبات

سترھویں صدی کے ایک ترک درویش نے لکھا ہے:

ترجمہ: جس رات پیغمبرؐ پیدا ہوئے

بلاشبہ وہ رات لیلۃ القدر جیسی ہے

لیلۃ القدر سے مراد وہ رات ہے جب پہلی مرتبہ حضورؐ پر قرآن کریم نازل ہوا تھا۔ اس کا تذکرہ ۹۷ ویں سورہ القدر میں اس طرح کیا گیا ہے:

''یقیناً ہم نے اسے شب قدر میں نازل فرمایا۔ تو کیا سمجھا کہ لیلۃ القدر کیا ہے؟ شب قدر ایک ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔'' اس کے ایک سو سال بعد الجزائر کے مالکی مفتی ابن عمارؒ نے حضورؐ کے یوم ولادت کی برتری کے حق میں تین عالمانہ ثبوت پیش کیے: (۱) آں حضرتؐ کے یوم ولادت نے پوری دنیا کو رسول اللہؐ عطا کیے لیکن لیلۃ القدر خاص طور پر آپؐ کے لیے تھی۔ (۲) حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ظہور ''فرشتوں کے اترنے'' کے مقابلے میں، جس کا ذکر سورہ القدر میں کیا گیا ہے، امت کے لیے زیادہ اہم ہے کیوں کہ فرشتوں کی نسبت آں حضرتؐ کہیں برتر ہیں اور (۳) حضورؐ کا یوم ولادت پوری کائنات کے لیے حد درجہ اہم دن ہے جب کہ قرآن حکیم کی پہلی وحی کا نزول خاص طور پر مسلمانوں کے لیے اہمیت کا حامل واقعہ ہے۔ اس استدلال سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرون وسطیٰ کے آخر میں نبی کریمؐ کی ذات گرامی کے ساتھ مسلمانوں کی محبت اور عقیدت میں کس قدر اضافہ ہو گیا تھا اور عوام اور خواص کے دلوں میں یہ جذبہ کس قدر سرایت کر چکا تھا۔

حضورؐ کے یوم ولادت کو عام طور پر مولد کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ آپؐ کے یوم ولادت کے موقعے پر منعقد ہونے والی تقریبات کی بھی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کی متبادل اصطلاح میلاد ہے جس کا مطلب ہے یوم ولادت، برسی یا سالانہ رسم۔ (ترکی کی جدید زبان میں اسے مولوت یا میولود لکھا جاتا ہے)۔ آں حضرتؐ کے یوم ولادت یا آپ کی حیات مقدسہ

سے متعلق شاعری اور لٹریچر میں مولود کا لفظ ہی استعمال ہوتا ہے۔ (مثال کے طور پر: ''ہم مولد کے موقعے پر اس کے گھر گئے جہاں ہم نے کلاسیکل مولود سنی)۔''

آٹھویں صدی میں اس مکان کو، جہاں حضورؐ پیدا ہوئے تھے، خلیفہ ہارون الرشید کی ماں نے ایک مقدس زیارت گاہ میں تبدیل کر دیا اور حج کے لیے مکہ آنے والے مسلمان عقیدت اور احترام سے اس کی زیارت کرتے۔ یوں لگتا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے یوم ولادت کو بڑے پیمانے پر جشن کے طور پر منانے کا سلسلہ سب سے پہلے مصر میں فاطمی دور (۹۶۹ سے ۱۱۷۱عیسوی) میں شروع ہوا تھا۔ یہ ایک منطقی کام تھا کیوں کہ فاطمی رسول کریمؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ مصر کے مورخ مقریزی (وفات ۱۴۴۲عیسوی) نے فاطمی ذرائع کے حوالے سے ۱۱۲۲عیسوی میں منعقد ہونے والی ایسی ہی ایک تقریب کی تفصیلات بیان کی ہیں جس میں اسکالروں اور مذہبی رہنماؤں نے شرکت کی تھی۔ انہوں نے ناصحانہ تقریریں سنیں اور اس موقعے کی مناسبت سے مٹھائیاں، خاص طور پر شہد، جو آں حضرتؐ کو بہت مرغوب تھا، تقسیم کیا گیا اور غریبوں میں خیرات بانٹی گئی۔

لیکن یہ تقدس آمیز ماحول جلد ہی تبدیل ہو گیا۔ تاریخ دان ابن خلکان نے شمالی عراق میں واقع اپنے آبائی شہر اربیلا میں ۱۲۰۷عیسوی میں منعقد ہونے والی مولود کی تقریبات کی زوردار تفصیلات بیان کی ہیں اور لکھا ہے کہ میلاد کی تیاریاں پہلے قمری مہینے میں شروع ہو گئی تھیں، اس موقعے پر لکڑی کے خوش نما پنڈال بنائے گئے، غیر ملکی مہمانوں کے لیے گیسٹ روم تیار کیے گئے اور بڑی تعداد میں بھیڑیں، بکریاں اور گائیں ذبح کی گئیں۔ اربیلا کے شہزادے نہ صرف دعائیہ تقریبات بلکہ صوفیوں کی محفل سماع میں بھی شریک ہوئے۔ میلاد کی خوشی میں شمع بردار جلوس بھی نکالے گئے۔

بعد میں میلاد کے سلسلے میں چراغاں کرنے کو ان تقریبات کا خصوصی حصہ قرار دے دیا گیا، مثال کے طور پر ترکی میں حضورؐ کے یوم ولادت پر مسجدوں کو رنگ برنگی روشنیوں سے سجایا جاتا ہے اور اس حوالے سے اس دن کو ''میولوت قندیلی'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مسلمان اس دن شکرانے کے طور پر روزہ بھی رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حضرات صوفیہ نے میلاد کی تقریبات کو محنت اور توجہ سے پایہ تکمیل تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے تاہم کٹر عقیدہ رکھنے والے علما نے ان تقریبات کو بدعت قرار دیا ہے اور اصلاح پسند ابن تیمیہ (وفات ۱۳۲۸عیسوی) نے اس قسم کی تفریح کے خلاف خاص طور پر زوردار حملے کیے'' جسے ابتدائی مسلمان درست تصور نہیں کرتے تھے اور نہ ہی انہوں نے ایسا کوئی کام کیا تھا۔'' (Memon: Ibn Taimyya's Struggle Against Popular Religion, p.243)۔

لیکن ابن تیمیہ ہی کے ایک شاگرد ابن کثیر کے قلم سے عربی میں مولود لکھی گئی جو حضورؐ کی پیدائش کی رات کے بارے میں ایک حدیث پر مشتمل ہے۔

نہ صرف حنبلی ابن تیمیہ بلکہ مالکی فقہ کے علمائے دین، جن کا گڑھ شمالی افریقا ہے، بارہ ربیع الاول کو جو آں حضرتؐ کی رحلت کا بھی دن ہے، پرتکلف جشن منانے کی پرزور مخالفت کرتے رہے ہیں اور انہوں نے اس موقع پر موسیقی یا خوشیاں منانے کی اجازت نہیں دی۔ زیادہ سنجیدہ اور متین مسلمان میلاد کے دن پڑھی جانے والی وجد آور صوفیانہ شاعری کے بھی مخالف ہیں، وہ اس ضمن میں بہت محتاط طرز عمل اختیار کرتے ہیں اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ ایک بنگالی اسکالر نے چند برس پہلے اپنے ملک میں میلاد پر جشن منانے کے سلسلے میں بحث میں حصہ لیتے ہوئے لکھا:

''سب سے اہم موضوع کا تعلق حضورؐ کے یوم ولادت کے موقع پر آپؐ کی شان میں لکھی جانے والی غزلیں گا کر سنانے کے معاملے سے ہے۔ ان غزلوں میں مبالغہ آرائی کے ذریعے نبی کریمؐ کو اللہ تعالیٰ کا ہم مرتبہ قرار دیا جاتا ہے اور تمام سامعین اختلاف رائے کا اظہار کیے بغیر پورے جوش وخروش اور انہماک کے ساتھ ان غزلوں کو سنتے اور ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔'' (Enamul Haq: Sufism in Bengal, p.345)

پندرھویں اور سولہویں صدی کے صوفیانہ ذہن رکھنے والے جید عالم دین سیوطیؒ (جنہوں نے میلاد شریف منانے کو ایک اچھی اختراع قرار دیتے ہوئے اس کی حمایت میں ایک کتاب لکھی تھی) اور اپنے زمانے کے محدث ابن حجر الہیثمؒ سمیت کئی علمائے کرام نے حضورؐ کے یوم ولادت پر قرآن کریم کی تلاوت کرنے اور مذہبی شاعری کو گا کر سنانے کو جائز قرار دیا ہے تاہم انہوں نے دوسری موسیقی گانے اور اس موقعے پر موم بتیوں اور روشنیوں سے چراغاں کرنے کی ممانعت کی ہے۔ ان کے خیال میں موم بتیوں اور روشنیوں کے جلوسوں سے ہمسایہ عیسائیوں کے رسم ورواج یا ۲ فروری کو حضرت مریمؑ کی یاد میں تقریبات منانے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جو میلاد شریف کی روایات پر اثر انداز ہو سکتی ہیں، اسلام کے عیسائی ناقد دین اسلام کو مسیح علیہ السلام کی زندگی کی مضحکہ خیز نقل قرار دے کر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں بعض معجزوں پر نکتہ چینی کر سکتے ہیں۔ (Koelle: Mohammad and Mohammadanism, p.242)۔ اس کے علاوہ بعض جدت پسند مسلمان بھی میلاد پر جشن منانے کو ''حضرت عیسیٰؑ کے متعلق عیسائیوں کے اقوال کی حاسدانہ مسابقت'' قرار دے سکتے ہیں۔

اس تمام تر نکتہ چینی کے باوجود دنیائے اسلام، خاص طور پر وسطی اور مغربی علاقوں میں میلاد شریف کی تقریبات کی مقبولیت میں بدستور اضافہ ہوتا گیا۔ شمالی افریقا میں شروع شروع میں جشن میلاد کو ۱۲۹۱عیسوی میں فیز میں مرنیڈی حکمران کی اختراع سمجھا گیا لیکن اس کے بعد یہ مراکش اور اس کے ملحقہ علاقوں کی مذہبی زندگی کا اہم حصہ بن گیا۔ بعد میں شمالی افریقا کے حکمران خاندان یہ دعویٰ کرنے لگے کہ وہ رسول کریمؐ کی اولاد ہیں چناں چہ انہوں نے شریفین کا لقب

اختیار کرلیا۔اس طرح دینی اور قومی جذبات کا رخ میلا دشریف کے جشن کی حمایت میں مڑ گیا۔عراق کی طرح مراکش کے حضرات صوفیہ بھی حضورؐ کے یوم ولادت کی تقریبات میں سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں اور اس دن کو عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے بعد سب سے اہم دن کی حیثیت حاصل ہوگئی اور جیسا کہ روزوں کے مہینے رمضان میں پیدا ہونے والے لڑکوں کا نام عموماً رمضان رکھا جاتا ہے،اسی طرح شمالی افریقا اور دوسرے مسلم ممالک میں آں حضرتؐ کے یوم ولادت پر پیدا ہونے والے لڑکوں کا نام مولود اور لڑکیوں کا نام مولودیہ رکھا جانے لگا۔ حال ہی میں شائع ہونے والے ایک آرٹیکل سے ظاہر ہوتا ہے کہ شمالی افریقا میں درویشوں کے مختلف سلسلوں میں میلا دشریف کی تقریبات کو مذہب کا جزو لاینفک تصور کیا جاتا ہے البتہ ان تقریبات کے آخر میں جذب و مستی کی کیفیت طاری کرلی جاتی ہے جو ان تقریبات کی روح سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی۔

مصر میں فاطمی خاندان سے لے کر اب تک تمام حکمران میلا دشریف مناتے ہیں۔ چودھویں اور پندرھویں صدی میں مملوک حکمران اس موقعے پر خصوصی تقریبات کا اہتمام کرتے رہے ہیں (عام طور پر بارہ کے بجائے گیارہ ربیع الاول کو)۔اس دن قاہرہ کے قلعے کے صحن میں ایک شاندار تقریب منعقد کی جاتی،خوب صورتی کے ساتھ سجایا گیا خیمہ نصب کیا جاتا،قرآن کریم کی تلاوت کے بعد سلطان مذہبی شخصیات کو نقد ہدیہ اور مٹھائیاں پیش کرتا اور بلحاظ مرتبہ لوگوں کو مبارک باد کے خصوصی خط بھیجے جاتے۔مملوک خاندان کی فوج کے باہر لوگ اپنے اپنے طور پر خوشی کا اظہار کرنے کے لیے تقریبات منعقد کرتے۔ایک برطانوی مستشرق اور مبصر نے انیسویں صدی کے شروع میں قاہرہ کے ازبکیہ پارک میں منعقد ہونے والی ایک تقریب کا نہایت تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے جس میں قدیم رواج کے مطابق مختلف پروگرام پیش کیے گئے۔اس برطانوی سیاح نے جب رسول کریمؐ کی شان میں قصیدے سنے تو اسے بائبل کے حمدیہ گیت یاد آ گئے۔ (Lane: Manners and Customs of the Modern Egyptians, p.436)۔ان دنوں میلاد کی مشہور نعتیں دکانوں پر دست یاب ہیں جس سے ہر شخص محافل میلاد سے مستفیض ہوسکتا ہے۔

قرون وسطیٰ میں مکہ معظمہ میں حضورؐ کا یوم ولادت پورے تزک و احتشام کے ساتھ منایا جاتا۔کشمیر میں،جو برصغیر کی نسبتاً جدید مثال ہے،مسلمان ربیع الاول کے پہلے بارہ دن سری نگر کی حضرت بل مسجد کے قریب،جہاں رسول کریمؐ کا ایک موئے مبارک محفوظ ہے،نہایت جوش وخروش کے ساتھ میلاد کا جشن مناتے اور سترہویں صدی کے آخری عشروں میں گولکنڈہ کے قطب شاہی بادشاہ میلا دشریف کو بے حد عقیدت اور احترام کے ساتھ منانے کے لیے خصوصی تقریبات کا اہتمام کرتے۔ان کے دارالحکومت حیدرآباد دکن میں ربیع الاول کے پہلے بارہ دنوں میں بگل اور ڈھول بجائے جاتے اور مسجدوں میں ہر نماز کے بعد ۱۰۱ مرتبہ درود شریف پڑھا جاتا۔ایک وسیع وعریض میدان میں نمائش لگائی جاتی جہاں

پورے ہندوستان سے آئے ہوئے تاجر کھلونوں سے لے کر قالینوں اور زیورات تک اپنی تمام مصنوعات فروخت کرتے۔ بادشاہ (اس وقت عبداللہ قطب شاہ گولکنڈہ کا حکمران تھا) پینٹنگز کی ایک نمائش کا افتتاح کرتا اور شام کو ایک بڑے شامیانے کے نیچے رسول اللہؐ کی حیات طیبہ کے متعلق لیکچر دیے جاتے۔ اس کے بعد ایک ہزار خوب رو تلنگو لڑکیاں رقص کرتیں، بازی گر اپنے کرتب دکھاتے اور غزلیں گائی جاتیں۔ پہلے دن کی تقریبات ایک پرتکلف ڈنر پارٹی پر اختتام پذیر ہوتیں۔ حضورؐ کے یوم ولادت ۱۲ ربیع الاول کو سب لوگوں، خاص طور پر غریبوں میں کھانا تقسیم کیا جاتا۔ عام سادہ سطح پر، جیسا کہ اب بھی ہندوستان میں ہوتا ہے، ہر گھر میں کھانا تیار کر کے آں حضرت کی روح پر فتوح کو ایصال ثواب کے لیے فاتحہ خوانی کی جاتی اور بعد میں یہ کھانا غریبوں میں بانٹ دیا جاتا۔ (بدایونی: منتخب التواریخ۔ مصنف نے لکھا ہے کہ اکبر کے ایک امیر نے بھی ۱۲ ربیع الاول کو کھانا پکوا کر تقسیم کیا تھا)۔

۱۹۱۲ء میں سلطنت عثمانیہ میں ۱۲ ربیع الاول کو عام تعطیل کا اعلان کیا گیا اور وہاں عید میلاد النبیؐ اس طریقے سے منائی گئی جس طرح آج پاکستان میں منائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ۲۹ دسمبر ۱۹۸۲ء کو پاکستان میں میلاد شریف کا جشن جس عقیدت واحترام کے ساتھ منایا گیا، اس کی تفصیلات پاکستان کے ایک ممتاز روزنامے میں اس طرح شائع ہوئی ہیں:

''عید میلاد کی تقریبات کا ایک اور قابل دید منظر وہ جلوس تھا جس میں ہزاروں افراد نے شریک ہو کر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ والہانہ محبت اور عقیدت کا اظہار کیا۔ اس روز سعید پر شہروں اور قصبوں کو رنگ برنگے پرچموں، جھنڈیوں اور بینروں سے خوب صورتی کے ساتھ سجایا گیا تھا، ہر طرف جشن کا سماں تھا۔ رات کو روشنیوں کا خصوصی اہتمام کیا گیا جس سے شہر اور قصبے بقعہ نور بن گئے۔ پاکستان کے صدر نے حضور سرور کائناتؐ کی حیات مقدسہ کے موضوع پر منعقد ہونے والی سیرت کانفرنس کا افتتاح کیا۔ اس موقعے پر میلاد کی محفلیں منعقد کی گئیں اور ریڈیو اور ٹیلی وژن پر اس مبارک دن کی مناسبت سے خصوصی پروگرام پیش کیے گئے ...... دن کا آغاز راولپنڈی میں اکتیس اور صوبائی دارالحکومتوں میں اکیس اکیس توپوں کی سلامی سے ہوا۔ عید میلاد النبیؐ پر سرکاری اور نجی عمارتوں پر قومی پرچم لہرایا گیا۔'' (ڈان اوورسیز، کراچی ۶ جنوری ۱۹۸۳ء)۔

اسی سال مکہ مکرمہ میں کٹر عقاید رکھنے والے مسلمانوں کی تنظیم رابطہ کے چیئرمین نے ایک فتوے میں یہ اعلان کیا کہ میلاد کی تقریبات ''مضر اختراع'' ہیں تاہم عالم اسلام میں جنوبی افریقا سے لے کر ایران تک کے مسلمانوں کے مختلف حلقوں نے اس فتوے پر شدید نکتہ چینی کی۔

حالیہ عشروں کے دوران پوری دنیائے اسلام میں میلاد شریف کو جدت پسند نظریات کے فروغ کے لیے استعمال کرنے کے رجحان میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ پاکستان میں ربیع الاول کا پورا مہینہ سرور کونینؐ کی یاد اور آپؐ کے اخلاق،

سیاسی اور سماجی رول کی تشریح وتوضیح میں گزارا جاتا ہے۔ دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی کم وبیش یہی طرزِ عمل اختیار کیا گیا ہے، اسکولوں، پریس اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے پیغمبر اسلام کی حیات طیبہ کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا ہے اور مسلمانوں پر زور دیا جاتا ہے کہ وہ حضورؐ کے مثالی اخلاقی رویے کی پیروی کریں۔

غرض یہ بات قابل فہم ہے کہ آں حضرتؐ کے یوم ولادت کے حوالے سے معجزوں پر مبنی رقت انگیز عوامی اور شاعرانہ قصوں کو اب ماضی کے دنوں کی طرح دہرایا نہیں جاتا۔ ایک بنگالی اسکالر نے جدت پسندوں کی تنقید کے پس منظر میں چند سال پہلے میلاد کی تقریبات پر، جسے بنگالی میں دوآ زدہم کہتے ہیں، مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

''ان تقریبات میں ایسی من گھڑت کہانیاں بیان کی جاتی ہیں جن پر کوئی عقل مند شخص یقین نہیں کر سکتا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان قصوں کو بیان کرتے وقت ذوق سلیم کی افسوس ناک حد تک خلاف ورزی کی جاتی ہے اور نبی کریمؐ کے کیریئر کی تاریخی حیثیت کو شرمناک طریقے سے نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ایسی مجلسوں میں آں حضرتؐ روحانی طور پر موجود ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب ملّا آپ کی ولادت کے بارے میں اپنا بیان ختم کرتا ہے تو سامعین حضورؐ کی روح کے استقبال کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اور سب مل کر آپؐ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔'' (Enamul Haq: Sufism in Bengal, -pp.344-45)

واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۳۴ء میں مصر کے وزیر تعلیم نے ان خیالی اور بے کار قصے کہانیوں کے خلاف احتجاج کیا تھا جس سے میلاد سے متعلق پاپولر شاعری بھری پڑی ہے۔ انہوں نے ابن تیمیہ سے لے کر سعودی عرب کے وہابیوں سمیت کٹر عقاید رکھنے والے اصلاح پسندوں کی طرح اس قسم کے قصے کہانیوں کو آلائشوں سے پاک کرنے کی کوشش کی تھی جو جدید سائنسی نقطہ نظر سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اس طرح وہ حضورؐ سے عقیدت کو اعتدال کی سطح پر لانا چاہتے تھے۔ وہ کوئی معمولی شخصیت نہیں، فرانس میں اعلیٰ تعلیم پانے والے نابینا ادبی نقاد طٰہٰ حسین تھے جنہوں نے عوامی روایات میں فضول باتوں کے درآنے پر اعتراض کیا تھا۔ انہوں نے یہ استدلال پیش کیا:

سب سے موزوں بات یہ ہے کہ عوام کو ان نظریات سے محروم نہ رکھا جائے جو مذہب سے متصادم نہیں اور جن سے ان کے عقاید پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ مسلمانوں کو ان احادیث کی رو سے یہ شیریں اور دل کش قصے سنانے سے کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے کہ حضورؐ کی ولادت کے بعد پرندوں اور چوپایوں کے درمیان مقابلہ شروع ہو گیا تھا کیوں کہ تمام چرند اور پرند آں حضرتؐ کی دیکھ بھال کرنا چاہتے تھے لیکن انہیں یہ فریضہ سونپنے سے اس لیے انکار کر دیا گیا تھا

کیوں کہ فرمان خداوندی یہ تھا کہ نبی کریمؐ کی پرورش حلیمہ کریں گی! مسلمانوں کو یہ سن کر ناحق پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے کہ جنوں، انسانوں، اور چوپایوں اور ستاروں نے حضورؐ کی ولادت کے موقعے پر ایک دوسرے کو مبارک باد دی تھی اور یہ کہ آپؐ کی ولادت پر درختوں سے پتے پھوٹ پڑے تھے اور آپؐ کی آمد پر باغ پھولوں سے لد گئے تھے اور جب آپؐ کے جسم اطہر نے زمین کو چھوا تو آسمان زمین کے قریب آ گیا تھا؟

یہ سب ٹھیک وہی معجزے ہیں جن کا رسول اللہؐ کی ولادت کے موقعے پر ظہور ہوا تھا اور جن سے شاعروں اور علمائے دین کو بنی نوع انسان کی سب سے اعلیٰ شخصیت کو ایک نئے اور دل کش پیرائے میں نذرانہ عقیدت پیش کرنے میں مہمیز ملی ہے۔

عربی کے قدیم ماخذ، جن کے دعوے کی بنیاد سراج منیر جیسی قرآنی تلمیحات پر رکھی گئی ہے، ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ نومولود پیغمبرؐ کی آمد پر آمنہ کے رحم سے ایک نور نکلا جس سے ہر سو روشنی ہو گئی تھی۔ حسانؓ ابن ثابت نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے بعد جو ماتمی اشعار لکھے، ان میں کہا گیا ہے:

ترجمہ: اے ابن آمنہ کے لعل، جن کا یہ لعل مبارک ثابت ہوا

اور آمنہ کے وہ لعل جسے ہزار نیک بختیوں کے ساتھ ایک عفیفہ ماں نے جنا تھا

جو ایسا نور تھا جس نے سارے عالم کو منور کر دیا

اور جو بھی اس مبارک نور سے ہدایت کے راستے پر لگایا جا سکتا تھا وہ سیدھے راستے پر لگ گیا

اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ جناب رسالت مآبؐ کی ولادت کی تفصیلات کے ضمن میں روحانی نور کو جلد ہی مادی حقیقت کا روپ دے دیا گیا جس کا مشاہدہ نویں صدی میں ابن سعدؒ کی تاریخی تصنیف میں کیا جا سکتا ہے۔ یونس ایمرے نے حضورؐ کی تعریف و تحسین میں شعر کہے اور ترکی، ایران اور ہندوستان میں ان کے جانشین شاعروں نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا:

ترجمہ: دنیا آپؐ کے نور میں غرقاب ہو گئی

حضورؐ کی ولادت کے نور میں!

اور ان سے بہت پہلے ابن جوزیؒ نے ـــــ جو بلاشبہ حنبلی فقہ کے سنجیدہ مذہبی نقاد اور صوفی شاعر ہیں ـــــ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب مولد میں لکھا ہے:

جب حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پیدا ہوئے تو فرشتوں نے بلند اور پست آوازوں میں آپؐ کی ولادت کا اعلان کیا اور جبریلؑ یہ مژدہ جاں فزا سنانے آئے اور عرش لرز اٹھا۔ حوریں اپنے محلوں سے باہر نکل آئیں اور ہر طرف

نکہت وخوشبو پھیل گئی۔ جنت کے دروازوں کے داروغے رضوان کو یہ حکم دیا گیا: ''جنت کو نہایت خوب صورتی سے سجادو، محل سے پردے ہٹادو، عدن کے پرندوں کے ایک غول کو آمنہ کے گھر بھیجو تا کہ وہ اپنی چونچوں سے ایک ایک ہیرا گرا سکیں۔'' اب جب نبی کریمؐ پیدا ہوئے تو آمنہ نے ایک نور دیکھا جس سے بصریٰ کے محل جگمگا اٹھے۔ فرشتوں نے آمنہ کو گھیرے میں لے لیا اور اپنے پر پھیلا دیے۔ وہ قطاروں میں کھڑے ہو کر حضورؐ کی مدح وستائش میں رطب اللسان ہو گئے اور زمین پر اتر کر پہاڑوں اور وادیوں کو بھر دیا۔ (ابونعیم: دلائل النبوت صفحات ۸۸ تا ۱۰۰۔ Tor Andrae: Die Person Muhammads, p.64)

بارہویں صدی میں اندلس کے ایک اسکالر قاضی ابن عطیہؒ نے یہ نادر خیال پیش کیا:

ترجمہ: ربیع الاول کا مہینہ فضیلت میں سب مہینوں سے بڑھ کر ہے

اور بخدا! اس میں ایک رات ایسی ہے

جس میں دونوں افق روشن وتاباں نور سے درخشندہ ہو گئے تھے......

شمالی افریقا کے عابد وزاہد مسلمان قاضی عیاضؒ نے، جو رسول کریمؐ کی حیات طیبہ کے موضوع پر سند کا درجہ رکھتے ہیں، اپنی کتاب الشفا میں آں حضرتؐ کی ولادت کے موقعے پر رونما ہونے والے معجزوں میں صرف نور کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کیوں کہ آں حضرتؐ کی ولادت پر کئی انوکھے اور خلاف معمول واقعات ظہور پذیر ہوئے تھے اور قدیم روایات میں نہایت تفصیل کے ساتھ ان کا ذکر ہوا ہے۔ کہا گیا ہے کہ رسول اللہؐ کے والد گرامی عبداللہ کی پیشانی ایک تاباں و درخشاں نور سے چمکتی تھی اور اس نور کی وجہ سے کئی خواتین نے انہیں اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے آمنہ کے ساتھ شادی کی جن کے مقدر میں حضورؐ کی والدہ ماجدہ ہونے کا شرف پہلے سے لکھا جا چکا تھا۔ چناں چہ یہ نور ان کے رحم میں منتقل ہو گیا۔

ابونعیم نے دلائل النبوت میں لکھا ہے کہ جس رات آمنہ حاملہ ہوئیں، قریش کے تمام مویشیوں نے ایک دوسرے کو بتایا کہ امت کے مستقبل کے رہنما شکم مادر میں منتقل ہو گئے ہیں۔ آمنہ کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے بچے کو محمدؐ یا احمدؐ کے نام سے پکاریں۔ انہیں حمل کے دوران کوئی پریشانی نہ ہوئی لیکن جب حضورؐ کی ولادت کا وقت آیا تو عجیب وغریب واقعات پیش آئے:

اور جب میرا شکم بھاری ہونے لگا تو میں بلند بانگ آوازیں سننے لگی۔ میں کیا دیکھتی ہوں کہ آسمان اور زمین کے درمیان ایک سفید ریشمی رومال پھیلا دیا گیا ہے اور میں نے یہ آواز سنی: ''اسے لوگوں کی نظروں سے اوجھل رکھنا!'' میں نے آدمیوں کو ہوا میں کھڑے دیکھا، انہوں نے اپنے ہاتھوں میں نقرئی صراحیاں پکڑ رکھی تھیں۔ میرے جسم سے

پسینے کے جو قطرے گرے، وہ موتیوں جیسے تھے اور ان سے عنبر و مشک سے زیادہ خوشبو آ رہی تھی۔ میں پکار اٹھی: ''اوہ! کیا میرے ہاں عبدالمطلب کا بیٹا پیدا ہوگا! ہائے عبدالمطلب مجھ سے کس قدر دور ہیں!'' پھر میں نے پرندوں کے غول اترتے دیکھے جنہوں نے میری گود کو ڈھانپ دیا۔ ان کی چونچیں زمرد کی تھیں اور ان کے پر سنبل کے پھولوں کی رنگت جیسے تھے۔ اور خدا نے میری آنکھوں سے پردے ہٹا دیے اور میں نے زمین کے مشرق اور مغرب کو دیکھا۔ میں نے تین جھنڈے دیکھے، ان میں سے ایک مشرق، ایک مغرب اور ایک کعبے کے اوپر نصب تھا۔ مجھے وضع حمل کی درد شروع ہوگئی جو میرے لیے پریشانی کا باعث تھی...... چناں چہ میرے ہاں محمدؐ پیدا ہوگئے اور میں آپؐ کی طرف مڑی تاکہ آپؐ کو دیکھ سکوں۔ میں کیا دیکھتی ہوں کہ آپ سجدے میں گرے ہیں اور آپؐ کے ہاتھ دعا کے لیے آسمان کی طرف اٹھے ہوئے ہیں۔ پھر میں نے بادل کے ایک ٹکڑے کو آسمان سے اترتے دیکھا جس نے آپؐ کو ڈھانپ لیا اور آپؐ میری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ میں نے کسی کو یہ کہتے سنا: ''آپؐ کو زمین کے گرد مشرق اور مغرب اور سمندروں کی سیر کراؤ تاکہ وہ آپؐ کو آپؐ کے نام سے پہچان سکیں اور آپؐ کے مرتبے اور محاسن سے آگاہ ہو جائیں اور یہ جان سکیں کہ سمندروں میں آپؐ کو الماحی (وہ جو تمام آلودگیوں کو دھو دے) کے نام سے پکارا جائے گا کیوں کہ آپؐ دنیا کو کفر و شرک اور بت پرستی سے پاک صاف کر دیں گے۔'' اس کے بعد بادل تیزی کے ساتھ غائب ہوگیا اور میں نے دیکھا کہ آپؐ سفید اونی کپڑے میں لپٹے ہوئے ہیں اور آپؐ کے نیچے ریشم کا سبز غلاف پڑا ہوا ہے۔ آپؐ نے ہاتھ میں سفید موتیوں کی تین چابیاں پکڑ رکھی تھیں۔ اسی دوران کسی نے بلند آواز میں کہا: ''دیکھو! محمدؐ نے اپنے ہاتھ میں فتح، خوں ریزی اور نبوت کی کنجیاں پکڑ رکھی ہیں۔'' (ابونعیم دلائل النبوت صفحہ ۲۲۱: Andrae: Die Person Muhammads, pp.62,637)۔

دوسری روایات میں کہا گیا ہے کہ نومولود محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس حال میں زمین پر گر گئے تھے کہ آپؐ کے ہاتھ زمین پر تھے اور آپؐ اوپر آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے جس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ آپؐ پوری زمین کے فرماں روا ہیں۔

کوئی بھی شاعر اس نور کا ذکر کرنا نہیں بھولا جس کی روشنی سے پوری دنیا یہاں تک کہ شام میں بصریٰ کے محل تک چمک اٹھے تھے۔ ایک سواحلی مبلغ نے ۱۹۶۳ء میں اس واقعے کو یوں بیان کیا: ''ایک چمک دار کمان قوس وقزح کی طرح نمودار ہوئی۔ یہ روشنی ٹیلی وژن کی مانند تھی کیوں کہ اس سے دور دراز کے شہر نزدیک دکھائی دے رہے تھے۔''

(Knappert: Swahili Islamic Poetry,1:45)۔

سرور کائناتؐ کی ولادت باسعادت کے موقعے پر ہمسایہ ملکوں میں اہم علامتیں اور آثار دیکھے گئے۔ کہا

جاتا ہے کہ فارس کے بادشاہ کے محلات کے دیوان خانے برباد ہو گئے تھے، نیل اور فرات کے دریاؤں میں طغیانی سے دارالحکومت میں سیلاب آ گیا تھا۔ بعد میں آنے والے شاعروں، خاص طور پر فارسی قصیدوں میں کسریٰ (فارس کا شہنشاہ خسرو) اور عربی کے لفظ ''کسر'' (توڑنے) کے درمیان لفظی تعلق کی نشان دہی کی گئی ہے۔

حضورؐ کی ولادت کے موقعے پر حضرت آسیہؓ اور حضرت مریمؑ کی آمنہ کے پاس موجودگی سے موسیٰؑ اور عیسیٰؑ پر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی برتری اور فضیلت کا اشارہ ملتا ہے۔ حضرت آسیہؓ فرعون کی بیوی تھیں جنہوں نے شیر خوار موسیٰؑ کی پرورش کی تھی جب کہ حضرت مریم عیسیٰ علیہ السلام کی کنواری ماں تھیں اور مسلمان ان کا بے حد احترام کرتے ہیں۔

یہ اہم بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ولادت کے وقت تمام جسمانی آلائشوں سے پاک تھے۔ آپؐ پیدائش کے وقت ہی مختون تھے۔ یہ روایت لڑکوں کا ختنہ کرنے کی اساس ہے۔ اس فرض کا قرآن مجید میں ذکر نہیں لیکن مسلمان آں حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت کا اتباع کرتے ہوئے لڑکوں کا ختنہ کراتے ہیں۔ (چناں چہ ترکی میں اسے ''سونیت'' کہا جاتا ہے)۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے، رسول کریمؐ کی ولادت کے بارے میں پہلی جامع کتاب اندلس کے مصنف ابن دحیہؒ نے لکھی تھی جو ۱۲۰۷ء میں اربیلا میں میلاد شریف کے جشن میں شریک ہوئے تھے۔ نثر میں لکھی جانے والی اس منفرد کتاب کے آخر میں، جس کا نام کتاب التنویر فی مولد السراج المنیر ہے، شعروں میں حضورؐ کی بے پناہ حمد و ثنا کی گئی ہے اور آپؐ کے نور کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ حنبلی فقہ کے دو علما نے، جن میں ابن الجوزیؒ اور ان کے ڈیڑھ سو سال بعد ابن کثیرؒ شامل ہیں، اپنی کتابوں میں میلاد شریف کا نہایت عقیدت اور احترام کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ حضورؐ کی ولادت کے اہم موقعے کے حوالے سے کئی شعری مجموعے اس سے پہلے معرض وجود میں آ چکے تھے۔ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ نبی کریمؐ کی مدح میں بصیریؒ نے (تیرہویں صدی میں) عربی میں جو مشہور قصیدہ بردہ لکھا تھا، اس میں آں حضرتؐ کی ولادت کا صرف ضمنی حوالہ دیا گیا ہے اور اس سلسلے میں خصوصی طور پر کوئی تفصیلات بیان نہیں کی گئیں۔ یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ احمد الدردیرؒ کی مشہور مولد کا آغاز اللہ تعالیٰ کی تعریف سے کیا گیا ہے۔ ''نہ اس سے کوئی پیدا ہوا، نہ وہ کسی سے پیدا ہوا۔''

ترک روایت میں سب سے بہترین معلوم میلاد سلیمان چلبی نے ۱۴۰۰ عیسوی کے لگ بھگ لکھی تھی۔ لیکن اس سے بھی تقریباً ایک سو سال پہلے یونس ایمرے نے میلاد پڑھنے والوں کے لیے بھاری انعام کا وعدہ کیا تھا بشرطے کہ میلاد شریف کے اشعار اصلی ہوں۔ ترکوں میں میلاد کا آغاز ابتدائی مرحلے ہی میں ہو گیا تھا۔ سلیمان چلبی کی نظم مقفیٰ بیتوں میں لکھی گئی ہے۔ یہ ادبی صنف فارسی زبان سے مستعار لی گئی ہے، اس کے قافیے سادہ اور فارسی کی صوفیانہ اور نصیحت آموز رزمیہ شاعری سے مماثلت رکھتے ہیں جیسے عطارؔ کی منطق الطیر اور رومیؔ کی مثنوی! اس نظم کی زبان آسان بلکہ اس کا انداز بیان معصومانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظم کی دل کشی آج بھی برقرار ہے۔ (پندرھویں صدی میں ترکی

کے ایک سخت گیر عالم دین مولانا فینیاری نے تو اس نظم کو بدعت قرار دے دیا تھا)۔ ترکی میں نہ صرف حضورؐ کے یوم ولادت بلکہ آپؐ کے یوم وفات کے بعد چالیسویں دن یا کوئی منت پوری ہونے پر بھی میلاد شریف پڑھا جاتا ہے کیوں کہ عقیدت مند مسلمانوں کو یقین ہے کہ اس میں خصوصی خیر و برکت کی استعداد موجود ہے۔ اسی طرح ہندوستانی مسلمان، خاص طور پر خواتین خاندان کی ہر بڑی تقریب میں میلاد کی محفل کا اہتمام کرتی ہیں۔

ایک ترک خاندان میں محفل میلاد کے انعقاد پر جشن کا سماں ہوتا ہے اور دنیائے اسلام کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی میلاد کے موقعے پر لوگ نفیس کپڑے پہن کر اس منزل کی تلاش میں روانہ ہوجاتے ہیں جس کا ذکر مشرقی افریقا کے ایک شاعر نے مولود کی نظم میں کیا تھا:

ترجمہ: جس لمحے تم میلاد کی محفل میں شرکت کے لیے گھر سے روانہ ہوتے ہو

وہ جنت کی بے پایاں مسرتوں کا مشاہدہ کرنے کا لمحہ ہوتا ہے

میلاد کی محفلوں میں بعض اوقات خوشبو کے لیے عود جلائی جاتی ہے، قرآن کریم کی تلاوت اور دعا کے بعد حاضرین میں مٹھائی تقسیم کی جاتی ہے۔ شمالی افریقا میں عام طور پر مکئی کے آٹے، مکھن اور شہد کو ملا کر ایک خاص قسم کا حلوہ تیار کیا جاتا ہے۔ یہی حلوہ بچے کی پیدائش کی خوشی میں مہمانوں میں بانٹا جاتا ہے۔ (Shinar: Traditional and Reformists Maulid Celebrations in the Maghrib, p.387)۔ دوسرے علاقوں میں شرکائے محفل کو ٹھنڈا مشروب اور مصری دی جاتی ہے۔ ترکی میں ہر شخص اس موقعے پر پیپر بیگ میں مٹھائیاں بھر کر گھر لے جاتا ہے۔

سلیمان چلبی کے مولود کی پیروی میں اکثر نقل کی جاتی ہے جس میں قرآنی آیات اور دعاؤں کو شامل کر کے اسے مزین اور آراستہ کیا جاتا ہے لیکن ترکی میں معاشرے کے تمام طبقوں میں اس مذہبی نظم کو جو پذیرائی ملی ہے، وہ اوروں کے نصیب میں نہیں آئی۔ اس کے پہلے حصے میں آمنہ کی روایت کے مطابق حضورؐ کے یوم ولادت کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ وہ نہایت تعجب اور حیرت کے ساتھ (روایتی استعارے استعمال کرتے ہوئے) حمل کے آخر میں پیش آنے والے واقعات بیان کرتی ہیں:

ترجمہ: محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پیاری والدہ آمنہ خاتون

ان کے صدف سے وہ تاباں و درخشاں گوہر برآمد ہوا

عبداللہ سے حاملہ ہونے کے بعد

دن اور ہفتے گزر گئے اور حضورؐ کی ولادت کا وقت قریب آ گیا

جوں جوں آپ کی پیدائش کا وقت نزدیک آتا گیا

انہیں کئی آثار اور علامتیں نظر آنے لگیں!

یہ ربیع الاول کا مہینہ تھا کہ

بارہویں تاریخ پیر کی رات کو

دیکھو! کہ بنی نوع انسان کا افضل ترین شخص پیدا ہوا —

اور آپؐ کی والدہ ماجدہ نے کیا عجائبات دیکھے!

میرے محبوبؐ کی والدہ بیان کرتی ہیں: ''میں نے

ایک عجیب نور دیکھا جس کے سامنے سورج کی حیثیت اس کے پروانے کی سی تھی

اچانک یہ نور میرے گھر سے چشم زدن میں اوپر کی طرف بڑھنے لگا

اور اس کی چمک دمک سے آسمان تک پوری دنیا منور ہوگئی

اس سے آسمان کھل گئے، تاریکی غائب ہوگئی

اور میں نے تین فرشتوں کو دیکھا جو تین پرچم اٹھائے ہوئے تھے

ایک جھنڈا مشرق میں اور دوسرا مغرب میں

اور تیسرا پرچم کعبے کی چھت کے اوپر تھا

آسمان سے فرشتے قطار در قطار اترنے لگے

اور انہوں نے میرے سارے گھر کو اپنے حصار میں لے لیا

آسمان سے حوریں جوق در جوق نیچے اتر آئیں

ان کے چہرے سے نکلنے والی روشنی نے میرے گھر کو بقعہ نور بنا دیا!

اور فضا میں ایک غلاف پھیلا دیا گیا

جسے ''کم خواب اور زربفت'' کہتے ہیں — ایک فرشتے نے اسے پھیلا دیا

جب میں نے یہ واقعات صاف طور پر دیکھے تو

میں حیران اور مبہوت ہوگئی

اچانک دیواریں شق ہوگئیں اور

ان سے تین حوریں میرے کمرے میں داخل ہوگئیں

ان میں آسیہ کا چہرہ ماہتاب جیسا تھا

دوسری خاتون بلاشبہ مریم تھیں

اور تیسری ایک خوب رو حور تھی

پھر یہ مہتابی چہرے والی تینوں خواتین میرے قریب آ گئیں
اور بڑی محبت کے ساتھ مجھے سلام کیا
اس کے بعد وہ میرے گرد بیٹھ گئیں اور مجھے
محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ولادت کی نوید سنائی
کہنے لگیں: ''جب سے خدا نے یہ دنیا بنائی ہے
تمہارے بیٹے جیسا کوئی بیٹا پیدا نہیں ہوا
اور خدائے بزرگ و برتر نے
کسی کو تمہارے بیٹے جیسا حسین نہیں بنایا
اے پیاری خاتون! آپ بڑی اقبال مند اور خوش نصیب ہیں
کیوں کہ تمہارے بطن سے اس پاک باز شخصیت نے جنم لیا ہے
یہ نومولود علم و حکمت کا شہنشاہ ہوگا
وہ ایمان اور توحید کا خزینہ ہوگا
آسمان اس سے عشق کی بدولت گردش میں ہے
جن و بشر اس کے رخ انور کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہیں
یہ وہ رات ہے
جس میں اس ذات پاک نے جنم لیا جس کا نور تمام جہانوں کو منور کر دے گا
اس رات زمین جنت بن گئی ہے
اس رات خدا نے دنیا کے لیے شفقت و رافت کا مظاہرہ کیا ہے
اس رات تمام اہل دل شاداں و فرحاں ہیں
اس رات عشاق کو ایک نئی زندگی ملی ہے
مصطفےٰؐ تمام جہانوں کے لیے رحمت بن کر آئے ہیں
مصطفےٰؐ گناہ گاروں کے لیے شافع محشر ہیں!''
ان خواتین نے اس بچے کی اس قدر تعریف و تحسین کی
کہ میں اس مقدس نور کو دیکھنے کے لیے مضطرب ہوگئی
آمنہ خاتون نے کہا: ''جب وہ وقت آ گیا

کہ انسانوں میں سب سے افضل شخصیت میرے ہاں جنم لے

اس وقت مجھے پیاس محسوس ہوئی

تو ان خواتین نے مجھے شربت پیش کیا

جسے پی کر میں اس نور میں کھو گئی

اور اس نور اور میری ذات میں کوئی امتیاز نہ رہا

پھر نرم اور بڑے بڑے پروں والا سفید قاز میرے پاس آیا

جس نے آہستگی سے میری کمر کو چھوا''

میلاد شریف کی محفل میں جب یہ شعر پڑھا جاتا ہے تو شرکا میں سے ہر مرد یا خاتون اپنے قریب بیٹھے ہوئے مرد یا عورت کی کمر کو آہستہ سے چھوتی ہے۔

''اور اس رات دین کے شہنشاہ کا ظہور ہوا

اور زمین و آسمان سب اس کے نور میں غرق ہو گئے''

اس کے بعد اس نومولود پیغمبرؑ کے شایان شان استقبال کے جشن کی تیاریاں شروع ہو گئیں جو خدا کا محبوب اور شافع محشر ہے:

خوش آمدید! اے عظیم المرتبت شہزادے ہم آپؐ کو خوش آمدید کہتے ہیں!

خوش آمدید! اے معدن علم وحکمت خوش آمدید!

خوش آمدید! اے کتاب کے اسرار! ہم آپؐ کو خوش آمدید کہتے ہیں!

خوش آمدید! اے دکھ درد کے چارہ گر! ہم آپؐ کو خوش آمدید کہتے ہیں!

خوش آمدید! اے رب ذوالجلال کے آفتاب اور ماہتاب!

خوش آمدید! اے وہ ذات پاک جو خدا سے جدا نہیں!

خوش آمدید! اے باغ حسن و جمال کی عندلیب!

خوش آمدید! اے صاحب عظمت وجلال کے رفیق!

خوش آمدید! اے اپنی امت کی جائے پناہ!

خوش آمدید! اے غریبوں اور مسکینوں کے غم خوار!

خوش آمدید! اے دائمی اور ابدی روح! ہم آپؐ کو خوش آمدید کہتے ہیں!

خوش آمدید! اے ساقی عشاق! ہم آپؐ کو خوش آمدید کہتے ہیں!

خوش آمدید! اے محبوب کے نورِ نظر!

خوش آمدید! اے خدا کی محبوب ترین شخصیت!

خوش آمدید! اے تمام جہانوں کے لیے رحمت!

خوش آمدید! اے گناہ گاروں کے شافعِ محشر!

یہ کون و مکان صرف آپؐ ہی کے لیے تخلیق کیے گئے ہیں......

اس کے بعد حضور سرور کائناتؐ کے معجزوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے جن میں معراج کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ اس ضمن میں اہم بات یہ ہے کہ ہر باب کے آخر میں یہ شعر پڑھا جاتا ہے:

ترجمہ: اگر تم دوزخ کی آگ سے محفوظ رہنا چاہتے ہو

تو محبت اور شوق سے حضورؐ پر درود و سلام بھیجو!

ترکی میں اس مولود کا (جس کا سرب کروشیائی زبان میں بھی ترجمہ ہوا ہے) خاتمہ ایک خصوصی دعا پر کیا جاتا ہے جس میں خدا سے التجا کی جاتی ہے کہ وہ اس درود شریف کو مدینہ منورہ میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے روضہ اقدس تک پہنچائے۔ بعد میں آں حضرتؐ کی آل، اولیائے کرام اور اسکالرز اور محفل میلاد کے شرکا کی مسرت و انبساط اور طویل العمری کے لیے دعا کی جاتی ہے تاکہ وہ اس قسم کی زیادہ سے زیادہ محفلوں میں شریک ہو سکیں۔ اس کے بعد خلفا، مجاہدوں، تاجروں اور حاجیوں کے لیے اور پھر اپنی پرسکون موت اور مستقبل کی زندگی جنت میں گزارنے کی دعا مانگی جاتی ہے۔

میلاد کے فیوض و برکات پر صرف ترک مسلمانوں کو ہی یقین نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں ہر جگہ اس کی برکت کو تسلیم کیا جاتا ہے، مثال کے طور پر مشرقی افریقا کے مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جب کوئی شخص میلاد شریف پڑھتا ہے تو اس کا پورا سال امن اور سلامتی سے گزرتا ہے، چور اور کوئی آفت اس کے گھر کے قریب نہیں آتی اور وہ آگ سے محفوظ رہتا ہے۔ (Knappert: Swahili Islamic Poetry, p.107)۔ قرونِ وسطیٰ سے لے کر اب تک مسلمانوں کا یہ ایمان ہے کہ مولود پڑھنے والوں کو نہ صرف اس دنیا بلکہ عالم قدس میں بھی انعام سے نوازا جائے گا۔ ترک زبان کے ایک شعر میں کہا گیا ہے:

ترجمہ: اگر تم دوزخ کی آگ سے نجات چاہتے ہو

تو خدا کے پیغمبرؐ کے میلاد میں آؤ!

ترکی کی ادبی تاریخ میں یونس ایمرے نے بہت پہلے روز قیامت کو پیش آنے والے واقعات کو اس طرح بیان کیا تھا:

ترجمہ: قیامت کے دن ایک منادیہ اعلان کرے گا:

''وہ شخص جس نے مولود پڑھی ہو وہ آگے آئے؟

خدا اس شخص کو نورانی سند عطا کرے گا

جس کسی نے مولود پڑھی ہو وہ آگے آئے!

یہ شخص تیزی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جائے گا

وہ دائیں بائیں مڑتا ہوا چلے گا

خدا اس کو کس قدر انعام سے نوازے گا!

جس کسی نے مولود پڑھی ہو وہ آگے آئے''

ایک مولود، جو افریقی ملکوں میں خاص طور پر بہت مقبول ہے، اسے اٹھارویں صدی میں مدینہ منورہ کے مالکی قاضی البرزنجیؒ نے لکھا تھا۔ اس کا اصل عربی متن نثر میں تھا لیکن بعد میں آنے والے شاعروں نے اسے شعری قالب میں ڈھال لیا ہے۔ سواحلی میں اس کے تین شعری ترجمے موجود ہیں۔ اس مولود کو ہندوستان میں بھی قبول عام حاصل ہے۔ افریقا میں ۱۴۰۰ سطروں (۵×۱۰×۲۸) پر مشتمل اس قصیدے کی بڑی پذیرائی ہوئی ہے جسے الفیاضیؒ نے لکھا تھا (یہ قصیدہ صنعت توشیح کا شاندار نمونہ ہے۔ قصیدے کے اشعار کے ابتدائی، درمیانی یا آخری حروف سے کوئی نام، جز وکلام یا جملہ بن جاتا ہے)۔ یہ قصیدہ شمالی نائیجیریا میں میلاد کی تقریبات میں پڑھا جاتا ہے۔ عربوں میں حضرمی (حضرموت کے باشندے — مترجم) میلاد کی شاعری میں سب سے سبقت لے گئے ہیں اور منتخب اشعار کے ایک مولف اور نقاد نے ایسے بیس سے زیادہ قصیدوں کا ذکر کیا ہے ''جن میں سے ہر قصیدہ مسرور کن حضرمی لے میں ہے۔'' ان قصیدوں کو جنوبی عرب میں میلاد کی محفلوں میں ترنم سے پڑھا جاتا ہے اور حاضرین کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ (Serjeant: Poetry and Prose from Hadramaut, p.36 no.13)۔

بھارت اور پاکستان میں بھی یہی رجحان پایا جاتا ہے اور وہاں میلاد پر قوالیوں میں صوفیانہ نعتیں پڑھی جاتی ہیں۔ مصر میں میلاد کی تقریبات میں سترہویں صدی کے صوفی المناویؒ کی لکھی ہوئی مدحیہ نظم نہایت عقیدت کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔ جدید دور کے مصری مصنف احمد الشرابی نے تو (۱۹۶۲ء) مولود الھدیٰ نام سے ایک ڈراما بھی لکھا تھا۔

برصغیر ہند میں میلاد کے بارے میں موزوں لٹریچر قدرے تاخیر سے لکھا گیا لیکن یہ ادب معیار کے اعتبار سے فارسی میں لکھی جانے والی افسانوی شاعری سے بہت اعلیٰ ہے۔ بنگال میں میلاد منانے کی روایت بہت پرانی ہے لیکن جیسا کہ ایک بنگالی اسکالر کے ریمارکس اوپر درج کیے گئے ہیں، یہ میلاد دوسرے علاقوں میں مقبولیت حاصل کرنے والی شاعری کے مقابلے میں محض قیاسی اور فرضی خیال آرائی پر مبنی ہے۔ بنگالی میں میلاد سے متعلق سنجیدہ ادب لکھنے کی روایت حال ہی میں شروع ہوئی ہے البتہ قرون وسطیٰ میں بنگال میں رسول کریمؐ کی ولادت کے متعلق صوفیانہ روایات لکھی گئیں جن کے مطابق برہما، وشنو اور کئی دوسرے اوتاروں نے حضورؐ کے ظہور کی پیش گوئی کی تھی۔

برصغیر ہندوستان کی بعض زبانوں جیسے سندھی میں مولود وہ مختصر غنائیہ نظم ہوتی ہے جسے مخصوص انداز سے پڑھا جاتا ہے البتہ اس کا موضوع صرف نبی کریمؐ کی ولادت تک محدود نہیں ہوتا بلکہ اس میں آں حضرتؐ کی حیات طیبہ کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ سندھی میں میلاد کے بارے میں روایتی رنگین قصے چھوٹے چھوٹے بندوں پر مشتمل طویل رزمیہ نظم کی صورت میں بیان کیے جاتے ہیں جنہیں مناقبہ کہا جاتا ہے۔ اس اسلوب میں رسول اللہؐ کے دوسرے معجزے بھی بیان کیے جاتے ہیں۔ پنجابی شاعری حرفی یا طویل قصیدوں میں ''بنی نوع انسان کی افضل ترین شخصیت کی ولادت کی خوب صورت یاد میں'' جیسے منفرد عنوان کا پنجابی شعروں میں ترجمہ کرتے اور یہ بیان کرتے ہیں کہ پرندوں اور درختوں نے نومولود پیغمبرؐ کو خوش آمدید کہا تھا۔ (عبدالعلی: گلدستہ حافظ جھنڈا صفحات ۷تا۹)۔

یہ شاعر حضرات ولادت نبویؐ سے متعلق تفصیلات بیان کرتے وقت اپنے اپنے مقامی ماحول کے مطابق رنگ آمیزی کر کے انہیں دل کش اور آراستہ کرتے جیسے ہم مغرب کے لوگ کرسمس کے موقعے پر شمالی یورپ کے مناظر کی تصویریں دیکھنے کے خوگر ہیں۔ چناں چہ ۱۶۰۰ عیسوی کے لگ بھگ گجرات کا ایک شاعر اپنے مولود میں ایک برہمن کا تعارف کراتا ہے جو حضورؐ کی ولادت کے موقعے پر موجود تھا اور جس نے اپنا زنار نومولود کی گردن میں ڈال دیا تھا۔ دوسرے شاعروں نے کئی لوریاں ایجاد کی ہیں جیسے سندھ کا فقیر محمد ماچھی ہمیں تفصیل سے یہ بتاتا ہے کہ خدا نے ولادت سے پہلے کس طرح آں حضرتؐ کو ثابت قدمی، علم و حکمت، انکسار، شکر گزاری، ذہانت اور محبت کے محاسن سے نوازا تھا اور ولادت کے بعد خدا نے جبرئیلؑ کو حضورؐ کے گہوارے کو جھولنے کا حکم دیا تھا۔ ''کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا محبوبؐ بچوں کی طرح رونے لگے۔'' پھر خدا نے اس فرشتے کو جھولا جھولنا سکھایا۔ عربی کی یہ لوری، جس کے ہر بند کے آخر میں پہلا مصرع دہرایا جاتا ہے، قرون وسطیٰ میں لکھی گئی تھی:

قم قم یا جیبی کم تنام   النوم علی العاشق حرام

ترجمہ: اٹھو اٹھو اے میرے دوست! تم کب تک سوئے رہو گے؟

نیند تو عاشق پر حرام ہے

یہ مختصر نظم گو کہ فنی اعتبار سے اعلیٰ پائے کی نہیں لیکن اس میں ان تمام چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے جو آں حضرتؐ کی ولادت کی خوشی میں سو نہیں سکی تھیں:

ترجمہ: حوض اور کوثر سو نہیں رہے

میرے محبوب اٹھو تم کب تک سوئے رہو گے؟

مخلوق کا خالق سویا نہیں......

لوح اور قلم سو نہیں رہے

آسمان اور دوزخ کو نیند نہیں آرہی

آفتاب اور ماہتاب...... تخت اور کرسی

دن اور رات...... پہاڑ اور سمندر

دائیں اور بائیں والے سو نہیں رہے......

نیند تو عاشق پر حرام ہے

میرے محبوب اٹھو! تم کب تک سوئے رہو گے؟

پچھلی صدی میں میلاد شریف کی تقریبات کے صوفیانہ اور افسانوی پہلو کا رخ اس انداز سے صحیح اور واضح سمت کی جانب موڑنے کی کوشش کی گئی کہ حضورؐ کی سیاسی اور سماجی کامیابیوں، آپؐ کے اخلاقی طرزِ عمل اور اجتماعی زندگی کو نہایت ذہانت کے ساتھ منظم کرنے کی جدوجہد کو اجاگر کیا جائے اور مسلمانوں میں آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے عملی پہلوؤں کی پیروی کرنے کا جذبہ اور ذوق پیدا کیا جائے۔ مسلمانوں میں یہ رجحان حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شخصیت کی زیادہ جدید انداز میں تشریح کرنے اور آپؐ کی حیاتِ مقدسہ کو عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی خواہش کی بنا پر پیدا ہوا ہے، جس کی واضح جھلک مذہبی شاعری میں بھی نظر آتی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے نامور اصلاح پسند رہنما سرسید احمد خان کی ابتدائی تحریروں کا مقصد میلاد کے لٹریچر کو افسانوی قصے کہانیوں سے پاک کرنا ہے۔ چناں چہ سرسید کی مثال کی پیروی کرتے ہوئے ان کے مصلح دوست اور شاعر حالیؔ نے قوم میں ایک نئی روح پھونکنے کی غرض سے اس روایت کا حوالہ دیا ہے کہ رسول کریمؐ کی پیدائش کے دن فارس کے محلات اور آتش کدے برباد ہو گئے تھے:

دیر ہوئے بے چراغ اور صلوٰت یہود

شرک ہوا مضمحل اور کہا ''انت ہبا''

بجھ گئے آتش کدے بیٹھ گئے بت کدے

ہو گئی تثلیث مات اور ثنویت فنا

نبی کریمؐ کی ولادت کا مطلب فارس کی ثنویت اور مسیحیت کی تثلیث پر، جو دونوں شرک کی نمائندگی کرتی ہیں، کامل وحدانیت کی مکمل فتح ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کوئی نیا نظریہ نہیں لیکن حالیؔ کے زمانے کے برٹش انڈیا میں، جب ہندوستان میں عیسائیت کی بالادستی قائم تھی، یہ اشعار خصوصی طور پر معنی خیز ہیں۔

بہ ہرحال جدت پسندی کی ان تمام تر کوششوں کے باوجود حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ولادت کے معجزے سے متعلق قدیم، رنگارنگ اور محبت بھرے گیت آج بھی ذوق وشوق سے گائے جاتے ہیں اور ہم ان نغموں کے شکر گزار ہیں کہ ان کی بدولت حضورؐ کی محبت بچوں کے دلوں میں سرایت کر رہی ہے تاکہ وہ اسے اپنی مذہبی زندگی کا جزو لاینفک بنا سکیں۔

نواں باب

حضورؐ کا اسریٰ اور معراج

اٹھارویں صدی میں وادی سندھ کے ایک لوک گیت میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو درجنوں مرتبہ خوش آمدید کہا گیا ہے۔ شاعر نے جنت کے فرشتوں اور پاکباز ارواح کی جانب سے بھی رسول مقبولؐ کا پرتپاک خیر مقدم کرتے ہوئے کہا ہے:

ترجمہ: اے محمدؐ! آپؐ نے بلند و بالا آسمانوں تک سفر کیا

آسمانوں کے مکینوں نے بھی آپؐ سے کہا:

''خوش آمدید! سو مرتبہ خوش آمدید!''

نبی کریمؐ کے آسمانوں تک رات کے پراسرار سفر (اسریٰ) نے ایسا لٹریچر معرض وجود میں لانے کی تحریک پیدا کی جو ولادت نبویؐ کے معجزوں کے مقابلے میں زیادہ جامع اور وسیع ہے۔ اس کے علاوہ آں حضرتؐ کے معراج کے واقعے کو علمائے دین اور حضرات صوفیہ دونوں طبقوں کے نقطۂ نظر سے میلاد کی نسبت کہیں زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

اس پراسرار سفر کی کہانی کا مرکز و محور قرآن کریم کی سترھویں سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت ہے:

''پاک ہے وہ اللہ تعالیٰ جو اپنے بندے کو رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے آس پاس ہم نے برکت دے رکھی ہے اس لیے کہ ہم اسے اپنی قدرت کے بعض نمونے دکھائیں، یقیناً اللہ تعالیٰ ہی خوب سننے دیکھنے والا ہے۔'' یہاں مسجد اقصیٰ سے مراد بیت المقدس ہے۔

۔(Guillaume: Where was al-masjid al-aqsa?)

رسول کریمؐ کی ابتدائی سوانح عمری سیرت محمد ابن اسحاق میں اس واقعے کو یوں بیان کیا گیا ہے: ''ایک رات جبرئیلؑ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس براق لائے اور براق ایک چوپایہ ہے جس پر آپؐ سے پہلے انبیا

بھی سوار کرائے گئے تھے۔ وہ اپنا سم اپنی نظر کی انتہا پر رکھتا ہے۔ آپؐ اس پر سوار کرائے گئے اور آپؐ کا ساتھی (جبرئیلؑ) آپؐ کو لے کر نکلا۔ آپؐ آسمان اور زمین کے درمیان کی نشانیاں ملاحظہ فرماتے جارہے تھے یہاں تک کہ آپؐ بیت المقدس پہنچے اور اس میں ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور چند انبیا (علیہم السلام) کو پایا جو آپؐ کے لیے جمع کیے گئے تھے۔ آپؐ نے انہیں اپنی امامت میں نماز پڑھائی۔'' اس کے بعد ''مسجد اقصیٰ'' سے آپؐ نے آسمانوں کی طرف معراج کا سفر شروع کیا۔ اس موقعے پر آپؐ کے لیے ایک سیڑھی (معراج) لائی گئی۔ (بعض مفسرین اسریٰ اور معراج کو دو الگ الگ واقعات سے تعبیر کرتے ہیں لیکن محمد ابن اسحاق تک نے ان دونوں واقعات کو یک جا کیا ہے اور چوں کہ محمد ابن اسحاق حضورؐ کا مستند ترین سوانح نگار ہے، اس لیے اس کا بیان اس واقعے کی مزید تشریح کے ضمن میں سب سے زیادہ معتبر ہے)۔ چناں چہ محمد ابن اسحٰق کی سیرت میں واقعہ معراج کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''مجھ سے ایک ایسے شخص نے، جسے میں جھوٹا نہیں سمجھتا، ابوسعید خدریؓ کی روایت بیان کی، انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فرماتے سنا: ''بیت المقدس میں جو کچھ ہوا، اس سے جب میں فارغ ہوا تو ایک سیڑھی (معراج) لائی گئی اور میں نے اس سے بہتر کبھی کوئی چیز نہیں دیکھی اور یہی وہ چیز ہے کہ جب موت آتی ہے تو تمہارے مردے اپنی آنکھیں کھولے اسی کی جانب تکتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد میرے ساتھی (جبرئیلؑ) نے مجھے اس پر چڑھا دیا یہاں تک کہ مجھے لے کر آسمانوں کے دروازوں میں سے ایک دروازے پر پہنچا جس کا نام باب الحفظہ (نگہبانوں کا دروازہ) تھا۔ اس پر فرشتوں میں سے ایک فرشتہ تھا جس کا نام اسماعیل تھا۔ اس کے ہاتھ کے نیچے بارہ ہزار ایسے فرشتے تھے جن میں سے ہر ایک کے ہاتھ کے نیچے بارہ ہزار فرشتے تھے۔''

نبی کریمؐ نے فرمایا: ''پھر جب مجھے لے کر داخل ہوئے، اسماعیل نے کہا: اے جبریلؑ! یہ کون ہیں؟ کہا: محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔ اس نے کہا: کیا بلوائے گئے ہیں؟ کہا: ہاں! اس نے میرے لیے بھلائی کی دعا کی اور بھلی بات کہی۔ اس کے بعد جب میں دنیا والے آسمان میں داخل ہوا تو وہاں ایک شخص کو بیٹھا ہوا دیکھا۔ اس پر بنی آدم کی روحیں پیش کی جاتی تھیں۔ جب ان میں سے بعض کی روحیں اس پر پیش کی جاتیں تو وہ ان کا خیر مقدم کرتا، اسے خوشی ہوتی اور وہ کہتا: اچھی روح ہے جو اچھے جسم سے نکلی۔ اور جب ان میں سے بعض دوسرے اس پر پیش ہوتے تو وہ کہتا: تھو ہے، تیوری چڑھا لیتا اور کہتا: خبیث روح ہے اور خبیث جسم سے نکل آئی ہے۔ میں نے کہا: اے جبرئیل! یہ کون ہیں؟ انہوں نے کہا: یہ آپؐ کے والد آدمؑ ہیں۔ پھر میں نے چند لوگوں کو دیکھا جن کے ہونٹ اونٹ کے ہونٹوں کے سے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں آگ کے ٹکڑے گول پتھروں کی طرح تھے، وہ انہیں اپنے مونہوں میں ڈال لیتے تو وہ ان کی پشت میں سے نکلتے۔ میں نے کہا: اے جبرئیل! یہ کون ہیں؟ انہوں نے کہا: یہ ظلم سے یتیموں کا مال کھا جانے والے ہیں۔'' اسی طرح

دوزخ میں سود خوروں، بدکاروں اور دوسرے گناہ گاروں کو سخت سزائیں دی جا رہی تھیں۔ اس کے بعد حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) ساتوں آسمانوں میں گئے اور وہاں بعض انبیاؑ سے ملاقات کی جو حضورؐ سے پہلے مبعوث ہوئے تھے۔ آپؐ نے عیسیٰ علیہ السلام کو دوسرے اور ابراہیم علیہ السلام کو ساتویں آسمان پر دیکھا۔ سب سے بلند ساتویں آسمان میں حضرت ابراہیمؑ کی موجودگی سے ایک مرتبہ پھر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کے ذریعے عربوں کا جدامجد اور کعبے کا معمار ہونے کے ناتے انہیں اسلامی روایت میں خاص مقام حاصل ہے۔ وہ مسلمانوں کے روحانی ہیرو بھی ہیں کیوں کہ انہوں نے بتوں کو پاش پاش کر دیا تھا۔ آخر حضورؐ جنت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ایک روایت ہے کہ واپسی پر آپؐ کے پاس تین برتن لائے گئے۔ ایک برتن میں دودھ، ایک میں شراب اور ایک میں پانی تھا۔ آپؐ نے دودھ کا برتن لے لیا اور اس میں سے پیا جو راہ راست اور ''درمیانی راہ'' کی علامت ہے۔

ایک روایت کے مطابق، جو بار بار دہرائی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی امت پر روزانہ پچاس نمازیں فرض فرمائیں۔ محمد ابن اسحاق نے ابوسعید خدریؓ سے روایت نقل کرتے ہوئے لکھا، رسول اللہؐ نے فرمایا: ''پھر میں واپس آیا اور موسیٰ بن عمران کے پاس سے گزرا اور وہ تمہارے لیے بڑے اچھے شخص نکلے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپؐ پر کتنی نمازیں فرض کی گئیں؟ میں نے کہا: روزانہ پچاس نمازیں۔ انہوں نے کہا: نماز بڑی بوجھل چیز ہے اور آپؐ کی امت کمزور ہے اس لیے آپؐ اپنے پروردگار کے پاس لوٹ کر جائیے اور درخواست کیجیے کہ آپؐ اور آپؐ کی امت پر سے بوجھ کم کر دیا جائے۔ چناں چہ دس نمازیں کم کر دی گئیں۔ پھر میں لوٹا اور موسیٰؑ کے پاس سے گزرا۔ انہوں نے مجھ سے پھر ویسا ہی کہا۔ میں پھر لوٹ گیا اور درخواست کی تو دس اور کم کر دی گئیں۔ پھر میں موسیٰؑ کی طرف لوٹا تو وہ اسی طرح مجھ سے کہتے رہے کہ آپؐ لوٹ جائیے اور پروردگار سے درخواست کیجیے یہاں تک کہ یہ تخفیف روزانہ پانچ نمازوں تک پہنچ گئی۔ پھر میں واپس موسیٰؑ کے پاس سے گزرا۔ انہوں نے پھر مجھ سے ویسا ہی کہا تو میں نے کہا: میں اپنے پروردگار کے پاس بار بار گیا اور درخواست کی حتیٰ کہ مجھے شرم آنے لگی ہے۔ پس اب تو میں ایسا نہیں کروں گا۔ پس ان نمازوں کو تم میں سے جو شخص ایمانداری سے ثواب سمجھ کر ادا کرے گا، اسے پچاس نمازوں کا اجر ملے گا۔ محمدؐ اور آل محمدؐ پر اللہ کی رحمتیں ہوں!'' اس طرح یہ آسمانی سفر حد درجہ عملی مقاصد پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ لیکن بعد کی روایت میں اس مقصد کی مرکزی اہمیت باقی نہیں رہتی اور اس کے متبادل کے طور پر دوسرے محرکات یا اس نصب العین کی مزید وضاحت کی گئی ہے اور خدا کے ساتھ بات چیت کے نتیجے میں حضورؐ کے شافع محشر ہونے کے حق کو خاص طور پر اجاگر کیا جاتا ہے۔

اسلامی روایت کے مطابق اسریٰ اور معراج کا واقعہ رسول کریمؐ کی مکی زندگی کے آخری دنوں میں آپؐ کی

مدینہ ہجرت سے تھوڑی دیر پہلے رونما ہوا اور قمری سال کے ساتویں مہینے رجب کی ۲۷ تاریخ کو اس کی یاد منائی جاتی ہے، مثال کے طور پر بعض علاقوں، جیسے کشمیر میں معراج شریف کی تقریبات ایک ہفتے تک جاری رہتی ہیں جن میں حضورؐ کو ہدیہ عقیدت پیش کرنے کے علاوہ چراغاں بھی کیا جاتا ہے۔ ترکی میں آں حضرتؐ کی ولادت کی رات کی طرح شب معراج پر بھی جشن منایا جاتا ہے، اسے شب قندیل کہا جاتا ہے جس میں رات کو تمام مسجدیں نہایت خوب صورتی سے سجائی جاتی ہیں۔ عام طور پر اس رات کو پیدا ہونے والے بچوں کا نام، میں کم سے کم بھارت اور پاکستان کی روایت کو جانتی ہوں، معراج، معراج دین، معراج محمد رکھا جاتا ہے۔

مشرقی تہذیب وتمدن اور زبانوں کے دلدادہ لوگوں اور مذہب کے تاریخ دانوں کو حضور سرورکونینؐ کی حیات طیبہ کے اس پہلو (سفر معراج) سے بڑھ کر کسی اور موضوع سے دل چسپی نہیں۔ یوں لگتا ہے کہ رسول کریمؐ کے لیے یہ ایک ابتدائی تجربہ تھا اس لیے بعض روایات میں معراج کو آں حضرتؐ کے شق صدر کے واقعے سے جوڑا گیا ہے بلکہ بعض اسکالرز تو اسے سائبیریا کے شمن کے تجربے کے مماثل قرار دیتے ہیں۔ رسول کریمؐ کی جنت میں سدرۃ المنتہیٰ پر عزت افزائی کا قرآن مجید کی ۵۳ ویں سورہ النجم میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

''دل نے جھوٹ نہیں کہا جسے (پیغمبرؐ نے) دیکھا۔ کیا تم جھگڑا کرتے ہو اس پر جو (پیغمبرؐ) دیکھتے ہیں۔ اسے تو ایک مرتبہ اور بھی دیکھا تھا۔ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔ اسی کے پاس جنت الماویٰ ہے۔ جب کہ سدرہ کو چھپائے لیتی تھی وہ چیز جو اس پر چھا رہی تھی۔ نہ تو نگاہ بہکی نہ حد سے بڑھی۔ یقیناً اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے بعض نشانیاں دیکھ لیں۔'' (سدرۃ المنتہیٰ بیری کا ایک درخت ہے جو چھٹے یا ساتویں آسمان پر ہے اور یہ آخری حد ہے، اس سے اوپر کوئی فرشتہ نہیں جا سکتا۔ فرشتے اللہ کے احکام بھی یہیں سے وصول کرتے ہیں ـــــ مترجم)۔ سدرۃ المنتہیٰ کے قریب حضورؐ کے خیر مقدم سے مذہب کے مورخوں کے ذہن میں شمنوں کے کشف یا خواب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جو وجدانی پروازوں کے ذریعے آفاقی درخت تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس معاملے میں ایران اور ہندوستان کے قرون وسطیٰ کے مشاہدات یا مذہبی تمثیل پسندی کا حوالہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہودیت اور عیسائیت کے الہامی خوابوں میں بھی اسی قسم کے مشاہدات ممکن ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ رسول کریمؐ جب معراج سے واپس تشریف لائے تو بستر ابھی گرم تھا اور پانی اس گھڑے سے، جو آپؐ کے سفر معراج پر روانہ ہونے سے پہلے لڑکھڑا گیا تھا، مکمل طور پر خارج نہیں ہوا تھا۔ (البیہقی: دلائل النبوۃ صفحہ ۱۱۸)۔ غرض آپ کا آسمانوں کا سفر وجدانی کیفیت کا مثالی نمونہ بن گیا جس میں انسان ایک لمحے میں کئی برسوں تک نہیں، ہزاروں لاکھوں برسوں تک زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ وقت، جس میں صوفی کی روح اس قسم

کے مشاہدے سے دوچار ہوتی ہے، تخلیق کیے گئے معمول کے سلسلے وار وقت کی گرفت سے ماورا ہے۔ یہ وہ وقت یا لمحہ ہے جسے قرونِ وسطیٰ کے جرمنی کی پاکباز شخصیات دسنو کے نام سے موسوم کرتی تھیں۔ رسول اللہؐ نے اسی وقت کے دوران ذاتِ خداوندی سے ملاقات کی تھی۔ یہ واقعہ ہندوستان کی اس پرانی کہانی سے گہری مماثلت رکھتا ہے جس میں ایک شخص پانی میں غوطہ زن ہو گیا تھا، اس نے چند لمحوں میں پوری زندگی گزار دی۔ اس کہانی کو مایا (فریبِ نظر) نامی تمثیل میں پیش کیا گیا۔ مشرقِ بعید کے ملکوں بلکہ یورپ میں بھی اس نظریے کو قبولِ عام حاصل ہے۔

علمائے اسلام نے سفرِ معراج کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں کی ہیں کیوں کہ اس مسئلے کو حل کرنے میں بعض مشکلات درپیش ہیں۔ سب سے پہلے اس بات کو واضح کرنا تھا کہ آیا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے معراج جسمانی طور پر کیا تھا یا یہ ایک روحانی سفر تھا؟ حضورؐ کی بیوی ام المومنین حضرت عائشہؓ کی اس روایت پر سخت ردِعمل ظاہر کیا گیا ہے کہ ''آں حضرت کا جسم غائب نہیں ہوا تھا۔'' اس روایت کی مخالفت کرنے والوں کا دعویٰ ہے کہ آپ کا یہ سفر خالصتاً جسمانی تھا۔ معتزلی مکتبہ فکر کے نزدیک یہ پورا واقعہ ایک خواب یا کشف تھا، وہ صرف روحانی سفر کو تسلیم کرتے ہیں۔ (Gatje: Koran and Koranexegese, pp.105-8)۔ اس کے برعکس راسخ الاعتقاد مسلمانوں، مثال کے طور پر قرآن کریم کے نامور مفسر طبریؒ (دسویں صدی کے شروع میں) کی رائے یہ ہے کہ حضورؐ نے معراج کا سفر جسم کے ساتھ کیا تھا۔ طبریؒ نے قرآن پاک کے حوالے سے کہا ہے کہ خدا نے ''رات کو اپنے بندے کے ساتھ سفر کیا تھا'' نہ کہ ''اپنے بندے کی روح کے ساتھ!'' اگر پیغمبرِ اسلامؐ نے روحانی خواب کی حالت میں سفر کرنا ہوتا تو اس کے لیے براق جیسی سواری کی کیا ضرورت تھی؟ (طبریؒ: سورہ بنی اسرائیل کی تفسیر)۔ دوسری طرف جدت پسند لوگ معراج کو روحانی سفر قرار دیتے رہے ہیں۔ (احمد خان: مقالات سرسید ۱۳: ۵۹۳، واقعہ معراج کی حقیقت و اصلیت)۔ ماڈرن یورپ کے کم سے کم ایک اسکالر نے اس سے ملتے جلتے ایک وجدانی مشاہدے کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں یاد دلایا ہے کہ پال نے بظاہر اسی قسم کے ایک واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے:

میں ایک آدمی کو جانتا ہوں...... مجھے یہ معلوم نہیں کہ یہ ملاقات روحانی تھی یا جسمانی، بہ ہر حال تیسرے آسمان پر اس سے میری ملاقات ہوگئی تھی۔ وہ مجھے جنت میں لے گیا جہاں میں نے وہ الفاظ سنے جنہیں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کسی بھی انسان کے لیے یہ الفاظ کہنا جائز نہیں۔

یہ شخص اپنے اس مشاہدے سے پریشان ہو گیا: ''پال کے ساتھ میرا یہ روحانی مشاہدہ بالکل واضح اور صاف تھا لیکن اس دوران کوئی منفعت بخش یقین دہانی نہ کرائی گئی۔(Archer: Mystical Elements in Mohammad, p.150)۔

بعد کے لٹریچر، خاص طور پر عوامی شاعری کی کئی کہانیوں میں یہ بتایا گیا کہ جن لوگوں نے حضرت محمد (صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم) کے جسمانی معراج کا انکار کیا، انہیں کس قدر خوف ناک سزا ملی تھی۔ایک عالمگیر نظریے کے مطابق جو حضرات صوفیہ میں خاص طور پر بہت مقبول ہے، رسول کریمؐ کے جسم اطہر کو ذات خداوندی کا وہ قرب حاصل ہے جو عام مسلمان بلکہ بڑے سے بڑے ولی کو صرف روحانی طور پر نصیب ہوسکتا ہے۔ چناں چہ ایک انسان پر خدا کا سب سے بڑا فضل وکرم یہ ہوسکتا ہے کہ اس کی روح کو وہی عفت اور پاکیزگی مل جائے جو رسول کریمؐ کے جسم مبارک کو حاصل ہے۔ ایک انسان اس افضل ترین مقام پر فائز ہونے کے بعد بھی ذات خداوندی کا قرب حاصل کرنے کی غرض سے صرف روحانی سفر کرسکتا ہے۔اس بحث میں اس نکتے کو اہم دلیل کی حیثیت حاصل ہوگئی کہ آیا روحانی نظام مراتب میں نبی کریمؐ کو بلند مرتبہ حاصل ہے یا کسی خدارسیدہ بزرگ کو؟ رسول اللہؐ نے معراج کا سفر جسم کے ساتھ کیا تھا —— ایک ایسا بدن جو ''روح سے مجسم'' تھا جیسا کہ ترکی کے شاعر خاقانی نے کہا ہے —— اس جسمانی معراج کی بدولت رسول عربیؐ کا بے مثال مرتبہ اور مقام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ثابت ہو جاتا ہے۔

ایک اور متنازع سوال یہ تھا کہ آیا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے واقعی خدا کو دیکھا تھا اور اگر ایسا ہے تو کیا حضورؐ نے اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا یا دل سے؟ یہ مسئلہ قرآن کریم کی ۵۳ ویں سورہ النجم کی تفسیر کے سلسلے میں خاص طور پر زیر بحث آیا ہے۔اس سورہ مبارکہ کے پہلے حصے میں آں حضرتؐ کے ایک کشف یا خواب کا تذکرہ کیا گیا ہے: ''اسے تو ایک مرتبہ اور بھی دیکھا تھا سدرۃ المنتہٰی کے پاس''۔بعض لوگ لفظ ''اسے'' کو پیغام خداوندی کے حامل جبرئیل (علیہ السلام) سے بھی منسوب کرتے ہیں چناں چہ اس پوری سورہ کو وحی کے دوران حضورؐ کے خواب سے تعبیر کیا جاسکتا ہے البتہ کئی دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ ''اسے'' سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔لیکن سورہ النجم میں آگے چل کر واقعہ معراج کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ''بعض لوگوں نے کہا: آپؐ نے سدرۃ المنتہٰی پر جبرئیل کو دیکھا تھا۔دوسروں کا کہنا ہے کہ حضورؐ نے اپنے دل اور چشم بصیرت سے اللہ کو دیکھا تھا۔ایک تیسرے طبقے کا خیال ہے کہ آں حضرتؐ نے اپنی آنکھوں سے خدا کو دیکھا تھا لیکن یہ سب لوگ سچ کہتے ہیں کیوں کہ انہوں نے جو کچھ سنا، اسے بیان کردیا ہے۔'' (Andrae: Die Person Muhammads, pp.80-81)۔

جن لوگوں نے سورہ النجم کے حوالے سے کہا کہ رسول کریمؐ نے سفر معراج میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا، وہ سب حضرات صوفیہ تھے۔وہ سورہ النجم کی سترہویں آیت ''مازاغ البصر وما طغیٰ'' کا حوالہ دیتے ہیں جس کی رو سے: ''نہ تو نگاہ بہکی نہ حد سے بڑھی۔'' ان کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ عین ذات خداوندی کو دیکھتے ہوئے بھی رسول پاکؐ کی نگاہ نہیں بہکی تھی چناں چہ رومیؔ نے کہا ہے:

ترجمہ: میں نے دونوں جہانوں سے قطع تعلق کے لیے اپنی آنکھیں زور سے بند کرلی ہیں

یہ سبق میں نے مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سیکھا ہے
مازاغ البصر و ماطغیٰ کے اسرار و رموز
میں صرف آپؐ ہی سے جان سکتا تھا

رومیؔ کے یہ الفاظ بعد کی شاعری میں بار بار دہرائے گئے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ حضورؐ نے جسے دیکھا، آپؐ اس کے کس قدر قریب تھے؟ ''قاب قوسین او ادنٰی'' دو کمانوں یا اس سے بھی نزدیک! (سورہ النجم آیت ۹)۔ اس اصطلاح کی بعض اوقات اس طرح تشریح کی جاتی ہے کہ یہ دو کمانوں کا فاصلہ نہیں، وہ لطیف مقام اتصال ہے جہاں ایک کمان کے دو برابر حصوں کو سریش سے چپکایا جاتا ہے۔ یہ جگہ دکھائی نہیں دیتی، اس کے باوجود وہ دونوں حصوں کو الگ کرنے کے لیے خطِ امتیاز کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی طرح حضورؐ اپنے پروردگار کے اس قدر قریب چلے گئے تھے!

دوسرے تمام پیغمبروں پر پیغمبر اسلامؐ کی برتری کا یہ واضح ثبوت ہے کہ انتہائی قرب خداوندی کے باوجود ''نہ تو نگاہ بھٹکی نہ حد سے بڑھی۔'' کیا حضرت موسیٰؑ جلتی ہوئی جھاڑی کے ذریعے خدا کے ایک صفاتی جلوے کو دیکھ کر بے ہوش نہیں ہو گئے تھے؟ اور انہوں نے محض خدا کی آواز سنی تھی اور انہیں بتایا گیا تھا: ''لن ترانی''، تم مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔ (سورہ الاعراف آیت ۱۴۳)۔ دوسری طرف حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نہ تو نگاہ بھٹکی اور نہ حد سے بڑھی اور آپؐ کو ذات خداوندی سے ملاقات کا موقع ملا۔ چناں چہ شاعروں نے اپنے کلام میں قاب قوسین کے سلطان دو جہاںؐ کی حد سے زیادہ تعریف کی ہے۔ اس واقعے کی جامع تفصیل پندرھویں صدی میں ہندوستان کے فارسی شاعر جمالیؔ نے بیان کی ہے جنہوں نے اپنے اس مشہور شعر میں اس اسرار سے یوں پردہ اٹھایا ہے:

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوہ صفات
تو عین ذات می نگرے در تبسمے

ترجمہ: موسیٰ علیہ السلام ایک صفاتی جلوے سے بے ہوش ہو گئے
آپؐ نے عینِ ذات کو دیکھا اور مسکراتے رہے

حضرت علی بن عثمان ہجویریؒ سمیت نہ صرف حضرات صوفیہ بلکہ حنبلی مکتبہ فکر کے کٹر عقاید رکھنے والے علما نے بھی تمام پیغمبروں پر حضورؐ کی فضیلت کو ثابت کرنے کے لیے سورہ النجم سے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔ انہوں نے یہ ثابت کرنے کے لیے بھی اس سورہ مبارکہ کا حوالہ دیا ہے کہ مذہبی زندگی کا بلند ترین مقام فنا نہیں (جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو گئے تھے) بلکہ سب سے افضل مقام آں حضرتؐ کا ہے جنہوں نے سنجیدہ و متین طرزِ عمل اختیار کر کے خدا کی موجودگی میں ہوش و حواس برقرار رکھے تھے۔ (J.N. Bell: Love Theories in Later Hanbalite Islam, p.176)

ایک روایت کے مطابق حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میں نے اپنے رب کو نہایت خوب صورت شکل میں دیکھا ہے یا بعد کی ایک روایت میں کہا گیا ہے: میں نے اپنے رب کو داڑھی کے بغیر نوجوان کی صورت میں دیکھا جس نے ترچھی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ (Ritter: Das Meer-der Seele, p.445)۔ لیکن مسلمانوں کی اکثریت نے اس حدیث کی پرزور تردید کی ہے البتہ حضرات صوفیہ کے ایک گروہ نے اسے اپنی طرف سے "بے ریش" نوجوان کی تعریف کا جواز بنالیا ہے۔

دوسرے مفسرین، خاص طور پر بعد میں آنے والے صوفی حضرات سفر معراج کو رسول کریم کی حقیقی عزت و تکریم سے منسوب کرتے ہیں کیوں کہ وہ سورہ النجم کی چھٹی آیت میں لفظ "استویٰ" یعنی سیدھا کھڑا ہو گیا سے یہ معنی اخذ کرتے ہیں کہ یہ وہ نہیں جسے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دیکھا تھا بلکہ اس سے مراد خود حضورؐ کی ذات ہے۔ اسی طرح سورہ النجم کی آٹھویں آیت میں "پھر نزدیک ہوا اور اتر آیا" کو حضورؐ سے منسوب کیا جاتا ہے جو رب ذوالجلال کے ساتھ ملاقات کے بعد اپنی محبوب امت کی دیکھ بھال کرنے دوبارہ زمین پر اتر آئے تھے۔ یہ تشریح بعد میں آئیڈیل مذہبی راستے کے ضمن میں آں حضرتؐ کے اسوہ حسنہ کی پیروی کرنے کے مترادف ہے۔ آپؐ ربانی موجودگی کا مشاہدہ کرنے کے بعد اس غرض سے واپس دنیا میں تشریف لائے تا کہ آپؐ نے وہاں پر جو کچھ سیکھا، اس کی تبلیغ کر سکیں۔ خدا کے ساتھ بالمشافہ ملاقات کے جان دار اور تقدس آمیز تجربے کے بعد، جسے بیان کرنے کے لیے الفاظ موجود نہیں، آپؐ دنیا کی حالت بہتر بنانے کے لیے جدوجہد کرنے کی غرض سے لوٹ آئے (گو کہ بعض روایات میں بتایا گیا ہے کہ اس فریضے کی انجام دہی کے سلسلے میں آپ کو بھاری بوجھ اٹھانا پڑا۔ (Arberry: Discourses of Rumi, pp.211-78)۔ مسلمان علما اور مذہب کے مغربی تاریخ دان اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ معراج کی اس تفسیر کے ضمن میں دین کے تصوفانہ اور پیغمبرانہ نقطہ نظر کے درمیان فرق پایا جاتا ہے، یہ ایک ایسا فرق ہے جسے محمد اقبالؒ نے Reconstruction of Religious Thought in Islam کے موضوع پر لیکچروں کے پانچویں باب کے شروع میں بیان کیا ہے جہاں انہوں نے ہندوستانی صوفی عبدالقدوس گنگوہیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے: "محمد عربیؐ فلک الافلاک پر گئے اور واپس آ گئے، واللہ! اگر میں آپؐ کی جگہ ہوتا تو ہرگز واپس نہ آتا۔" (Iqbal: Six Lectures, p.124)۔ یہ الفاظ مشاہدہ ربانی اور اس دنیا اور اس کے باسیوں کے ساتھ تعلقات کے ضمن میں ایک صوفی اور ایک پیغمبر کے مختلف رویوں کی غیر مبہم اور واضح انداز میں نشان دہی کرتے ہیں۔ لیکن ابن فریدؒ جیسے کئی حضرات صوفیہ نے شب معراج کو احدیت کا تیسرا مرحلہ قرار دیا ہے جس میں صوفی "مخمور اتحاد" سے "متین اتحاد" کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ (Nicholson: Studies in Islamic Mysticism, p.239)۔ اور محمد اقبالؒ نے بھی اپنے پیشرو مفکروں کے

نظریات کی تائید کرتے ہوئے اسے ''پیغمبرانہ'' واپسی قرار دیا ہے۔

اس کے علاوہ مسلمان جدت پسندوں (خاص طور پر محمد اقبالؒ) نے سفر معراج پر بحث کرتے ہوئے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حقیقی معنوں میں ''میں اور آپ'' کے انداز میں خدا سے ہم کلام ہوئے تھے۔ محمد اقبالؒ کے نزدیک اس طرز تخاطب سے انفرادیت ذات کے آفاقی نظریے کی تصدیق ہوتی ہے۔ حضورؐ کے معراج کے سفر سے اس نظریے کی توثیق ہوتی ہے کہ خدا کوئی بے حس اور دور افتادہ ذات نہیں، ایک شخصی قوت ہے جسے مخاطب کیا جاسکتا ہے چناں چہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خالق اور مخلوق کے درمیان ذاتی سطح پر سودمند گفتگو ہوسکتی ہے، یہ بات چیت نماز کے دوران ہوتی ہے جس سے حقیقی مذہبی سرگرمی پروان چڑھتی ہے۔

اس سلسلے میں ذاتی سطح پر ایک ذات کی دوسری ذات کے ساتھ بالمشافہ ملاقات سفر معراج کا ایک اور پہلو ہے جس پر کھلے عام بحث کی گئی ہے۔ اس سے مراد قرآن کریم کی سترہویں سورہ بنی اسرائیل میں عبدہٗ کے لفظ کی تشریح ہے۔ اس تلمیح قرآنی سے یہ مطلب اخذ ہوتا ہے کہ خدا نے رات کو ''اپنے بندے'' کے ساتھ سفر کیا تھا۔ ان تمام مباحث سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ چوں کہ عبدہٗ کا لفظ سب سے بڑے مذہبی مشاہدے کے دوران حضورؐ کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے، اس لیے کسی انسان کے لیے عبدہٗ کا اعزاز سب سے بلند مرتبت اور عظمت وتکریم کا باعث ہے۔ یہ بات اور بھی منطقی اور معنی خیز ہے کیوں کہ قرآن حکیم کی ۵۳ویں سورہ النجم کی دسویں آیت میں عبدہٗ کا لفظ دوبارہ مذکور ہوا ہے جس سے مراد نزول وحی یا سفر معراج کے دوران بلند ترین مقام پر پہنچنے کے بعد آپؐ سے خدا کے ہم کلام ہونے سے ہے۔ عبدہٗ کے اس نظریے سے بڑی مقدار میں گراں قدر لٹریچر پروان چڑھا ہے۔ صوفی مصنف قشیریؒ نے گیارھویں صدی میں رسالہ میں اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور علم تصوف میں کئی صدیوں سے اس موضوع کو بڑے پیمانے پر پذیرائی مل رہی ہے۔ (قشیریؒ: باب العبودیہ صفحہ ۹۲)۔ اس صدی میں محمد اقبالؒ کے فکری نظام میں بھی عبدہٗ کے نکتے کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ (دیکھیے بارہواں باب)۔ اس کے ساتھ ہی عبدہٗ سے مسلمانوں کو ہمیشہ یہ یاد دہانی کرائی جاتی ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رفیع الشان روحانی مشاہدے کے باوجود خدا کی مخلوق ہیں البتہ اللہ تعالیٰ نے اپنی پوری مخلوق میں حضورؐ کی سب سے زیادہ تعریف وتوصیف کی ہے اور آپؐ کو بلند ترین منصب پر فائز کیا ہے۔

لیکن ابن عربی کی روایت پر کاربند صوفیہ حضرات اس نظریے کو اکثر دہراتے ہیں کہ حقیقی معراج خلائی اور مکانی نقطہ نظر سے ممکن نہیں کیوں کہ خدا ہر جگہ موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''میرا بندہ سفر کر کے مجھ تک کیسے پہنچ سکتا ہے؟ میں تو ہمیشہ اس کے ساتھ ہوں۔'' (Andrae: Die Person Muhammads, p.84)۔

معراج کی اس حقیقی صوفیانہ تشریح کا اظہار اس چبھتی ہوئی رباعی سے ہوتا ہے جو فارسی کے بدنام صوفی سرمدؔ

(کاشانی۔مترجم) نے، جسے ۱۶۶۱عیسوی میں کفر والحاد کے الزام میں دہلی میں پھانسی دے دی گئی تھی، لکھی تھی:

ملاؔ گوید کہ احمدؐ بہ فلک برشد

سرمدؔ گوید کہ فلک بہ احمدؐ درشد

ترجمہ: ملاؔ کہتا ہے کہ حضرت محمدؐ آسمانوں پر تشریف لے گئے تھے

سرمدؔ کہتا ہے کہ آسمان حضرت محمدؐ میں سما گئے

مختلف علمائے دین اور حضرات صوفیہ نے آں حضرتؐ کے سفر معراج کی تشریح کے ضمن میں جو اہم مباحث کیے ہیں، ان سے قطع نظر معراج کے واقعے نے اسلامی آرٹ اور شاعری پر انمٹ نقوش ثبت کیے ہیں۔ ایران اور فارسی بولنے والے علاقوں میں، خاص طور پر شاعروں نے مذہبی جوش کے زیر اثر پرشکوہ صورت گری کے ذریعے اس پراسرار واقعے کی عکس بندی کی ہے اور اس معاملے میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی جدوجہد میں حضورؐ کے آسمانی سفر کے متعلق منفرد انداز میں خیال آرائیاں کی ہیں، اس غرض کے لیے انہوں نے تمام تر تخلیقی صلاحیتیں استعمال کی ہیں۔ فارسی کی بیشتر عظیم رزمیہ نظموں میں خدا کی حمد وثنا اور رسول کریمؐ کی شان میں قصیدے کے بعد حضورؐ کے سفر معراج کی طویل تفصیلات بیان کی گئی ہیں جن میں قاری کو اس بے نظیر واقعے سے روشناس کرانے کے لیے تمام قابل فہم فصیح و بلیغ تشبیہیں اور استعارے استعمال کیے گئے ہیں۔ اس واقعے کو حسین و دل کش بنانے کے لیے اسے رنگا رنگ تفصیلات سے مزین کیا گیا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ اس شبینہ پرواز کے دوران نبی کریمؐ کے جسم اطہر سے پسینے کے جو قطرے زمین پر گرے، ان سے گلاب کا پھول پیدا ہو گیا تھا۔ اور شاعروں نے اس قول متناقض کو دہرایا ہے کہ اس رات کائنات کا سورج افلاک کی جانب طلوع ہوا تھا۔ (Andrae: Die Person Muhammads, p.83)۔

بھارت اور پاکستان کی علاقائی زبانوں مثلاً پنجابی میں طویل سہ حرفیوں کے ذریعے معراج کے اسرار اور اس معجزے سے انکار کرنے والوں کے لیے سزا کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایران کے حضرات صوفیہ میں فرید الدین عطارؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں کہ انہوں نے معراج کے سلسلے میں انوکھی اور نادر ترکیبیں استعمال کی ہیں۔ انہوں نے الٰہی نامے کے تعارف میں (یہ کتاب جان اے بائیل کے انگریزی ترجمے کے ساتھ دستیاب ہے) حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سفر معراج کے حوالے سے بے پایاں رنگ و نور کا تذکرہ کیا ہے۔ عطارؒ کے معراجیہ اشعار کا مطالعہ کرتے وقت اس بات کو ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ ان کے کلام میں حضورؐ کے آسمانوں پر تشریف لے جانے کے لیے سیڑھی کے استعمال کی ابتدائی روایت بتدریج ختم ہو جاتی ہے اور اس کے بجائے اب پورا سفر براق پر کیا جاتا ہے۔

الٰہی نامے کے فارسی متن کے ہیلمٹ رٹر ایڈیشن کا تعارف بائیل کی نسبت بہت سادہ ہے البتہ اس میں پیغمبرانہ تصوف کے اہم عناصر شامل ہیں۔ انہوں نے نمازوں کی تعداد پچاس سے کم کر کے پانچ نمازیں مقرر کرنے کا

ذکر نہیں کیا بلکہ سفر معراج میں امت کے لیے نبی کریمؐ کے شافع محشر ہونے کا حوالہ دیا ہے۔ یہ رجحان عطارؒ سے کچھ عرصہ پہلے فروغ پانے لگا تھا۔ الٰہی نامہ عطارؒ کے معراجیہ اشعار کا ترجمہ یہ ہے:

جبرئیلؑ نے حاضر خدمت ہو کر کہا: اے پاکیزہ ہستی! آپؐ زمین پر کیوں ہیں؟ آسمانوں پر قدم رکھیے
جب آپؐ عزت و شرف کی بدولت عرش کے بادشاہ ہیں تو پھر فرش سے عرش پر صدر نشیں ہو جائیے
جب آپؐ کی ذات گرامی دونوں جہانوں کے لیے رحمت ہے اور آپؐ کی رحمت دونوں جہانوں کی میزبان ہے
کچھ عرصہ آپؐ نے زمین کو سرفراز فرمایا ہے، اب آسمانوں کی باری ہے کہ وہاں آپؐ کا فیضان عام ہو
آپؐ اپنے فقر سے ان ممالک کو کیمیا بنائیے، اپنی خاک پا کو فرشتوں کا سرمہ بننے دیجیے
جب سرور کائناتؐ کا براق روانہ ہوا تو بجلی کی طرح ساتویں آسمان پر پہنچ گیا
آپؐ براق پر سواری کی حالت ہی میں کرسی کے پاس پہنچے کیوں کہ آپؐ صاحب براق و منبر ہیں
آپؐ کے دائیں طرف عرش کو اٹھانے والے فرشتے تھے اور بائیں جانب زمین کی نگہ بانی کرنے والے ملائکہ
آسمان آپؐ کے براق کے لیے زمین تھا اور روح الامینؑ آپؐ کے دربان تھے
آپؐ کا جھنڈا عرش کی وسعتوں پر لہرایا، آپؐ نے ''مقعد صدق'' میں قدم رکھا
(قرآن کریم میں ایک خاص مقام قرب کو مقعد صدق کہا گیا ہے۔ مترجم)
آسمانوں میں رہنے والوں میں غل مچ گیا کہ کائنات کے سردار وعدہ ملاقات کے مطابق آن پہنچے ہیں
وہ یتیم جنہیں ابو طالب نے پالا پوسا، اب اللہ تعالیٰ کے در یتیم بن کر آ گئے ہیں
بارگاہ الٰہی سے ہزاروں عالی مرتبہ روحیں فوراً آپؐ کے استقبال کو لائی گئیں
آپؐ عیسیٰؑ سے یوسفؑ کی طرح ملے اور آپؐ نے زلیخا کی طرح ان کے بڑھاپے کو جوانی میں تبدیل کر دیا
گویا آپؐ کی روح کی برکت سے حضرت روح اللہ آسمانوں پر دوبارہ زندہ ہو گئے
حضرت سلیمانؑ آئے اور آ کر تخت بچھایا اور حصول فیض کے لیے کاسۂ گدائی آپؐ کے سامنے رکھا
آپؐ کی عزت و حرمت کی بنا پر حضرت موسیٰؑ بھی استقبال کے لیے روانہ ہوئے، یہ خواہش لیے کہ آپؐ کی امت میں سے ہوتے
حضرت ابراہیمؑ بھی اپنی ساری جمع پونجی لے آئے کہ آپؐ کے حضور میں اپنے بیٹے کو قربان کر دیں
حضرت نوحؑ بھی کشتی میں سے حاضر خدمت ہوئے اور لطف و کرم سے سرفراز ہوئے
(عطارؒ نے یہاں ''جودی'' کا لفظ بہت معنی خیز انداز میں استعمال کیا ہے اور اس کا مطلب یہ بھی بنتا ہے کہ سرور کائناتؐ ہی کے طفیل ان کی کشتی کوہ جودی پر جا ٹھہری تھی۔ مترجم)

حضرت آدمؑ آئے اور آتے ہی خوشیاں منائیں کہ انہوں نے آپ ؐ کی ذات مبارک میں گوہر آدم کی جھلک دیکھ لی

پھر جنت کے ذمے دار فرشتے رضوان نے مشروبات سامنے لا رکھے اور بار بار طویل سفر کے بارے میں پوچھا

رضوان نے شراب سلسبیل پیش کی کہ راستے میں کہیں خشکی کا اثر نہ ہو گیا ہو

اس مشروب میں کافوری ٹھنڈک کی تاثیر تھی کہ کہیں گرمی عشق سے آپ ؐ کا باطن حرارت زدہ نہ ہو گیا ہو

آپ ؐ کو یقین کی ٹھنڈک بہت حاصل تھی، زنجبیل کا مشروب بھی پیش کیا گیا

آخر جب آپ ؐ کے معتدل مزاج نے دل کا قصد کیا تو وہاں آپ ؐ نے شہد اور دودھ کو ملا کر نوش فرمایا

آپ ؐ کو اخلاص نے طہٰ بنایا تھا اس لیے آپ ؐ کو شراب طہور کا مشروب خاص پیش ہوا

''رحیق مختوم'' آپ کا مشروب تھا اور اس پر لگی ہوئی مہر کا راز اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا

وہ آسمان جو سورج کا باز یچہ تھا، اس رات کو براق کی ناز برداری کرتا تھا

سورج اس کی سنہری کاٹھی تھا اور ماہ نو رکاب کی طرح اس کے پاؤں چومتا تھا

چاند کا خرمن آپ ؐ کے خاص براق کے لیے مخصوص تھا، اسے جوزا سے جو کھلائے گئے اور کہکشاں کی گھاس!

اس رات اس راستے میں آپ ؐ کا براق اتنا تیز دوڑا کہ اس کا ایک نعل آسمان پر گر گیا

ماہ نو آپ ؐ کے براق کا وہ نعل تھا جسے آسمان نے اپنے کان کا بندا بنالیا اور اپنی آرائش کر لی

خادم نیزہ ہاتھ میں لیے راستے سے جن و شیاطین کو بھگانے پر مامور تھا

تمام حوریں ایک جگہ جمع ہوئیں، وہ گویا فرش سے عرش پر جا پہنچی تھیں

اس فیروزی چمن کی تاریک رات نے آپ ؐ کے چہرہ انور کی زیارت کے لیے بہت سی آنکھیں روشن کر لیں

عرش نے مسرت سے آپ ؐ کا آراستہ خیمہ لگایا اور اس میں آپ ؐ کا تکیہ لگایا

آپ ؐ کے دو گیسوؤں سے طوبیٰ کا مرتبہ بلند ہوا اور اس نے فردوس پر سایہ ڈالا

''ذنب'' نے جب آپ ؐ کے سامنے سر اٹھایا تو ''عقرب'' کی طرح آپ ؐ کی ہیبت سے اس کی دم کٹ گئی

آسمان نے خوشیوں کا جاروب بنایا اور پھر جھک کر آپ ؐ کا راستہ صاف کرنے لگا

جب خرچنگ نے آپ ؐ کی آبرو دیکھی تو خود کو دوڑ کر پانی پر ڈال دیا

''جوزا'' نے جب آپ ؐ کی سالاری میں کمر باندھی تو ''ترازو'' نے آکر اس کا عقاب باندھ دیا

کمان (قوس) نے آپ ؐ کے سامنے اپنی کمان توڑ دی، اس کے دو گھر تھے جو اس نے آپ ؐ پر قربان کر دیے

''حمل'' اور ''جدی'' کو بھون دیا گیا، چاند سے لے کر چاند کے بیل تک دستر خوان بچھا دیا گیا

''اسد'' آپؐ کے خیمے پر بنا ہوا شیر بن گیا، ''دلو'' چرخی کی طرح آپؐ کے گرد گھومنے لگا

دونوں بہنوں نے جب آپ کا چہرہ دیکھا تو فرطِ شوق سے نقاب ہٹا دیے

دونسرین بے صفت حاضر ہو گئیں تا کہ کوئی بدشگونی واقع نہ ہو

اگرچہ سات آسمان قطب کے گرد گھوم رہے تھے جیسے سات اولیا قطب کے تحت ہوتے ہیں

لیکن جب انہوں نے آپ کی مردانگی اور حیات دیکھی تو بنات النعش کی نعش گھسیٹنے لگے

ہر فرشتہ خاص انگیٹھی لے آیا تا کہ خلوص سے آپؐ کے عشق کا عود جلائے

رضوان نے خلد کے آٹھوں دروازے کھول دیے اور نور استوں پر کوثر کے پانی سے چھڑکاؤ کیا

خازنِ فردوس نے جہان کو خوش کر دیا کہ حوروں کا ایک جہان نذر کیا

آپؐ کے شکوہ کے سامنے عرش ہل تک نہ سکا اور کرسی کی طرح اپنے پایوں پر جما رہا

جب حضرت نوحؑ نے آپ کی خاکِ پا کی قدر پہچانی تو شیعوں کی طرح اس مٹی سے سجدہ گاہ بنالی

جب جہانِ نور آپؐ کے جمال سے معمور ہو گیا تو بیت المعمور آپؐ کے عشق میں وارفتہ ہو گیا

آسمان نے آپؐ پر نثار کرنے کے لیے صحیح اقدام کیا کہ جو کچھ بھی اس کے پاس تھا، وہ اس نے طشت پر رکھ دیا

ہر آسمان تحفے میں سوسو تھیلیاں لایا اور سوسو طریقے سے پیش کرنے کا حق ادا کیا

آسمان نے اللہ سے آپؐ کے آنے پر تحفہ مانگا تو اللہ نے ہر رات اسے ستاروں سے سجا دیا

آسمان پر آپ کی تشریف آوری کے اس انعام ہی کی وجہ سے حدیث میں فرمایا گیا کہ میرے اصحابؓ ستاروں کی مانند ہیں

اس رات کے سورج کی شان ہی نرالی تھی، اس کی طرف سے ہر ستارے کو نیا نور ہی نصیب ہوا

چاند نے زحل کو آسمان کا عشر دیا، فتویٰ کے مطابق مشتری کو چادر عطا کی

جلادی نے مریخ کو سربلندی دی، گیسوؤں کا سایہ سورج پر ڈال دیا

زہرہ کو شیریں زبانی بخشی، حکمت کے میدان میں عطارد کو فرماں روائی دی

چاند کو واضح طور پر یوسفؑ والی نارنگی ملی اور اس کا ہاتھ کٹ گیا

آفتابِ شریعت نے ایسی ارتقائی منزلیں طے کیں، جبریلؑ چھ لاکھ پروں کے ساتھ بھی

آپ کی گردِ راہ کو نہ پاسکا اور اسے آپ کا سراغ تک نہ ملا

جبریلؑ نے جب فرشتوں کی صفوں کو الگ کیا تو ہموار میدان کی طرح کی ایک دنیا دیکھی

ایک ایسی دنیا جس میں دنیا کی کوئی نشانی نہ تھی، نہ ہمواری تھی نہ رفرف

ایک ایسی دنیا جس میں نہ نزدیکی تھی، نہ دوری، جو نورالنور سے نور علیٰ نور تھی

اس دنیا کی زمین حلم و بردباری کی تھی اور اس کا آب رواں علم تھا

اس کا باعظمت آسمان جلال کا تھا اور اس کا منور سورج جمال تھا

شوقِ حق سے جبریلؑ کی روح کو یوں پسینہ آ گیا کہ اس کا سینہ سو طرح چاک ہو گیا

جی ہاں! اس کا سینہ آسمان تھا جو سارے کا سارا شق ہو گیا کیوں کہ اس رات کو آپ کا چہرہ مبارک دیکھ لیا تھا

کہکشاں اسی سینہ چاکی کا نشان ہے کہ جس میں نو آسمان ذرہ ذرہ ہو گئے تھے

معراج میں وہ نو پردے اس لیے چاک ہو گئے کہ وہ ہمیشہ سے اللہ کے خاص پردے تھے (جو اس پر تنے ہوئے تھے)

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اب حضرت آدمؑ سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک تمام پیغمبروں کے ساتھ تعارف کرایا جاتا ہے کیوں کہ ہر پیغمبر نے ذات خداوندی کا مختلف انداز میں مشاہدہ کیا ہے، صرف حضورؐ کو خدائے ذوالجلال کا مکمل علم ہے:

جب عیسیٰ علیہ السلام نے پروقار، بلند پایہ اور رفیع المرتبت حضورؐ کو دیکھا

تو وہ اپنی ناداری اور فرومائیگی پر دم بخود ہو گئے

پھر جب رسول کریمؐ کو اپنے دوست کی قربت کا احساس ہوا

تو آپؐ اپنے مونس سے ملاقات کرنے چل پڑے

جب آپؐ اپنے رفیق اعلیٰ سے ملنے

سدرۃ المنتہیٰ سے آگے نکل گئے

تو آپؐ کا وفادار رفیق راہ منزل صاحب قوت وعظمت جبریلؑ

جس کا ایک پر آسمان سے زمین تک پوری فضا کو ڈھانپ لیتا ہے

حضورؐ کے پیچھے رہ گیا لیکن مصطفیٰؐ آگے چلتے گئے

جب آپؐ شاہی دالان کے پیچھے رہ گئے

تو آپؐ نے جبریلؑ کی طرف مڑ کر اس سے پوچھا:

''آپ پیچھے کیوں رہ گئے ہیں؟ میرے پاس آ جاؤ!''

جبریلؑ نے جواب دیا: ''اے اسرار کے شہنشاہ!

اس سے آگے جانا میرے بس میں نہیں!

اے کائنات کے فرماں روا! آپ آگے چلے جائیں
میری منزل یہاں ختم ہوگئی ہے اور مجھے آگے جانے کی اجازت نہیں
اگر میں بال برابر بھی اس سے آگے جاؤں
تو خدا کے نور سے میرے پر جل جائیں گے!
لیکن آپؐ کو اپنے رفیق اعلیٰ سے ملاقات کے لیے آگے جانا چاہیے
کیوں کہ خدا کی قربت آپؐ کے لیے سودمند ہے!''
غرض آقاؐ وہاں سے چل پڑے اور جبریلؑ کو وہیں چھوڑ دیا
آپؐ نے خدا کے سوا ہر چیز کو دل سے نکال دیا
آپؐ اس قدر تیز رفتار تھے کہ جب آپؐ نے پیچھے مڑ کر دیکھا
تو جبریلؑ آپؐ کو ایک چڑیا کی طرح نظر آئے
آپؐ جبریلؑ کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھتے گئے
یہاں تک کہ آپؐ کو غیر مرئی ذات کے پردے دکھائی دینے لگے
آپؐ کون و مکاں، سمت، عقل و استدلال
عرش فرش اور گرد آلود زمین کی حدوں کو پار کر گئے
آپؐ نے لامکاں کو روح اور آنکھوں کے بغیر دیکھا
آپؐ حیرت میں گم تھے
جب آپؐ کو آغاز کے انجام کا ادراک ہوگیا
تو آپؐ کو دوست کی جانب سے پہلا پیغام ملا
یہ آواز جوہر کائنات کی تھی!
''اے تغیر پذیر ذات! اپنی روح اور جسم سے دست بردار ہو جا!
اے میرے مقصود، میرے مطمحِ نظر!
میرے دوست! اب میرے جوہر کو اپنے سامنے دیکھو!''
چناں چہ آپؐ حیرت میں گم ہو گئے اور اپنی گفتار بلکہ اپنا وجود کھو بیٹھے
اس مقام پر محمدؐ، محمدؐ کو نہیں جانتے تھے
آپؐ نے اپنی ذات کی طرف نہیں، روح الارواح کو دیکھا

اس ذات اقدس کا چہرہ جس نے کائنات کو تخلیق کیا!

فرید الدین عطارؒ نے حضورؐ کی حیرت اور نفی ذات کے بارے میں اور تفصیلات بھی بیان کی ہیں۔ لیکن آخر میں خدا آپؐ سے مخاطب ہو کر آپؐ کی مزید عزت افزائی کرتا ہے:

اللہ کی طرف سے خطاب ہوا کہ اے سرورؐ! آپؐ اس در پر آئے ہیں تو آپؐ کی کیا حاجت ہے؟

آپؐ کا دل اپنے گناہ گار امتیوں میں اٹکا ہوا ہے، آپؐ کو کمزور ترین امتی کا بھی بہت خیال ہے جو پتا چل رہا ہے

رسول کریمؐ نے عرض کیا کہ اے اللہ! آپ کو میرے حال کا علم ہے جس کی وجہ سے مجھے سوال کرنے کی حاجت ہی نہیں رہی

جب آپ کے انعام و اکرام کی خلعتیں مسلسل مجھے عطا ہوتی رہی ہیں تو میں یہ کہہ کر چپ ہو جاتا ہوں کہ میں آپ کی حمد و ثنا کا حق ادا نہیں کر سکتا

میرا وجود کلی طور پر گم ہو گیا، سورج ہی سورج باقی رہ گیا، سایہ ناپید ہو گیا

جب دو جہانوں کے سردار نے اپنا عجز دیکھا تو اللہ نے ''قاب قوسین'' سے آپؐ کو تقویت دی

چوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام جہانوں پر بھاری ہیں اسی لیے وہ کمان آپؐ کے بازوؤں کو عطا ہوئی

قاب قوسین کی کمان سے زیادہ عمدہ کمان کوئی سالار جنت بھی نہیں دیکھ سکتا

جب آپؐ معرفت میں مستغرق تھے تو آپؐ میں تیر کی دو صفتیں موجود تھیں

ایک تو استقامت اور جم کر کھڑے رہنا اور دوسرے تیر کی طرح سفر کرنا

چوں کہ آپؐ کی ذات میں تیر کی یہ دو نشانیاں موجود تھیں اس لیے دو کمانوں کا ذکر کر کے آپؐ کے ان دو مقامات کی مثال دی گئی

پہلے جب آپؐ حق کی طرف روانہ ہوئے تو یوں لگے جیسے تیر کمان سے نکل کر جاتا ہے

پھر آپؐ کو مخلوق کی طرف لوٹایا گیا تو بھی جیسے کمان سے تیر چھوڑا جاتا ہے

چوں کہ آپؐ کے یہ دونوں سفر دو کمانوں سے ہوئے اس لیے ان کی مثال قاب قوسین کہہ کر دی گئی

خدا نے کہا: ''آپؐ وجہ تخلیق کائنات اور میرا مقصود ہیں

آپؐ جو چاہتے ہیں، اس کی درخواست کریں اے دیکھتی ہوئی آنکھ!''

حضرت محمدؐ نے کہا: ''اس سے قطع نظر کہ کیسے؟ آپ ہر چیز کو جانتے ہیں

اے رازِ دروں! اے اسرارِ ظاہری!

آپ میری سب سے دلی اور سب سے عزیز خواہش سے اچھی طرح آگاہ ہیں

اب میں آپ سے اپنی امت کے لیے التجا کرتا ہوں!
میری امت گناہ گار ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ
وہ تیری ذات اور تیری بے حد و حساب بخشش کو بخوبی جانتی ہے
اسے تیری محبت اور رحمت کے بحرِ بے کراں کا پورا علم ہے
اگر آپ میری ساری امت کو بخش دیں تو کیا ہی اچھا ہو!''
خدائے ذوالجلال ایک مرتبہ پھر حضورؐ سے مخاطب ہوا:
''اے دوست! میں نے آپؐ کی ساری امت کو بخش دیا ہے
آپؐ کو اپنی امت کے متعلق فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں
کیوں کہ میرا بے انت لطف و کرم ان کے گناہوں سے بہت بڑا ہے!''

امت مسلمہ کے لیے آں حضرتؐ کی شفاعت قبول ہونے کے بعد خدا نبی کریم کو، جنہیں وہ اپنی پوری مخلوق میں ''بے مثل'' اور ''سب کی دیکھتی آنکھ'' سے مخاطب کرتا ہے، تین مرتبہ اپنے تیس ہزار اسرار سے آگاہ کرتا ہے۔ (رومیؒ کے مطابق ان اسرار کی تعداد ستر ہزار ہے۔ افلاکیؒ نے مناقب العارفین میں بھی یہی تعداد لکھی ہے۔ رسول کریمؐ نے اللہ تعالیٰ کے سامنے ستر مرتبہ قرآن کریم کی بھی تلاوت کی)۔ اس کے بعد عطارؒ نے سفر معراج کے حقیقی راز پر گفتگو کی ہے اور الٰہی نامے کا خاتمہ حضورؐ کی خدمت میں ایک دعا سے کیا ہے۔ اس دعا میں رسول پاک کو تمام پیغمبروں سے ممتاز اور منفرد پیغمبر قرار دیا گیا ہے جن پر اسے بھروسا ہے اور جن کے ساتھ وہ محبت کرتا ہے۔

فریدالدین عطارؒ کے مطابق جبریلؑ کا رول خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ایک حدیث مبارکہ میں، جس کے ساتھ حضرات صوفیہ کو بے حد محبت ہے، پیغام خداوندی کے حامل رئیس الملائکہ کی حالت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جسے سدرۃ المنتہیٰ پر ہی رکنا پڑا تھا۔ (سورہ النجم آیت ۱۴: فروزانفر: احادیث مثنوی: ۲۶: ۴۴۵)۔ ''چناں چہ جبریلؑ کی حالت اس بلبل کی سی ہو گئی جو اپنے گلاب کے پھول سے بچھڑ گئی ہو۔'' (ترک شاعر غنی زادہ نے بھی اپنے معراجیہ میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے)۔ جبریلؑ کی جس قدر بھی عظمت ہو، اس سے قطع نظر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) ایک مخصوص مرتبے کے حامل تھے۔ ایک روایت کے مطابق رسول کریمؐ نے ایک دفعہ رئیس الملائکہ کو دیکھنے کی درخواست کی تھی جو عموماً ایک خوب رو دوست کی شکل میں ظاہر ہوتے تھے لیکن ان کی اصل صورت اس قدر مہیب تھی کہ ایک مرتبہ آپؐ اسے دیکھ کر تقریباً بے ہوش ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود اس طاقت ور فرشتے کو، جس کا ایک پر آسمان اور زمین کے درمیان پورے خلا کو پُر کر دیتا ہے، خدائے بزرگ و برتر تک رسائی حاصل نہیں۔ چناں چہ یونس ایمرے دوسرے عظیم صوفیوں کے ساتھ مل کر گاتا ہے:

ترجمہ: عشاق کے نزدیک جبریلؑ بھی ایک نقاب ہے

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اس پردہ راز سے متعلق مشہور حدیث میں کہا گیا ہے:
لی مع اللہ وقت یعنی خدا کے ساتھ میرا ایک وقت ہے جس میں جبریلؑ کو بھی، جو ایک خالص روح ہے، اجازت نہیں ہے۔ (فروزانفر: احادیث مثنوی نمبر ۱۰۰)۔ اس معمے کا تعلق سفر معراج کے راز سے ہے جس میں حضورؐ کو سلسلے وار تخلیقی وقت کی پابندیوں سے آزاد کر کے خدا کے لازمانی اب کی طرف لے جایا گیا تھا۔ غرض وقت کی اصطلاح کو حضرات صوفیہ کی زندگی میں مرکزی نکتے کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، اس طرح صوفی کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ وہ خود کو مکمل طور پر خدائی لمحے کے سپرد کر دے۔ اسی حوالے سے صوفی کو ابن الوقت یعنی وقت کا بیٹا بننے کی ہدایت کی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خدائی فیضان کے لمحے میں زندہ رہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ وقت کے بارے میں حدیث کا تعلق نماز کے مشاہدے سے بھی ہے۔ معراج سے واپسی کے بعد حضورؐ جب بھی ربانی موجودگی کی جانب لوٹنا اور کون و مکاں کے حدود سے آزاد ہونا چاہتے تو آپؐ اپنے ایتھوپیا کے موذن بلالؓ سے فرمایا کرتے: ''اے بلال! نماز کے لیے اذان دے کر ہمیں تر و تازہ کر دو۔'' چناں چہ نماز پنجگانہ، جیسا کہ نبی کریمؐ نے ایک مرتبہ فرمایا، مومنوں کی معراج ہے۔ مولانا رومیؒ نے اپنے ایک مرید کی طرف سے پوچھے گئے ایک سوال کے مشہور جواب میں نماز کے اسرار پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا:

رسمی نماز ختم ہو جاتی ہے لیکن روح کی نماز لامحدود ہے، یہ روح کا استغراق اور مدہوشی ہے جو تمام ظاہری قواعد اور دستور کو پس پشت ڈال دیتی ہے۔ اس وقت جبریلؑ تک کے لیے، جو ایک خالص روح ہے، کوئی جگہ نہیں ہوتی۔
(Schimmel: The Triumphal Sun, pp.352-66 نیز Arberry: Discourses of Rumi, p.24)۔

رومیؒ نے اس حدیث سے استفادہ کرتے ہوئے مثنوی میں جبریلؑ کو عقل کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے جو محبوب کے دروازے تک پہنچنے میں تو انسان کی رہنمائی کرتی ہے لیکن اس کو محبوب سے وصل کے لیے اس کے مکان میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ عقل کو محبوب کی دہلیز پر رکنا پڑتا ہے کیوں کہ اسے بھی جبریلؑ کی طرح، جسے انوار خداوندی سے پر جلنے کا خدشہ تھا، عالم سوز و ساز میں وصل یار کے نتیجے میں مرگ آرزو کا اندیشہ ہوتا ہے۔

معراج کی بنیادی کہانی کو مختلف پیرایوں میں آراستہ کیا گیا ہے، خاص طور پر صوفیوں کے حلقوں میں اس پر اپنے اپنے انداز میں حاشیہ آرائی کی گئی ہے۔ بلوچستان کی ایک افسانوی حکایت تو اوپر بیان کیے گئے قصے سے بھی زیادہ دل کش ہے جس میں قرون وسطیٰ کے عظیم صوفی عبدالقادر جیلانیؒ کو جبریلؑ سے بھی برتر مقام دے دیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عرش پر خدا کے پاس جانے کے لیے براق سے نیچے اترنا چاہتے تھے، اس وقت جبریلؑ پہلے ہی آپؐ سے جدا ہو چکے تھے چناں چہ عبدالقادرؒ نے، جو بعد میں عالم اسلام میں تصوف کے سب سے بڑے سلسلے (قادریہ۔ مترجم) کے بانی بنے، حضورؐ کے سامنے اپنی گردن پیش کر دی کہ آپؐ ان کی گردن پر

قدم رکھ دیں جس کی غایت یہ تھی کہ آں حضرت کو براق سے اترنے میں کوئی بے آرامی نہ ہو۔ اس کے شکریے میں حضورؐ نے مستقبل کے اس ولی کو خصوصی رتبے سے نوازا اور واقعہ معراج کے پانچ سو سال بعد پیدا ہونے والے اس بزرگ کو یہ پیش گوئی کی کہ ان کا قدم ہر ولی کی گردن پر ہوگا۔ (Longworth Dames: Popular Poetry of the Baluchistan, p.158)

پیر پیراں عبدالقادرؒ کی تعریف میں پنجابی میں لکھی جانے والی ایک نظم میں بھی یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "وہ رسول اللہؐ کے چمنستان کا دل فریب پھول ہیں جن کی گردن پر حضورؐ نے قدم رکھا تھا۔" (میں نے انیسویں صدی کے آخر میں لکھی جانے والی اس نظم کا مسودہ جھنگ کے سید ذوالفقار علی بخاری کے پاس دیکھا تھا)۔ کہا جاتا ہے کہ عبدالقادرؒ کی طرف سے برتری کا یہ مشہور دعویٰ کہ "میرا قدم ہر ولی کی گردن پر ہے"، ان کے زمانے کے تمام ولیوں نے سنا تھا۔ اس دل کش حکایت کے ذریعے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ رسول کریمؐ کے آسمانی سفر کے دوران نہایت اہم موقعے پر عبدالقادرؒ بھی موجود تھے۔ مولویہ روایت بھی اس جدت طرازی میں کسی سے پیچھے نہیں رہی۔ مناقب العارفین کے مطابق نبی کریمؐ نے عرش پر ایک عجیب تمثیل دیکھی تھی، یہ مولانا رومیؒ کی شبیہ تھی اور اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ شیعہ روایات کی رو سے باری تعالیٰ سے ملاقات میں حضرت علیؓ ابن ابی طالب بھی آں حضرتؐ کے ہمراہ تھے۔

معراج کے واقعے نے شاعروں بلکہ تصوف پر یقین رکھنے والوں کو ہمیشہ مسحور کیا ہے۔ عطارؒ کے ہم وطن پیشرو نظامیؔ نے اپنی رومانوی رزمیہ نظم میں معراج کے بارے میں کمال فنی مہارت کے ساتھ اس واقعے کی جزئیات بیان کی ہیں۔ انہوں نے آسمان کے رنگوں، حضورؐ کے آگے پرواز کرنے والے اور اردگرد موجود فرشتوں کے ملبوسات، روشن و تاباں بادلوں اور سات سیاروں کا بڑی محبت اور بھرپور تخیلاتی قوت سے تذکرہ کیا ہے۔ جامیؔ کی عظیم رزمیہ نظموں میں بھی معراج کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں یوسفؑ اور زلیخا کا قصہ سب سے خوب صورت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اس مقدس رات کو بھیڑیا اور بکری کا بچہ، بھیڑ اور شیر پرامن طور پر ساتھ ساتھ لیٹے ہوئے تھے اور سبز طاؤس سے تیز رفتار جبریلؑ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی سواری کے لیے حسین براق لائے تھے۔ نظامیؔ کے بعد جامیؔ نے ان اجرام سماوی اور سیاروں کا ردعمل بیان کیا ہے جہاں سے حضور گزرے تھے، مثال کے طور پر انہوں نے چوتھے کرے کا حوالہ دیا ہے جو آں حضرتؐ کے پاؤں دھونے کے لیے پانی کا بلوریں قرابہ لایا تھا۔ عطارد اور زہرہ بھی آپؐ کی خدمت کرتے رہے، افسردہ سیارہ زحل عالم وجود کے سورج کو دیکھ کر تسکین پاتا ہے۔

بعد میں دنیائے اسلام، خاص طور پر فارسی بولنے والے علاقوں کے شاعروں نے نظامیؔ، عطارؔ اور جامیؔ کی پیروی کی اور اگر آپ سید بلاقی یا سترہویں صدی کے بیجاپور کے نصرتیؔ کا مطالعہ کریں یا ان کے ترک ہم عصر غنی زادہ کو پڑھیں تو اس میں معراج کے متعلق حیرت انگیز اور انوکھی تفصیلات ملیں گی۔ ان شاعروں کے ہاں اکثر و بیشتر ان

خیالات کو دہرایا گیا ہے کہ آں حضرتؐ کے چپلوں نے عرش کو چھوا تھا اور یہ کہ آپؐ کے راستے کی دھول عرش خداوندی کا تاج تھی۔

مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ستر ہویں صدی کے ترک شاعر غنی زادہ کا کلام اس آرٹ کی بہترین مثال ہے، جس میں حد درجہ مرصع اور مبالغہ آرائی پر مبنی زبان استعمال کی گئی ہے۔ شاعر نے معراج کے بارے میں حضورؐ کے ان گنت معجزوں کا ذکر کیا ہے اور بعد میں وہ نظم کے اصل موضوع کی طرف لوٹ آتا ہے۔ یہاں وہ براق کی تشریح کرتا ہے، یہ دل کش چوپایہ گدھے سے بڑا لیکن گھوڑے سے چھوٹا ہے۔ شاعروں نے براق کا ہمیشہ محبت بھرے لفظوں سے تذکرہ کیا ہے جسے نور سے تخلیق کیا گیا ہے، اس کا چہرہ عورت جیسا اور دم مور کی سی ہے۔ وہ نہایت برق رفتاری کے ساتھ کہکشاں میں سے گزر کر آں حضرتؐ کو آسمانوں پر لے گیا۔ راستے میں فرشتوں نے بڑے تپاک سے حضورؐ کا خیر مقدم کیا اور آپؐ کی مدح سرائی کی:

ترجمہ: جبریل رات کو رسول اکرمؐ کے پاس آئے

وہ ایک براق کو لائے جو بجلی کی طرح تیز رفتار تھا، وہ آسمانوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا گیا

یہ ایک عجیب سواری تھی، وہ تیزی سے بھاگتا

پلک جھپکتے ہی زمین سے عرش پر پہنچ گیا

زمین کی اقلیم میں وہ ایک تیز رفتار غزال

اور آسمانوں میں پرواز کرتا ہوا بے مثل عنقا تھا

اس کا جسم گلاب کے پھولوں اور بال سنبل سے بنے ہوئے تھے اور اس کی دم کیا خوب صورت تھی!

اس کے کان نرگس کے پھولوں اور سرخ آنکھیں ٹمٹماتی ہوئی نرگس شہلا جیسی تھیں......

رسول اللہؐ جب اجرام فلکی سے پرواز کر رہے تھے تو کائنات کی ہر چیز آپؐ کی خدمت کر کے مسرور تھی:

عطارد نے اس شہنشاہ کے حکم کو آسمان کی لوح پر لکھ دیا

اس کے نزدیک رات کی حیثیت حروف جیسی تھی، وہ ستاروں کو داغ دھبے دور کرنے والی ریگ

اور چاند کے ماتھے کو طغریٰ سمجھتی تھی......

جبریل امینؑ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس رک گئے اور براق کی جگہ رفرف نے لے لی۔ (رفرف کا ذکر قرآن حکیم کی ۵۵ ویں سورہ الرحمٰن کی ۷۶ ویں آیت میں کیا گیا ہے۔ مترجم)۔ اس سے مراد جنت کی مسند یا غالیچہ ہے۔ آخر میں رفرف بھی پیچھے رہ جاتا ہے جیسے ''خزاں میں ایک پتے کو تازہ پھل سے الگ کر دیا جائے۔'' (یہاں رفرف کو غالباً ایک سبز بادل کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے)۔ اب حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ذات خداوندی سے ملاقات کے

لیے تنہا عرش پر پہنچ جاتے ہیں جہاں آپ کو وہ مشاہدہ ہوا جسے حضرات صوفیہ افلاطونی روایت کے مطابق ''بالمشافہ ملاقات کی پرواز'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

اس پورے عمل میں براق کا کردار نہایت منفرد ہے اور ان نظموں میں اسے نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اب سیڑھی یا براق کے تصور کو مکمل طور پر فراموش کر دیا جاتا ہے البتہ اس واقعے کی تفصیلات کے ضمن میں اس کا تذکرہ بدستور جاری رہتا ہے۔

شاعر حضرات معراج کے واقعے سے مسلسل روحانی وجدان حاصل کرتے رہے ہیں، اس سے انہیں حضورؐ کی عظمت کو فصیح و بلیغ انداز میں پیش کرنے کا موقع ملا ہے۔ ایران اور اس کے ثقافتی دائرہ اثر میں آنے والے ملکوں کے صورت گروں اور نقاشوں نے واقعہ معراج کی نہایت خوب صورت پینٹنگز بنائی ہیں۔ چودھویں صدی کے آخر میں تیار کیے جانے والے معراج نامے کا نقش و نگار سے مزین نادر مسودہ اب پیرس میں محفوظ ہے۔ اس معراج نامے میں (جس کا اصل مسودے کے عین مطابق عمدہ ایڈیشن اب دست یاب ہے) ان تمام مرحلوں اور مقامات کی عکاسی کی گئی ہے جہاں سے نبی کریمؐ سفر معراج کے دوران گزرے تھے۔ دوسرے تمام فن پاروں میں صرف ستاروں بھرے آسمان کے راستے کی عکس بندی کی گئی ہے، جیسا کہ ایک سندھی لوک گیت میں کہا گیا ہے:

ترجمہ: جبریلؑ آپؐ کے سامنے پیدل چل رہے تھے

اور دولہا گھوڑے پر سوار تھا

ان پینٹنگز میں حضورؐ کو، جن کے چہرے پر نقاب ہے، شب کو براق پر سوار، رنگارنگ بادلوں میں گھرے آسمانوں سے گزرتے دکھایا گیا ہے۔ جدید دور میں بعض اوقات آپؐ کو براق پر بیٹھے خوب صورت سفید بادل یا گلاب کے پھول کی تمثیل میں ظاہر کیا جاتا ہے، آپؐ کے اردگرد قیمتی لباس میں ملبوس فرشتے عطر پاشی کرتے ہیں اور آپؐ پورے تزک و احتشام اور دھوم دھام سے شاہانہ انداز میں تخت خداوندی کے دروازے کی طرف جا رہے ہیں۔ جس کسی نے نظامی کے مسودے میں، جو اب برٹش لائبریری میں ہے، سلطان محمد کی منقش تصویر دیکھی ہے، وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ شاعر اور مصور حضورؐ کے آسمانی سفر سے فیضان اور وجدان حاصل کرتے رہے ہیں اور انہوں نے ادب اور مصوری کے انتہائی نادر مذہبی شہ پارے تخلیق کیے ہیں۔ (S.C. Welch: Wonders of the Age)۔ معراج کا واقعہ عوامی شاعری میں بھی مقبول موضوع رہا ہے اور لوک شاعر سفر معراج کے دوران رونما ہونے والے معجزوں کو نہایت رنگین انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اس صنف کی نظمیں ۱۳۰۰ عیسوی کے لگ بھگ اناطولیہ کے یونس ایمرے نے لکھی ہیں۔ (بھارت اور پاکستان کے مسلمانوں کی لوک شاعری میں بھی اسی قسم کی مثالیں موجود ہیں):

ترجمہ: خدا نے جبریلؑ کو بھیجا اور کہا:

''میرا محمدؐ آئے گا!''
اس نے کہا: ''یہ براق ان کے پاس لے جاؤ''
''میرا محمدؐ آئے گا!''
''وہ پہلے مدینے جائے گا
اس کے سامنے فرشتے پرواز کریں گے
جنت کے دروازے کھول دو ــــ
محمدؐ کو اس میں داخل کرو!''
''میرا محمدؐ آئے گا، آئے گا''
''وہ میرا عرش دیکھے گا
جنت کے پھول توڑے گا ــــ
میرا محمدؐ انہیں سونگھے گا!''
''میں دور کی چیزیں اس کے قریب لاؤں گا
میں اس کی ہر خواہش کو پوری کروں گا
اور تمام فرشتے سبز قبائیں پہنیں گے ــــ
میرا محمدؐ دیکھے گا!''

ایسی نظمیں ہندوستان یاترکی کے مسودوں میں موجود معراج کے واقعے سے متعلق سادہ پینٹنگز سے گہری مماثلت رکھتی ہیں بلکہ آج کل افغانستان اور پاکستان کے مال بردار ٹینکر ٹرکوں پر بھی اسی قسم کی تصویریں بنائی جاتی ہیں جن میں نفیس براق کو دلہن کا لباس پہنایا گیا ہے۔ ان تصویروں کو بڑی احتیاط اور محبت کے ساتھ رنگ کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کو یقین ہے کہ یہ مقدس مخلوق اس گاڑی کی حفاظت کرے گی اور جس طرح براق ان کے محبوب پیغمبرؐ کو تیزی اور احتیاط سے کہکشاؤں کے بیچ سے گزار کر لے گیا تھا، اسی طرح وہ اس گاڑی کے محفوظ طور پر پاکستان کی سنگلاخ سڑکوں سے گزرنے میں ان کی رہنمائی کرے گا۔

جس طرح براق کی تصویر ایک تعویذ یا پاکستان کے پہاڑی علاقوں میں سادہ لوح ٹرک ڈرائیوروں کے لیے طلسماتی اثر رکھتی ہے یا برصغیر ہندوستان میں بزرگوں کے مشہور مزاروں پر جانے والے عقیدت منداسے جادوئی چیز سمجھتے ہیں، اسی طرح حضرات صوفیہ حضورؐ کے سفر معراج کو ابتدائے اسلام سے لے کر اب تک روحانی مشاہدے کا ایک نمونہ اور مثال تصور کرتے ہیں۔ صوفیائے کرام نویں صدی سے اپنے وجدانی سفر کو آسمانوں کے سفر سے تعبیر کرتے چلے آرہے ہیں کیوں کہ جیسا

کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں ـــــ یہ لوگ روحانی طور پر وہ مشاہدہ کرتے ہیں جو نبی اکرمؐ نے جسمانی طور پر کیا تھا۔ شمالی ایران کے تنہا صوفی بایزید بسطامیؒ، جن کے اقلیم افلاک کی پروازوں سے متعلق مکاشفوں کو صوفیوں کے ابتدائی قول متناقض کا درجہ حاصل ہے، اس علامت کو استعمال کرنے والے غالباً پہلے بزرگ ہیں۔ (سراجؒ: کتاب اللمع صفحات ۳۸۲ تا ۳۸۷۔ عطارؒ: تذکرۃ الاولیا: ۱: ۱۷۲ تا ۱۷۶: Nicholson: An Early Arabic Vision of Abu Yazid -al- Bistami, Ritter: Die Ausspruche des Bayezid Bistami)۔

شمس تبریز نے کہا ہے: ''حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اتباع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ چوں کہ حضورؐ معراج پر تشریف لے گئے تھے، اس لیے تمہیں بھی آپؐ کے پیچھے جانا چاہیے۔'' (افلاکی: مناقب العارفین صفحہ ۲۶۶)۔ ابن سینا اور سہروردیہ سلسلے کے شیخ الاشراق (شیخ الاشراق سہرورد تھے اس لیے سہروردی کہلائے مگر سہروردی سلسلہ طریقت سے اُن کا کوئی تعلق نہ تھا۔ مترجم) سے لے کر ابن عربیؒ تک تمام صوفیوں نے روحانی مکاشفوں کو، جن کے ذریعے راہ حق کے متلاشی کی روح خدا کے ساتھ بالمشافہ ملاقات کرتی ہے، معراج کی اصطلاح میں بیان کیا ہے۔ ان لوگوں کو یہ بات اچھی طرح یاد تھی یا کم سے کم ان کے لاشعور میں موجود تھی کہ معراج ابتدائی مشاہدے کی ایک کیفیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترکی میں بیک تشی سلسلے کے پیروکار ابھی تک معراج کی اصطلاح کو اس دن کے نام سے موسوم کرتے ہیں جب ایک نئے رکن کو اس سلسلے میں داخل کیا جاتا ہے۔ اس شخص کو Miraein Kutlu olsun ''خدا تمہاری معراج کو برکت دے'' کے الفاظ سے مبارک باد دی جاتی ہے۔

اعلیٰ پائے کی صوفیانہ شاعری میں بعض اوقات براق کو عشق و محبت کے متبادل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ ربانی محبت، جیسا کہ رومیؔ نے بار بار دہرایا ہے، انسان کو آنکھ جھپکتے ہی خدا کے حضور لے جاتی ہے جب کہ عقل ایک لنگڑے گدھے کی طرح غبار میں کھو جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ فارسی لفظ نردبان (سیڑھی) جسے سنائیؔ اور بعد میں رومیؔ نے اپنے صوفیانہ کلام میں بکثرت استعمال کیا ہے، حضورؐ کے آسمانی سفر کی تلمیح ہو کیوں کہ اس لفظ سے عام طور پر ''محبوب کی چھت'' تک کے سفر سے مراد لی جاتی ہے۔ اور مولانا رومیؔ نے سماع کو ایک سیڑھی قرار دیا ہے جو صوفی کو ساتویں کرے سے بھی اوپر لے جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سماع میں صوفی خدا سے یک جائی کا مشاہدہ کرتا ہے جسے ''خدا کے ساتھ وقت'' بھی کہا جاتا ہے۔ (Schimmel: The Triumphal Sun, pp. 289-90)۔

معراج کا صوفیانہ اور شاعرانہ ترجمہ اور تشریح کرتے وقت اس بات کو پوری طرح ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سفر معراج کی کہانی کا دوسری تہذیبوں پر بھی گہرا اثر پڑا ہے۔ پیرس میں Uyghur معراج نامے کے مسودے میں چھوٹی تصویروں کی نقاشی دیکھیں، جن میں حضورؐ کے سفر معراج بلکہ دوزخ کی بعض تصویریں شامل ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان میں دانتے کی Divine Comedy کا رنگ موجود ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کئی عشرے پہلے

Mignel Asin Palacios نے یہ دریافت کیا تھا کہ دانتے کے مکاشفوں پر معراج کے قصوں کا اسلامی اثر موجود ہے۔ (Asin Palacios: Islam and the Divine Comedy)۔ دانتے کی ڈیوائن کامیڈی پہلی مرتبہ منظر عام پر آئی تو اس سے یورپ میں سنسنی پھیل گئی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد Enrico Cerulli نے یہ ثابت کر دیا کہ قرون وسطیٰ کے دوران بحیرہ روم کی دنیا کتاب المعراج اور دوسری عربی کتابوں سے ناآشنا نہیں تھی۔ اصل میں دانتے نے ڈیوائن کامیڈی میں دوسری دنیا کے متعلق کئی ایسی تفصیلات بیان کی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ اسلامی خیالات اس پر کس قدر اثر انداز ہوئے تھے۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ دانتے نے حقیقی معراج کے ہیرو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دوزخ کے سب سے نچلے درجے میں ظاہر کیا ہے!

اسلام کے ادبی علوم کی تاریخ میں جنت اور دوزخ کے سفر کا نظریہ تصوف کی روایت سے باہر بھی استعمال کیا گیا ہے، مثال کے طور پر ابوالعلا معری (وفات ۱۰۵۷عیسوی) کی کتاب رسالہ الغفران جیسی طنزیہ کتابوں میں دوسری دنیاوی بادشاہتوں میں سفر کو ظریفانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ (Nicholson: The Risalat -al- Ghufran By Abul-Ala-Al-Maari)۔ اس کتاب میں مصنف نے نئے علوم، خاص طور پر علم اللسان اور دوسرے علمی موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ پوری کتاب ان گنت اختراعوں، ذو معنی الفاظ، موزوں نظیروں اور کینہ وعداوت پر مبنی دل چسپ اقوال وآرا سے بھری پڑی ہے۔ گیارہویں صدی میں لکھی جانے والی یہ کتاب حد درجہ پیچیدہ لیکن بے حد لطف اندوز شہکار ہے۔ ۱۹۳۱ء میں جمیل صدقی الزہوی نے عربی میں اس کتاب کی تضمین شائع کی لیکن ان کی نظم ''دوزخ میں بغاوت'' معرّی کی کتاب کی بے کیف صدائے بازگشت ہے۔ الزہوی نے معرّی کا خاکہ اڑاتے ہوئے آخر میں اس پورے مشاہدے کو بدہضمی کے باعث برا خواب قرار دے دیا ہے۔ اس کے ایک سال بعد محمد اقبالؒ نے لاہور سے جاوید نامہ شائع کیا جس میں آسمانوں کے سفر کے نظریے کی جدید فلسفیانہ نقطہ نظر سے تشریح کی گئی ہے۔ وہ مولانا رومیؒ کی قیادت میں، جنھیں وہ ڈیوائن کامیڈی میں ورجل (Virgil) کی طرح کلاسیکل معراج میں جبریلؑ کا رول سونپتے ہیں، مختلف اجرام فلکی میں رہنے والی نمایاں شخصیات کے ساتھ سیاسی، سماجی اور مذہبی مسئلوں پر تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ آخر میں وہ تنہا جمال حق کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ (Schimmel: Gabriels Wing, pp. 301-6)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان، جو دور حاضر کی جدید فنی کامیابیوں سے آگاہ ہو، حضورؐ کے سفر معراج کا مختلف زاویے سے جائزہ لیتا ہے۔ میں نے ۱۹۷۸ء میں پشاور یونیورسٹی میں ایک نامور عالم دین کو یہ نتیجہ اخذ کرتے سنا کہ انسان کے چاند پر اترنے کا واقعہ نبی کریمؐ کے آسمانی سفر کی حقیقت کا ٹھوس ثبوت ہے۔

ممکن ہے کہ انہوں نے یہ خیال محمد اقبالؒ کے اس شعر سے مستعار لیا ہو:

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

نعتیہ کلام

فارسی کے پہلے عظیم شاعر حکیم سنائی (غزنوی۔ مترجم) (وفات ۱۱۳۱ عیسوی) نے یہ وضاحت کی ہے کہ تمام اسلامی تہذیبوں میں رسول کریمؐ کی مدح میں کہی جانے والی نعتیہ شاعری کی کن وجوہ کی بنا پر بے حد پذیرائی ہوئی ہے:

ترجمہ: آپؐ کے نام گرامی کے سوا کوئی اور لفظ کہنا
سہو وخطا اور غلطی ہے
آپؐ کے سوا کسی اور کی مدح کرنا
شرمندگی ہے! شرمندگی ہے!

انیسویں صدی میں اردو کا ایک شاعر (غلام امام شہید ـــــ مترجم) کہتا ہے:

درپیش ہے عدم کا سفر سب کو دوستو
جو نعت کا کلام ہے توشہ ہے راہ کا

ان اشعار سے جو تاثر ابھرتا ہے، وہ نبی کریمؐ کی تعریف میں رطب اللساں بیشتر شاعروں اور مصنفوں کے اظہار عقیدت کی عکاسی کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ان سب لوگوں کو یقین ہے کہ حضورؐ کی عظمت کے ساتھ انصاف کرنا ممکن نہیں، نہ ہی آپؐ کے حسن و جمال اور شفقت و رافت کو موزوں الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود:

آدمی کیا مدح کر سکتے نہیں جن و ملک
حق تعالیٰ آپ کرتا ہے ثنائے مصطفےٰؐ

یہ سوال کسی مسلمان نے نہیں، ایک ہندو شاعر شیو پرشاد وہبی لکھنوی نے اٹھایا ہے، جس کا دعویٰ ہے کہ:

''حق تعالیٰ خود ثنا خوانِ مصطفیٰؐ ہے'' یہ ٹھیک وہی نکتہ ہے جس کی وجہ سے شاعروں اور نعتیہ شاعری کے مجموعے اکٹھا کرنے والوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کی ایک مثال بیروت کے پارسا قانون دان یوسف النبھانیؒ کی ہے جنہوں نے اپنی ساری زندگی رسول کریمؐ کی مدح میں لکھی جانے والی نعتوں کو جمع کرنے میں صرف کر دی تھی۔ انہوں نے حضورؐ کی شان میں عربی میں لکھے جانے والے پورے نعتیہ کلام کو چار جلدوں میں شائع کیا ہے اور خود بھی آں حضرتؐ کی مدح میں ہزاروں اشعار کہے ہیں۔ یوسف النبھانیؒ نے ضخیم منتخب کلام کا آغاز ایک باب سے کیا ہے جس میں اس روایتی یقین کا اعادہ کیا گیا ہے کہ ''شاعر لوگ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے شایانِ شان آپؐ کی مدح سرائی نہیں کرتے'' کیوں کہ حضورؐ کی عظمت کی مدح وثنا کرنا ہرگز ممکن نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی ایک نظم میں بھی اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا ہے:

ترجمہ: خدا کے رسولؐ کی مدح وستائش جو تخلیق کی گئی ہر چیز کے پیغمبر ہیں

انسانوں میں سب سے زیادہ قابلِ پرستش ہیں

میں نے ان سے کہا: ''میں آپؐ کی تعریف میں کیا کہوں

کیوں کہ خالق نے خود آپؐ کی تعریف کی ہے اور کہنے کے لیے کوئی چیز باقی نہیں چھوڑی؟''

دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حقیقت میں قرآن کریم میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نہایت قابلِ ستائش الفاظ میں تذکرہ کیا گیا ہے اور خدا خود حضورؐ پر درود وسلام بھیجتا ہے لہٰذا آپؐ جس تعریف کے مستحق ہیں، اس طرح آپؐ کی مدح وستائش کرنا انسان کے بس میں نہیں۔ اسپین کا مصنف لسان الدین الخطیب یہ سوال کرتا ہے:

ترجمہ: قرآن کریم کی آیات میں آپؐ کی حمد وثنا کی گئی ہے ـــ اس لیے

میں اپنی نعت میں آپؐ کی عظمت کی کس طرح تعریف کر سکتا ہوں؟

اسی طرح بصیریؒ نے اپنی ہمزہ میں رعایت لفظی سے کام لیتے ہوئے کہا ہے: کیا یہ حضورؐ کا معجزہ نہیں کہ زبانیں آپؐ کی تعریف کرنے سے عاجز ہیں؟ کیا آپؐ کی مدح وستائش اس بحرِ بے کراں کی مانند نہیں جس کا احاطہ کرنا غواصوں کے بس سے باہر ہے؟

اگرچہ علمائے دین اور شاعر حضرات اس دہری مشکل سے پوری طرح آگاہ تھے، اس کے باوجود انہوں نے بار بار حضورؐ کی تعریف وتوصیف کی ہے اور محبت بھرے، رنگین اور سحر انگیز انداز میں آپؐ کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے کیوں کہ ''دل آپؐ کے اسمِ گرامی اور اعلیٰ محاسن کا ذکر کرنے کا آرزومند ہے'' تا کہ آپؐ کے ساتھ روحانی نسبت قائم

ہو سکے۔''اس کی وجہ یہ ہے کہ عاشق کی فطرت یہ ہے کہ وہ اپنے محبوب کا مسلسل تذکرہ کرتا رہے۔'' یہ سندھی زبان میں نعتوں کے مجموعے کے جامع ایڈیٹر کے الفاظ ہیں جس نے ایک اور جگہ یہ لکھا ہے:

انسان کے روحانی انقلاب کی تاریخ میں رسول کریمؐ کے منفرد رول کا عموماً اعتراف کیا گیا ہے۔ آپؐ نے وحدانیت کے انقلابی نظریے کے ذریعے انسانیت کے اتحاد اور انسان کے فکری ارتقا کے لیے سنگِ بنیاد رکھا ہے۔ آں حضرتؐ نے ''ظاہری شکل وصورت'' کے بجائے ''روح'' کو تروتازگی بخشی ہے۔ آپؐ نے انسانی فکر کو آزاد کیا ہے جس کا پوری دنیا نے پرتپاک خیر مقدم کیا ہے۔ آپؐ نے فرضی قیاس آرائیوں اور غیر حقیقی نظریات کے بجائے عمل اور مشاہدے کی راہوں کو روشن وتاباں بنایا ہے اور سماعت اور بصارت کی قوتوں کو علم اور عقل کے لیے استعمال کرنے کی ترغیب دی ہے اور انہیں عام کیا ہے۔ حضورؐ نے سورج اور چاند بنانے کی انسانی صلاحیت کو جلا ہی نہیں بخشی، زمین وآسماں کو اپنا تابع بنانے کا سبق بھی سکھایا ہے۔ آپؐ نے بنی نوع انسان کو تخلیق اور نفسیاتی حقائق پر غور وخوض کے بعد حقیقت ازلی کا ادراک کرنے اور اسے گرفت میں لانے کا شعور پیدا کرنے کی ہدایت کی۔ نوع انسانی کے اس جلیل القدر رہنما اور محسن، آپؐ کے صحابہ کرامؓ اور چاہنے والوں کی تعریف وتوصیف کرنا فطرت سلیم رکھنے والے ہر شخص پر واجب ہے۔

تقریباً اسی زمانے میں جب حیدرآباد/سندھ کے اس پاکستانی اسکالر نے سندھی زبان میں نعتیہ کلام مرتب کیا، بھارت میں عثمانیہ یونیورسٹی/حیدرآباد دکن کے فارسی ادب کے ایک پروفیسر نے مسلمانوں کی زندگی میں نعتیہ شاعری کے مرکزی کردار کے موضوع پر ایک طویل آرٹیکل لکھا۔ ان کے مطابق نبی کریمؐ کی مدح وستائش آں حضرتؐ سے صرف عقیدت کا اظہار کرنا ہی نہیں بلکہ اس عمل میں ''کردار سازی کی قوت'' موجود ہے جس سے ''کامل انسان بننے کی آرزو پروان چڑھتی ہے۔''(Rasheed: The Development of Natia Poetry, p.56)۔

نعتیہ شاعری میں رسول کریمؐ کا جو کردار متعین کیا گیا ہے، وہ دنیا کے سامنے خدا کے حضور سرِ تسلیم خم کرنے اور اس کی رضا ومنشا سے ہم آہنگ ہونے کی ایک آئیڈیل مثال پیش کرتا ہے۔

نعتیہ شاعری کا بیشتر حصہ ان اخلاقی اور روحانی اقدار کے بارے میں ہے جن کا فرد کی تربیت اور انسان کی اجتماعی زندگی کے ساتھ براہ راست تعلق ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے باعث جو افراتفری اور بے چینی پیدا ہوئی ہے، اس کا فطری نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ایک نئے عالمی نظام کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی ہے جس کا اظہار بقائے باہمی کے لیے بڑے پیمانے پر کی جانے والی کوششوں سے ہوتا ہے۔ نعت لٹریچر کی وہ صنف ہے جو نسلی، جغرافیائی اور طبقاتی حد بندیوں کو توڑنے کے لیے کردار سازی کے ضمن میں اہم رول ادا کرتی ہے۔(Resheed: The Development of Natia Poetry, p.58)۔

ان اسکالروں نے جدید اصطلاح میں جن محسوسات کا اظہار کیا ہے، قرون وسطیٰ کی اسلامی دنیا کے ہر حصے کے مسلمان ان سے بخوبی آگاہ تھے اور نعت خواں حضرات نے، جنہیں مداحون الرسولؐ کہا جاتا ہے، صدیوں سے دنیائے عرب میں باضابطہ انجمنیں تشکیل دے رکھی تھیں اور انہیں ہر اہم تقریب میں مدعو کیا جاتا تھا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متعلق افسانوی داستانیں اور صوفیوں کی مدح سرائی اب خاتم النبیینؐ اور محبوب خداؐ کی شان میں لکھی جانے والی نعتیہ شاعری کا اہم حصہ بن گئی ہیں۔

عرب روایت

رسول کریمؐ کی تحسین وستائش کے لیے ابتدائی نظمیں آپؐ کی حیات طیبہ کے دوران لکھی گئیں۔ مدینہ منورہ میں حسانؓ بن ثابت آپؐ کے شاعر کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ ان کا فریضہ ایک طرح سے ایک صحافی کی مانند تھا اور وہ ظہور اسلام کے ابتدائی دور میں رونما ہونے والے اہم واقعات کو شعروں کے قالب میں ڈھالتے تھے۔ وہ حضورؐ کے دشمنوں کے حملوں کا جواب دیتے اور مسلمانوں کے جرأت مندانہ کارناموں کی تحسین کرتے چناں چہ ان کی نظمیں اسلام کی ابتدائی تاریخ کا اہم ماخذ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان نظموں میں کئی ایسی مبادیات اور بنیادی قواعد بھی موجود ہیں جن کی بعد میں شرح کی گئی ہے، مثال کے طور پر ان کا یہ بیان سند کا درجہ رکھتا ہے:

ترجمہ: میں خدا کی اجازت سے گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ

خدا کے وہ پیغمبر ہیں جن کا رتبہ آسمان سے بھی بلند ہے

حسانؓ کی شاعری میں گو کہ اب بھی شراب اور عشق ومحبت کے اشارے کنائے موجود ہیں کیوں کہ اسلام سے پہلے کی شاعری میں یہ ایک عام بات تھی، اس کے باوجود انہوں نے رسول کریمؐ کی مدح میں جو شعر کہے، ان سے ان کے روحانی محاسن اور مذہبی جوش وخروش کی عکاسی ہوتی ہے۔ خدا نے انہیں جن خوبیوں سے نوازا تھا، وہ اسلام کی حقیقی روح کو اجاگر کرنے میں صرف ہوئیں۔ (Kister: A New Edition of the Diwan of Hassan -IbnThabit,p.285)

حسانؓ کہتے ہیں:

ترجمہ: ہم جانتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں

اور خدا کی کتاب بہترین رہبر ورہنما ہے

اس سے پہلے ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ حسانؓ نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے روشن وتاباں نور، آپؐ کی ولادت کے موقعے پر معجزوں اور آپؐ کی شفاعت کی امید کا بار بار تذکرہ کیا ہے چناں چہ اس میں حیرت کی کوئی

بات نہیں کہ بعد کے زمانے میں رسول کریمؐ کی شان میں نعت اور قصیدہ لکھنے والے ہر بڑے شاعر کو اس کے ملک کا حسان کہا جاتا ہے۔ فارسی کا ایک شاعر نہایت عجز و انکسار کے ساتھ کہتا ہے:

ترجمہ: اس انتشار اور افراتفری میں مَیں

حضورؐ کی تعریف و توصیف میں حسانؓ کا کردار کیسے ادا کر سکتا ہوں؟

حضرت حسانؓ کے علاوہ کئی دوسرے شاعر بھی آں حضرتؐ کے ہمراہ تھے اور ان کا کلام بھی اسلام کے ابتدائی دور کی تاریخ کا ذریعہ ہے۔ ان میں حضرت کعبؓ ابن مالک اور عبداللہؓ ابن رواحہ شامل ہیں۔ Schimmed: As Through a Veil, pp.14,216 Grunebaum: The Early Development of Islamic Religious Poetry, p.24) لیکن بعد میں عربی کے سوا دوسری زبانوں میں ان دونوں شاعروں کے نام شاذ ہی ملتے ہیں البتہ غیر عربی زبانوں میں بھی ایک قصیدے کا ذکر بار بار کیا جاتا ہے اور یہ ہے حضرت کعبؓ کا وہ قصیدہ جو ابتدائی عربی شاعری کا شہکار ہے۔ (حضرت کعبؓ اسلام لانے سے پہلے نبی کریمؐ کو بہت ایذا دیا کرتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد وہ مکہ سے بھاگ کر طائف چلے گئے۔ وہاں سے قصیدہ بانت سعاد لکھ کر حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے گزشتہ گناہوں کی معافی مانگی۔ حضورؐ نے ان کو معاف کر دیا اور قصیدے کے صلے میں اپنی چادر مبارک عطا فرمائی۔ اس قصیدے میں کعبؓ نے حضورؐ کو "سیف من سیوف الہند" (ہندوستان کی تلواروں میں سے ایک تلوار) کے الفاظ سے مخاطب کیا مگر آں حضرتؐ نے کعبؓ کے مصرعے میں اصلاح دے کر فرمایا: "سیف من سیوف اللہ" کہنا چاہیے یعنی اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار — مترجم)۔

حضرت کعبؓ زمانہ جاہلیت میں رسول کریمؐ کے بارے میں بدگوئی کیا کرتے تھے، پھر حضورؐ کی شان میں ایک طویل قصیدہ لکھا اور حضورؐ کی موجودگی میں یہ قصیدہ سنایا جس کا آغاز "بانت سعاد" (میری سعاد مجھ سے جدا ہو گئی ہے) سے ہوتا ہے...... شاعر نے اسلام سے پہلے کے روایتی اسلوب کے مطابق محبوب سے جدائی کا ذکر کرتے ہوئے اس کی تلاش میں صحرا میں ایک تکلیف دہ سفر کا حوالہ دیا ہے۔ (اس سفر میں وہ اپنی اونٹنی کی ان لفظوں میں تعریف کرتا ہے، اور اب سعاد تک بجز اس مضبوط بڑی اونٹنی کے اور کوئی نہیں پہنچا سکتا جو تھکن سے چور چور ہونے کے باوجود تیز روی نہ چھوڑے اور اس کی چال میں کوئی فرق نہ آئے)۔ شاعر صحرا کی تپتی ہوئی دوپہر کے بعد اچانک اس غریب بیوہ کا ذکر کرتا ہے جو اس لیے نوحہ کر رہی ہے کہ اسے ابھی ابھی اپنے بیٹے (کعبؓ) کے مرنے کی خبر ملی ہے۔ اس کی اونٹنی کی حالت اس طرح ہے:

ترجمہ: اس اونٹنی کے اگلے دونوں ہاتھوں کا تیز چلنے کے لیے جلد جلد اور بار بار پلٹنا

گویا اس دراز قامت اور ادھیڑ عمر عورت کے دونوں ہاتھوں کے بار بار مارنے کے مانند ہے

جو کھڑی ہو کر ہاتھوں سے سینہ پیٹ پیٹ کر گریہ وزاری کر رہی ہو

اور (اس کا جوش بڑھانے کے لیے) وہ عورتیں نوحہ کر رہی ہوں جو فاقد الولد ہوں اور ان کا بچہ زندہ نہ رہتا ہو

وہ عورت اپنے دونوں ہاتھوں سے سینہ کوٹ رہی ہو اور گریبان اس کے سینے تک چاک ہو گیا ہو

اور فتنہ پرور لوگ اس کے چاروں طرف چغل خوری کر رہے ہوں کہ اے ابن ابوسلمیٰ تو تو قتل کیا جانے والا ہے

اور ہر دوست نے، جس سے کچھ امید رکھتا تھا، یہی بات کہی کہ میں تمہیں غافل رکھ کر کسی طرح مغالطہ دینا نہیں

چاہتا، میں تم سے بالکل الگ ہوں (اس لیے مجھ سے کسی قسم کی مدد کی امید نہ رکھو)

میں نے کہا: تمہارا باپ نہ رہے! میرا راستہ چھوڑ دو، پھر خدا مہربان کی طرف سے جو مقدر ہوگا، وہ ہو جائے گا

ہر ماں کا بیٹا (ہر انسان) خواہ اس کی زندگی طویل ہو یا قلیل، ایک نہ ایک دن اس پلنگ پر ضرور اٹھایا جائے گا

جس پر میت لے جاتے ہیں

مجھے یہ خبر دی گئی کہ رسول اللہؐ نے مجھے قتل کرنے کا حکم دیا ہے مگر مجھے آپؐ سے عفو و درگزر کی امید لگی ہوئی ہے

اس کے بعد شاعر آں حضرتؐ سے مخاطب ہوتا ہے، اپنے گناہوں پر معذرت کرتا اور آپؐ سے معافی مانگتا ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) اس قصیدے کو سن کر اس قدر متاثر ہوئے کہ آپؐ نے اپنی چادر مبارک (بردہ) حضرت کعبؓ کے کندھے پر ڈال دی اور ان کے گناہوں کو معاف کر دیا۔

اگر چہ بعض نقاد اس واقعے کی تاریخی حیثیت کے بارے میں شک و شبہے کا اظہار کرتے ہیں، لیکن کعبؓ کے بردہ شریف کو عربی شاعری میں جلد ہی خصوصی اہمیت حاصل ہو گئی اور اسے نہ صرف حضورؐ کی شان میں رطب اللسان بعد کے تمام شاعروں کے نزدیک ایک ماڈل کا درجہ مل گیا بلکہ خود اسے بھی ایک مقدس قصیدے کی شہرت مل گئی، اس قصیدے پر آج تک تبصرے ہوتے ہیں، اس میں توسیع کی جاتی اور اس کا تتبع کیا جاتا ہے۔ وادی سندھ کے دور دراز کے علاقوں میں مقبول عوامی شاعر بانت سعاد کے الفاظ سے اپنے لقب (بھان) اخذ کرتے ہیں۔ نبی کریمؐ کا چوڑی دھاری والا بردہ یمانی، جو یمنی کپڑے سے تیار ہوا تھا، فارسی کا شعری محاورہ، خاص طور پر جامیؔ کے کلام میں حضورؐ کے آفتاب جیسے چہرہ انور کے اس نقاب کی علامت بن گیا ہے جسے اٹھانے کے لیے آپؐ سے درخواست کی جاتی ہے تاکہ عقیدت مند مسلمان آپؐ کا رخ انور دیکھ سکیں۔

رسالت مآب کی رحلت کے بعد آپؐ کے لیے کئی مختصر مرثیے کہے گئے جن میں سے بعض مرثیے خلفائے راشدینؓ نے کہے تھے۔ لیکن ابتدائی صدیوں میں رسول کریمؐ کے اعلیٰ محاسن اور اوصاف کو شاعری کے بجائے نثر

میں لکھا گیا۔ ہم پہلے یہ بیان کر چکے ہیں کہ پرشکوہ الفاظ کی حامل یہ مترنم نثر، جس میں عربی زبان تمام تر حسن اور توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہے اور جس کی رعنائی کے باعث اس کا ٹھیک ٹھیک ترجمہ کرنا ایک مشکل کام ہے، شمائل اور دلائل النبوت سے متعلق کئی کتابوں پر مشتمل ہے جن میں رسول اللہ کی بے مثل خصوصیات اور آپؐ سے منسوب محاسن کا نہایت تفصیل کے ساتھ احاطہ کیا گیا ہے۔ پہلی ہزاری (دسویں صدی) کے آخر میں ثعلبیؒ نے آں حضرتؐ کے طویل مترنم القابات کو بڑی عرق ریزی سے اکٹھا کیا جنہیں آپؐ کے ذکر کے سلسلے میں استعمال کیا جا سکتا ہے، مثال کے طور پر علمی تصانیف اور خالص ادبی کتابوں کے تعارفی جملوں میں! ثعلبیؒ کے مجموعے میں اس قسم کے بیان موجود ہیں:

آپؐ اپنی قوم کو تاریکی سے روشنی کی طرف لائے، اسے اس وقت سایہ مہیا کیا جب سورج آگ برسا رہا تھا۔ محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) خدا کے پیغمبر اور محبوب ترین دوست، خدا کی مخلوق میں سب سے پسندیدہ اور اولیں انتخاب ہیں، خدا کی سب سے بہترین مخلوق اور خدا کی زمین پر خدا کا ثبوت ہیں، آپؐ خدا کی صداقت کی طرف رہنمائی کرنے والے، انسانوں کو خدا کی حکمت و دانائی کی جانب بلانے والے ہیں جن کی ولادت بنی نوع انسان کے لیے باعث رحمت اور جن کی اس دنیا میں تشریف آوری اقبال مندی کی علامت ہے، آپؐ کا نور طلوع سحر کے لیے روشن و تاباں اور شب کو چراغ کی طرح دمکتا ہے، حضورؐ اس دنیا میں جنگوں میں فتح یاب ہوئے اور آپؐ کا وعظ و نصیحت خدا کی حمد و ثنا سے معمور ہے......

جہاں تک ہمیں معلوم ہے، رسول کریمؐ کی مدح و ستائش میں نعتیہ شاعری کی صنف کا آغاز گیارھویں صدی کے شروع میں ہوا اور ثعلبیؒ کے اسلوب پر ایک نیا طرز بیان بھی شاعری میں در آیا۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے ساتھ اظہار عقیدت کو ادبی صنف میں ڈھالنے کا زیادہ تر کام حضرات صوفیہ نے انجام دیا ہے۔ وہ نظم، جسے آج تک بے مثل اور جامع تصور کیا جاتا ہے اور جس میں آں حضرتؐ کی حد درجہ تعریف و توصیف کی گئی ہے، اسے لکھنے کا اعزاز بھی تصوف کے ایک سلسلے کے رکن کو حاصل ہے۔ اس نظم کے مصنف محمد البصیریؒ (وفات ۱۲۹۸ء) کا تعلق ابوصر مصر سے تھا اور وہ شاذلیہ سلسلے کے ابوالعباس المرسی کے مرید تھے۔ انہوں نے اس نظم کے علاوہ حضورؐ کی مدح میں کئی اور فصیح و بلیغ نعتیہ اشعار بھی لکھے ہیں۔ (Nicholson: Literary History of the Arabs)۔ اس سلسلے میں غالباً ان کی سب سے معرکتہ الآرا نعت ہمزیہ ہے جس میں رسول کریمؐ کے مشہور معجزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ لیکن بصیریؒ کے نام کو ہمزیہ نے لافانی نہیں بنایا بلکہ انہیں اس قصیدے نے امر کیا جو البردہ (ترکی میں اسے عموماً البرہ کہا جاتا ہے) کے نام سے مشہور ہے۔ روایت ہے کہ بصیریؒ پر فالج کا حملہ ہوا تھا، اس پریشانی میں انہوں نے حضورؐ سے رجوع کیا اور آپؐ کی شان میں ایک نظم لکھی۔ مسلمانوں کو رسول کریمؐ کی شفایاب

کرنے کی قوت پر پورا یقین تھا اور ہے چناں چہ بصیریؒ کو خواب میں آں حضرت کی زیارت ہوئی اور جس طرح آپؐ نے حیاتِ مقدسہ کے دوران قصیدہ بانت سعاد سننے کے بعد حضرت کعبؓ کے کندھوں پر اپنی چادر مبارک ڈال دی تھی، اسی طرح آپؐ نے بصیریؒ کو بھی اپنی چادر عطا فرمائی۔ حضورؐ نے جس طرح کعبؓ کی تمام لغزشوں کو معاف کر دیا تھا، اسی طرح بصیریؒ بھی آپؐ کی چادر کے چھونے سے تندرست ہو گئے اور اگلی صبح چلنے پھرنے لگے۔

دوسرے بردہ کا اصل عنوان الکواکب الدریہ فی مدح خیر البریہ (بنی نوع انسان میں افضل ترین بشر کی مدح میں درخشاں سیارے) ہے۔ اس قصیدے کے فیوض و برکات سے کئی روایتی کہانیاں منسوب ہیں۔ اس کی برکت اور شفایابی کی قوت کے بارے میں تعریفوں کا سلسلہ جلد ہی شروع ہو گیا اور نہ صرف بردہ شریف کے مصنف بلکہ اسے پڑھنے یا نقل کرنے والوں کے لیے بھی بشارتوں کی تشہیر ہونے لگی۔ کہا جاتا ہے کہ جس شخص کی آنکھوں میں درد یا سوزش اور جلن ہو، بردہ شریف پڑھنے سے اسے اس مرض سے نجات مل جاتی ہے۔ اس کے مخصوص اشعار پڑھنے سے غربت یا وبائی امراض سے چھٹکارا مل جاتا ہے یا وہ دشمنوں اور حاسدوں سے محفوظ رہتا ہے۔ اگر بردہ شریف کی ۲۳ ویں اور ۲۴ ویں سطریں طلوع سحر کے وقت پڑھی جائیں تو اس سے شکستہ دلوں کو چین نصیب ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بردہ شریف کا تعویذ بنایا جاتا ہے یا اسے مذہبی اور نجی عمارتوں کی دیواروں پر لکھا جاتا ہے۔ اس قصیدے کے قیمتی نسخے نامور حکمرانوں اور علمائے دین کو پیش کیے گئے۔ ان میں مصر کے حکمران شامل ہیں جہاں یہ قصیدہ لکھا گیا تھا۔ عرب ملکوں اور بعد میں ہندوستان میں بھی بردہ شریف میں اضافے کیے گئے اور کئی شاعروں نے اصل شعروں کے درمیان اپنے اشعار شامل کر کے اس کے ترنم اور آہنگ کو بڑھا دیا۔ اس عمل کو تشتیر (ٹکڑے ٹکڑے کرنا) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس تبدیلی کا مقبول طریقہ یہ ہے کہ قصیدے کے ہر شعر کے دو مصرعوں کے بعد تین مصرعوں کا اضافہ کر دیا جاتا ہے جس سے وہ تخمیس (جو پانچ مصرعوں پر مبنی ہو) بن جاتی ہے۔ دوسری مشہور مذہبی نظموں میں بھی یہی طریق کار اختیار کیا جاتا ہے۔ صرف مصر میں ہی بردہ کی ۸۰ تخمیسیں موجود ہیں۔ جنوبی ہندوستان کے عربی لکھنے والے شاعروں نے بھی اس مبارک نظم کو نئے انداز میں پیش کرنے کی غرض سے ان شاعروں سے مسابقت کی ہے جن کی مادری زبان عربی ہے۔ بصیریؒ کے فوراً بعد دوسری اسلامی زبانوں میں اس قصیدے کا ترجمہ ہو گیا۔ (Kokan: Arabic and Persian in Carnatic pp. 64-65) ۔ فارسی میں جامی نے، جو خود نعتیہ شاعری کے لیے مشہور ہیں، پندرھویں صدی کے آخر میں کمال مہارت کے ساتھ بردہ شریف کا شعروں میں ترجمہ کیا۔ اس کے بعد ترک زبان اور اردو میں اس کے ترجمے ہوئے۔ برصغیر ہندوستان میں پنجابی (محمد دین نقشبندی: قصیدہ بردہ مع شرح پنجابی) اور پشتو میں بھی اس کے ترجمے ہوئے ہیں۔ مشرقی افریقا میں سواحلی زبان بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں رہی اور اس میں بھی قصیدے کا ترجمہ ہوا ہے۔ (Knappert:

Swahili Islamic Poetry) ـ ملایا کی زبان میں سولھویں صدی میں اس قصیدے کا ترجمہ ہوا تھا۔ حال ہی میں شبھا بربر میں اس کا ترجمہ ہوا ہے۔ سواحلی زبان کے مترجم نے قصیدے میں ایک مختصر دعائیہ نظم کا اضافہ کیا ہے جس سے بردہ کی برکت اور اس کی طلسماتی طاقت پر یقین کا اظہار ہوتا ہے:

ترجمہ: خدایا! میری بیوی کی مدد کر!

اسے زندگی کی آفات سے محفوظ رکھ!

اور کل جب دوسری زندگی میں قیامت کا دن ہو تو

وہ کسی حساب کتاب یا سزا کے بغیر جنت میں داخل ہو!

غیر عرب ملکوں کے لوگ بردہ شریف لکھ کر قصیدے کی اصل عبارت ایک دو ترجموں کے ساتھ چھاپتے رہے تاکہ وہ اصل متن کے برکات سے پوری طرح مستفیض ہوں اور اس کے ساتھ ہی غیر ملکی قاری اپنی ہی زبان میں اس مترنم لیکن پیچیدہ عبارت سے بہرہ مند ہو سکے۔ لاہور، دہلی اور دوسرے مقامات پر بردہ شریف کے اصل متن کے ساتھ ترجمے پر مبنی ایڈیشن کتابوں کی دکانوں پر دست یاب ہیں۔ اصل متن کے ساتھ فارسی اور اردو میں ہاتھ سے لکھا ہوا نہایت دیدہ زیب ایڈیشن حال ہی میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوا ہے۔ دکن میں بردہ شریف کے بعض حصے قرآن کریم اور نعتیہ کلام کے ساتھ مخصوص محفلوں میں پڑھے جاتے ہیں۔ (ایس ایس خسرو حسینی نے بردہ شریف پڑھنے کی غرض سے حیدرآباد دکن میں اپنے مکان پر نہایت مہربانی سے میرے لیے ایسی ہی ایک محفل منعقد کرنے کا اہتمام کیا تھا)۔ اور حضرات صوفیہ نے اسے مناسب طریقے سے پڑھنے کے لیے خاص اصول وضع کر رکھے ہیں۔ (ایس بی بخاری: جواہرالاولیا صفحات ۴۴۴، ۴۴۵)۔ قصیدے میں جہاں حضورؐ کا اسم گرامی آئے، تسلیہ پڑھا جاتا ہے۔ ایسے موقعے پر ۱۴۱، ۱۴۴ اور اگر ممکن ہو تو ۱۰۰۱ مرتبہ درود شریف پڑھا جاتا ہے۔

لیکن یہ صرف مسلمان ہی نہیں جنھوں نے بار بار بردہ شریف سے رجوع کیا ہے بلکہ یورپی اسکالرز بھی مشرقی علوم سیکھنے کے ابتدائی مرحلے میں ہی اس قصیدے میں دل چسپی لینے لگے تھے۔ یہ قصیدہ پہلے پہل ۱۷۶۱ عیسوی میں لیڈن نیدرلینڈز میں شائع ہوا تھا چناں چہ مغرب میں شائع ہونے والی عربی کی یہ پہلی ادبی کتاب ہے۔ ۱۸۲۴ء میں Rosenzweig Schwannan نے بردہ شریف کا منظوم ترجمہ کیا جس کے بعد ایک نوجوان جرمن مستشرق C.A. Ralfs نے ترک اور فارسی منظوم ترجموں کے ساتھ اس کی تدوین کی اور نہایت عمدہ لیکن ثقیل جرمن نثر میں اس کا ترجمہ کیا۔ بدقسمتی سے یہ جرمن اسکالر تپ دق کے مرض کی وجہ سے جوانی ہی میں انتقال کر گیا اور اس کی کتاب کو دوسرے لوگوں نے شائع کیا۔ فرانس کے عظیم مستشرق Sylvestestre de Sacy نے ۱۸۲۲ عیسوی میں بصیریؒ کے قصیدے کا فرانسیسی میں ترجمہ

کیا۔ بعد میں فرانس ہی کے ایک اسکالر Rene Basset نے، جسے صوفیانہ شاعری سے کوئی شغف نہیں تھا، بردہ شریف پر مفید شرح لکھ کر اس قصیدے کے بارے میں کئی ابہام دور کر دیے۔ برطانوی دانشور جے ڈبلیو ریڈ ہاؤس نے نجی طور پر شائع کی جانے والی کتاب Arabian Poetry for English Readers, Glasgow 1881, pp.310-41 میں اس قصیدے کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ انگریزی دان طبقے کے لیے سب سے زیادہ سلیقے سے قابل اعتماد اور جدید ترجمہ آرتھر جیفرے نے کیا ہے جسے ان کی کتاب Reader on Islam میں شائع کیا گیا ہے۔

بردہ شریف قرون وسطی کے مسلمانوں کی حضورؐ سے عقیدت کا صحیح معنوں میں لب لباب ہے اور اگرچہ مغربی زبانوں میں ترجمے پڑھنے سے اس کے حد درجہ معنی خیز مترنم اشعار قدرے متین اور سنجیدہ نظر آتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے ہر شعر میں رسول کریمؐ کے بارے میں اس عقیدت اور عقیدے کا اظہار ہوتا ہے جو قرون وسطی کے عالم اسلام کا مرکز ومحور اور امتیازی وصف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قصیدہ بے حد مقبول ہوا ہے۔

شاعر نے قصیدے کا آغاز روایتی کلاسیکل اسلوب سے کیا ہے جس میں اپنے دوستوں سے جدائی کا تذکرہ کیا گیا ہے:

ترجمہ: ذوسلم میں اپنے ہمسایوں کو یاد کر کے میری آنکھیں
خون آلود آنسوؤں سے تر ہیں اور یہ آنسو دیدۂ تر کے ذریعے بہہ رہے ہیں

اس کے بعد شاعر ۳۵ ویں مصرعے میں حضور رسالت مآبؐ سے رجوع کرتا ہے جن کی ذات اقدس سے اسے روحانی امداد کی توقع ہے اور جن کی وہ اگلے ۱۵۰ مصرعوں میں مدح وستائش کرتا ہے:

ترجمہ: محمدؐ دونوں جہانوں اور جن وانس کے فرماں روا ہیں
عرب وعجم کے شہنشاہ ہیں
ہمارے پیغمبرؐ جو اچھے کام کرنے کی ہدایت اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں
اور ہاں اور ناں کہنے میں آپؐ سے سچا اور کوئی نہیں
آپؐ خدا کے محبوب ہیں جن کی شفاعت کی امید ہے
مصیبت کی ہر گھڑی اور خطرات کے وقت آپؐ ہی سے امداد کی توقع ہے
آپؐ نے (ہمیں) خدا کی طرف بلایا اور جو لوگ آپؐ کے ساتھ رشتہ جوڑے ہوئے ہیں
انہوں نے ایک ایسی رسی تھام رکھی ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتی
آپؐ ظاہری حسن اور کردار میں تمام پیغمبروں پر سبقت لے گئے

اور دوسرے پیغمبر علم اور لطف و کرم میں آپؐ کے قریب بھی نہیں آ سکتے

بصیریؒ نبی کریمؐ کو امت کا روحانی پیشوا، شافع محشرؐ معجزے دکھانے والا اور خاتم النبیین سمجھتے ہیں۔ قصیدے میں حضورؐ کی معجزانہ ولادت کا بہت مختصر ذکر کیا گیا ہے البتہ دوسرے معجزوں کو، جیسے درختوں کا سجدہ ریز ہونا، نہایت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے:

ترجمہ: آپؐ کے اشارے پر درخت سجدہ کرتے ہوئے
بغیر پاؤں کے ایک ٹانگ پر چل کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے
جیسے وہ کسی فرحت بخش تحریر کے لیے کوئی خط کھینچ رہے ہوں
ان کی شاخوں نے شاہراہ کے درمیان لکھ دیا
آپؐ جہاں تشریف لے جاتے، ابر کا ایک ٹکڑا
بھٹی کی طرح تپتی ہوئی دھوپ میں آپؐ پر سایہ فگن رہتا......

بصیریؒ نے آں حضرتؐ کے سفر معراج کے واقعے کو بڑے دل نشین پیرائے میں بیان کیا ہے:

ترجمہ: رات کو آپؐ نے ایک مسجد حرام سے دوسری مسجد حرام تک سفر کیا
جس طرح تیرہ و تار شب میں چودھویں کا چاند چمکتا ہے
آپؐ بلندی کی طرف چڑھتے گئے یہاں تک کہ ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے
کہ ''قاب قوسین'' جتنا فاصلہ رہ گیا، اس سے پہلے کوئی اس مقام پر نہیں پہنچا
اسی سبب سے سارے انبیاؑ نے آپؐ کو ترجیح دی
تمام پیغمبروں نے بھی اس لیے آپؐ کو ترجیح دی کیوں کہ آپؐ ایسے آقا ہیں جن کے نوکر چاکر اس کی خدمت کرتے ہیں
آپؐ نے ساتویں آسمان کو ایک سے دوسرے سرے تک پار کیا
یہاں آپؐ کے فاتحانہ جلوس کا استقبال کیا گیا اور خدا کی حمد کا پرچم آپؐ کے ہاتھ میں تھا......

بصیریؒ نے حضورؐ کو پھول اور بحر بے کنار کہا ہے اور اس شعر کی عموماً تقلید کی جاتی ہے:

ترجمہ: آپؐ شفقت و رافت میں ایک پھول اور حسن و جمال میں چودھویں کے چاند کی مانند ہیں
فیاضی اور سخاوت میں سمندر اور بلند ارادوں میں وقت جیسے
لیکن یہ شفیق اور فیاض پیغمبرؐ جنگ کے موقعے پر ایک ہیرو بھی ہے اور آپؐ کی عسکری کامیابیوں کی ہولناک

تفصیلات اس طرح بیان کی گئی ہیں:

ترجمہ: آپؐ نے ہر میدان جنگ میں بے جگری سے کفار کا مقابلہ کیا

یہاں تک کہ نیزوں کی ضرب سے وہ ایسے ڈھیر ہو گئے جیسے قصاب کی دکان پر گوشت......

آپؐ نے تیرتے ہوئے جنگی گھوڑوں پر سوار فوج کے بحر محیط کی قیادت کی

یہ بپھری ہوئی سمندری موجوں کی طرح دشمن پر جھپٹ پڑے

ان میں سے ہر ایک نے اپنی جان خدا کے سپرد کر رکھی تھی اور اسے انعام خداوندی کی امید تھی

ہر کوئی دشمن پر کاری ضرب لگاتا، ہر ایک نے کفر کو مٹانے کا عہد کر رکھا تھا

بصیریؒ نے بھی پہلے اور بعد میں آنے والے شاعروں کی طرح اس صداقت کا حوالہ دیا ہے کہ اس کا نام محمد ہونے کے ناتے رسول اللہؐ کے ساتھ اس کا خصوصی تعلق ہے اور حضورؐ اپنے ہم نام کی حفاظت کرنے کے پابند ہیں۔ لیکن بصیریؒ دوسرے مسلمانوں کو انتباہ کرتے ہیں کہ انہوں نے آں حضرتؐ کی جو بے حد و حساب تعریف و تحسین کی ہے، اسے عیسائیوں کی طرف سے حضرت عیسیٰؑ کی مدح سرائی کے ساتھ گڈ مڈ نہ کیا جائے کیوں کہ عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر چہ تمام اعلیٰ اوصاف سے متصف اور بہترین خوبیوں کے مالک ہیں لیکن آپؐ بہ ہر حال خدا کی مخلوق ہیں:

ترجمہ: عیسائی لوگ اپنے پیغمبر کے بارے میں جو بھی دعوے کرتے ہیں، انہیں ایک طرف رکھ دو

لیکن تم اپنے رسولؐ کی مدح میں جو بھی کہو، اس پر استقامت اختیار کرو

آپ کی شرافت اور نجابت کے ضمن میں جو چاہو، کہو

آپ کی عظمت اور بزرگی سے جو باتیں منسوب کرنا مقصود ہو، کہو

کیوں کہ رسول خداؐ کی برتری اور فضیلت کی کوئی حد نہیں

جو بھی شخص اپنے منہ سے کلام کرتا ہے، وہ ان فضائل کا (مکمل طور پر) اظہار کر سکتا ہے

بصیریؒ کے بردہ شریف میں وہ تمام نظریات موجود ہیں جن کے ساتھ قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کو والہانہ محبت تھی اور جنہیں وہ تسلیم کرتے تھے۔ چناں چہ اس قصیدے نے عربی میں حضورؐ کی مثالی تصویر کشی میں خاصی مدد کی ہے اور اس کے نتیجے میں غیر عرب اسلامی شاعری پر بھی گہرا اثر پڑا ہے۔

تیرہویں صدی کے وسط تک عرب ملکوں میں صرف چند ایسے مصنف موجود تھے جن کی غنائیہ نظموں سے یہ عندیہ ملتا تھا کہ آنے والی صدیوں میں مذہبی شاعری کو بے حد اہمیت حاصل ہونے والی ہے۔ اس دور میں شاعری میں

درآنے والے تصنع اور بناوٹ کی وجہ سے شاعر حضرات کا دم گھٹنے لگا تھا۔ یہ شاعر حضورؐ کے محاسن کے اظہار میں الجھاؤ کا شکار تھے، ان کا اسلوب حد سے زیادہ بوجھل تھا اور وہ عام طور پر فصیح و بلیغ اختراعیں استعمال کرتے۔ اس قسم کی شاعری کو ''شاعرانہ نذر'' کہا جا سکتا ہے جس میں شاعر حضرات نبی کریمؐ کی خدمت میں شایان شان طریقے سے ہدیہ عقیدت پیش کرنے کے لیے تمام تر فنی مہارت کو بروئے کار لاتے تھے۔ بعضوں نے ایسے شعر کہے جن کے ہر مصرعے کا آغاز نظم کے قافیے سے ہوتا ہے۔ کئی شاعروں نے کسی نقطے کے بغیر نعتیں لکھیں اور بعض نے عربی کے فن خطابت کے ماہرین کی طرح تقریر لکھ دی۔ اس آخری صنف کے شاعروں میں غالباً سیف الدین حلی (وفات ۱۳۴۹عیسوی) سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ تصنع کے اس رجحان کی ایک مثال السرسری کی ایک نعت ہے جسے ۱۲۵۸ء میں منگولوں کی طرف سے ہلاکو کی قیادت میں بغداد کی تباہی کے دوران قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ نعت ''فن لطیف'' کا ایسا نمونہ ہے کہ اس کے ہر مصرعے میں تمام حروف تہجی شامل ہیں! سرسری نے اپنے پیشرووں اور متاخرین کی طرح حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور کا ہر شعر کے درمیان میں ذکر کیا ہے، مثال کے طور پر اس نے ایک نظم کا آغاز ''تجاہل العارف'' کو استعمال کرتے ہوئے استفہامیہ انداز میں کیا ہے:

ترجمہ: کیا یہ آپؐ کا چہرہ مبارک ہے یا صبح کی روشنی جس سے سحر نمودار ہوتی ہے؟

کیا یہ چودھویں کا چاند ہے جس سے تاریکی چھٹ گئی ہے؟

یا یہ بن بادلوں کے دن میں طلوع آفتاب کا منظر ہے؟

(النبھانی: المجموعۃ النبھانیہ ا: ۵۶۴: ا: ۳: ۱۷: عبدالعزیز الزمزمی المکی (وفات ۱۵۵۶عیسوی) نے اس صنف کی پیروی کرتے ہوئے زیادہ پیچیدہ انداز میں نعت لکھی ہے)۔

بعد کے زمانے میں الوطریؒ (وفات ۱۳۶۴عیسوی) نے حضورؐ کی مدح میں کئی نعتیں لکھیں جنہیں قبول عام حاصل ہوا۔ ہندوستان میں یہ نعتیں ان یونانی گیتوں کی طرز پر لکھی جانے لگیں جنہیں ناٹک میں دو جماعتیں گاتی تھیں۔

۔(Kokan: Arabic and Persian in Carnatic, pp.61-63)

یوں لگتا ہے کہ مراکش بلکہ اسپین سمیت پورے شمالی افریقا کے شاعر نعت گوئی اور حضورؐ پر درود و سلام لکھنے کے معاملے میں خاص طور پر بہت زرخیز دماغ کے مالک تھے چناں چہ ان میں سے بعض شاعروں کو ادب عالیہ میں کلاسیکل درجہ حاصل ہے۔ ان میں ابن مشیشؒ اور بعد میں جزولیؒ کی دلائل الخیرات کو بڑی شہرت ملی۔ اعلیٰ پائے کی ان نظموں کی بے حد پذیرائی ہوئی ہے، ان میں نعتیہ شاعری کی تمام نمایاں خصوصیات پائی جاتی ہیں جیسے آں حضرتؐ کے نعلین مبارک کی تعریف و مدح! (اس سے پہلے دوسرے باب میں اس کی تفصیل آ چکی ہے)۔ ان نعتوں میں تکرار لفظی

کی صنعت کو خوب صورت انداز میں استعمال کیا گیا ہے، مثال کے طور پر رسول کریمؐ سے مخاطب ہو کر کہا گیا ہے:

''اے آقاؐ...... اے آقاؐ...... اے آقاؐ! یا ''رحم...... رحم...... رحم!''

ترجمہ: اے خدائے واحد کے پیغمبرؐ! میں اجنبی ہوں ——

میری دست گیری کیجیے، اے پردیسیوں کی جائے پناہ!

اے خدائے واحد کے پیغمبرؐ! میں غریب اور بے کس ہوں

میری مدد کیجیے، اے تنگ دستوں کے سہارے!

اے خدائے واحد کے پیغمبرؐ! میں بیمار اور کمزور ہوں ——

میری چارہ گری کیجیے کہ میں نے آپؐ کو مدد کے لیے پکارا ہے

اے خدائے واحد کے پیغمبرؐ! اگر آپؐ نے میری امداد نہ کی

تو پھر میں کس سے رجوع کروں گا؟

ان عقیدت مندانہ جذبات کا اظہار پندرھویں صدی کے ایک عرب شاعر نے حضورؐ کی بارگاہ اقدس میں ایک مدحیہ نظم میں کیا ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں ایسا دل فریب آہنگ اختیار کیا جو تمام اسلامی ملکوں کی شاعری میں مقبول ہے یہاں تک کہ پنجاب اور سندھ کے دیہات میں بھاٹوں اور گویوں کی آہ وفغاں میں بھی یہی جھلک نظر آتی ہے۔ بعد کی عربی شاعری میں کمال مہارت کے ساتھ لفظوں سے کھیلا گیا ہے اور مصنفوں نے عربی کے مصادر کے درمیان آڑے ترچھے تعلقات کے نتیجے میں تمام ممکن استنباط کو ہنرمندی کے ساتھ استعمال کیا ہے، سادہ متبادل الفاظ سے استفہامیہ انداز میں حضورؐ سے فریاد کی ہے اور آپؐ سے گناہوں کی معافی مانگی ہے نیز آں حضرتؐ کے محاسن اور معجزوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی تفصیلات بیان کی ہیں۔

اسلام سے پہلے کی مشہور نظموں کو، جیسے امرا القیس کی ''قفانبکی'' (اے میرے دو دوستو! آؤ کہ کچھ دیر ٹھہر کر گریہ وزاری کرلیں......) ''جدا کر کے'' ان کے درمیان نئے اشعار کا اضافہ کیا گیا ہے جن میں آں حضرتؐ کی مدح کی گئی ہے۔ یوسف النبھانیؒ نے نعتیہ مجموعے میں اپنے فن پاروں کے ساتھ اس اسلوب کی کئی نظمیں شامل کی ہیں۔ ایک نظم میں عربی شاعری کی کل سولہ بحریں استعمال کی گئی ہیں اور ہر بحر کے فنی نام کو بڑی مہارت کے ساتھ موزوں متن میں شامل کیا ہے۔

مدحیہ غنائی نظم کی کلاسیکل صورت عربی زبان میں اب بھی زندہ ہے چناں چہ مصر کے نامور شاعر احمد شوقیؒ نے بیسویں صدی کے شروع میں بردہ کی طرز پر فی نہج البردہ کے نام سے ایک قصیدہ لکھا۔ انہوں نے بصیریؒ کی ہمزیہ کی بھی

پیروی کی ہے اور میلاد پر بھی کئی نظمیں لکھی ہیں۔ عرب ملکوں میں نعتیہ شاعری تیزی کے ساتھ مقبول ہوتی رہی، ان میں سے بعض نظمیں گائی جاتی تھیں اور انہیں یاد کرنا بہت آسان تھا۔ ایسی شاعری ہر صنف میں کی گئی اور اس میں گرامر کے کلاسیکل قواعد کی جزوی طور پر پابندی کی گئی۔ اس میں موو شتہ طرز کی شاعری مکمل طور پر کلاسیکل اسٹائل میں ہے۔ اس اسلوب کی خاص طور پر بڑی پذیرائی ہوئی یہاں تک کہ عبدالغنی نابلوسی جیسے صوفی شاعر نے (سترہویں صدی کے آخر اور اٹھارویں صدی کے شروع میں) رسول کریمؐ کی تعریف کے لیے اسی اسلوب کا انتخاب کیا۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ نہ صرف عرب ملکوں بلکہ مسلم ہندوستان میں بھی عربی قصیدے کی روایتی ہیئت کو محفوظ رکھا گیا ہے اور شمالی ہندوستان اور دکن میں ایسے کئی شاعر اور علمائے دین موجود تھے جو قرون وسطیٰ کے عربی شاعروں کے اسلوب میں مسلسل لکھتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی بہ ہر حال ان کے دین کی مشترک زبان ہے۔ (Muid Khan: The Arabian Poets of Golconda, pp.102-8)۔ اس ضمن میں جید عالم آزاد بلگرامیؒ (وفات ۱۷۸۶ عیسوی اورنگ آباد) کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے جنہیں اعلیٰ پائے کی عربی شاعری کہنے پر ''حسان الہند'' کہا جاتا ہے۔ ان سے تھوڑی دیر پہلے دہلی کے عظیم مصلح عالم دین شاہ ولی اللہؒ نے سرور کائناتؐ کے تقریباً ان ہی معجزوں کے بارے میں روایتی تشبیہوں کو استعمال کرتے ہوئے عربی اشعار لکھے جن کا ذکر انہوں نے زیادہ سنجیدہ اور متین انداز میں اپنی فاضلانہ تصانیف میں کیا تھا۔ جنوبی ہندوستان میں نہ صرف بردہ شریف اور اسی قسم کی دوسری مشہور نظموں میں شعری اضافے کیے گئے بلکہ صوفیانہ ذہن رکھنے والے شاعروں نے عربی کی کلاسیکل روایت کو اپنے اپنے لسانی ماحول میں بھی متعارف کرایا، مثال کے طور پر عربی کے گراں قدر اسلامی لٹریچر کو تامل زبان کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ ان میں عمر پلاور کی سیرت پرانم (۱۷۰۰ عیسوی) سب سے قابل ذکر ہے جو نبی کریمؐ کی حیات طیبہ کے واقعات پر مبنی ایک طویل نظم ہے۔

مدینہ منورہ میں حاضری کی آرزو

مصر کے صوفی شاعر ابن الفرید (وفات ۱۲۳۵ عیسوی) (غالباً یہ ابن الفارض ہیں، ابن الفرید نہیں۔ مترجم) نے، جو برسوں حجاز میں مقیم رہے، اسلام کے مقدس شہروں (مکہ اور مدینہ۔ مترجم) میں حاضری دینے کے لیے اپنی بے تابی کا اس طرح اظہار کیا ہے:

ترجمہ: درد کی شدت جب میری روح میں اتر جاتی ہے تو اس حال میں

حجاز کی تازہ جڑی بوٹیاں ہی مرہم کا کام دیتی ہیں......

(Nicholson: Studies in Islamic Mysticism, p.181)

الفریدؔ غالباً پہلے شاعر ہیں جنھوں نے حضور رسالت مآبؐ کی آبائی سرزمین کے لیے شعر میں کمال فنی مہارت کے ساتھ اشتیاق اور محبت کا اظہار کیا ہے۔ لیکن تیرھویں صدی کے بعد اس موضوع کو شاعری میں سب سے زیادہ اہمیت دی گئی چناں چہ حضورؐ کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے کی غرض سے مختلف قسم کی نعتیں لکھی گئیں۔

مدینہ منورہ، جہاں رسول اللہؐ کی آخری آرام گاہ واقع ہے، آج تک شاعروں کی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز محور ہے اور تور آندرے نے درست کہا ہے کہ یہ نظریہ کہ آں حضرتؐ کے روضہ اقدس پر حاضری حضورؐ کی طرف سے شفاعت کی ضمانت ہے، کٹر عقاید رکھنے والے مسلمانوں کے لیے بالکل نیا ہے۔ (Andrae: Die Person Muhammads, pp.256, 286)۔ وہابی آپؐ کے روضہ مبارک پر حاضری دینا پسند نہیں کرتے اور اس کی پہل ابن تیمیہ نے کی تھی۔ (ابن تیمیہ کا خیال تھا کہ صرف خاص مقصد کے لیے روضہ اقدس پر حاضری دینا ''بغاوت'' ہے۔ (Memon: Ibn Taimya's Struggle against Popular Religion, pp.15, 286, 292)۔ مصری اسکالر علی صفی حسین کا کہنا ہے کہ ادب میں یہ نظریہ سب سے پہلے مصر کے اہل حدیث شاعر ابن دقیق (وفات ۱۳۰۲ عیسوی) نے پیش کیا تھا لیکن خیال ہے کہ یہ نظریہ پہلے سے چلا آ رہا تھا۔

شاعر حضرات قصیدے کی کلاسیکل عرب شکل اور ہیجان انگیز تعارف تشبیب کے ذریعے مدینہ منورہ میں روضہ نبویؐ کی زیارت کے تصور کو اجاگر کرتے رہے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے دور افتادہ محبوب کے گھر تک کے سفر کی روایتی تفصیل کو اپنے محبوب پیغمبرؐ کے روضہ اقدس تک کے سفر میں تبدیل کر دیا۔ مسافر شاعر کے بے قرار دل کو ریگ زار عرب میں پاؤں میں چبھنے والے کانٹے ریشم و حریر اور زربفت کی مانند نرم محسوس ہوتے ہیں۔ محبوب کے گھر تک کٹھن اور دشوار گزار سفر کی تفصیل کا موضوع لوک شاعری میں بھی درآیا چناں چہ شاہ عبداللطیفؒ کے کلام میں اونٹ کی مہار (جس سے مراد انسان کی بے چین اور سرکش روح ہے) محبوب پیغمبرؐ کی جانب موڑ دی جاتی ہے جو ''شہد سے میٹھا اور عنبر سے زیادہ خوشبودار ہے۔'' اور فروزاں چاند سے کہا جاتا ہے کہ وہ مسافر کے محبت آمیز خیالات کے اظہار کے لیے محبوب کے پاؤں چوم لے۔ جو شاعر خود دیار حجاز کا سفر نہیں کر سکتے تھے، وہ نئے استعارے اور تشبیہیں استعمال کر کے اپنے خیالی سفر کی تفصیلات لکھتے، بادِ سحر کے ذریعے حضورؐ کو سلام بھیجتے اور اسے کہتے کہ وہ آپؐ کو ان کی محبت اور عقیدت سے آگاہ کر دے ـــــ یہ نظریہ بھی عشقیہ شاعری سے مستعار لیا گیا کیوں کہ غیر عرب ملکوں میں غزلوں کے ذریعے دلی جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ غرض سلام کو مذہبی شاعری میں ایک منفرد صنف کا درجہ مل گیا۔

مصر کے چودھویں اور پندرھویں صدی کے شاعر گو کہ اس سرزمین کو دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کرتے کیوں کہ اس ملک میں حضورؐ قیام پذیر تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ افریقا اور فارسی بولنے والے ملکوں میں اس موضوع پر زیادہ لکھا گیا ہے۔ جو شاعر

مدینہ منورہ سے جس قدر دور رہتا ہے، اسی قدر اس میں روضہ مبارک پر حاضری کی تڑپ زیادہ ہوتی ہے جس کا وہ فصیح و بلیغ شعری کلام کے ذریعے اظہار کرتا ہے۔ ترکی کی ایک نہایت ماڈرن اور اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ایمل الیسین نے اپنی شاندار کتاب Mecca the Blessed, Medinah the Radiant میں یہ ثابت کیا ہے کہ حضورؐ کے روضہ اقدس کی زیارت اور حاضری کی آرزو کو زندہ مذہب (اسلام) کا اب بھی ایک غالب عنصر سمجھا جاتا ہے۔ بھارت اور پاکستان کے جن مسلمانوں کو فریضہ حج ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوتی ہے، وہ مکہ معظمہ کے بعد جب مدینہ منورہ میں روضہ مبارک پر حاضری کا نہایت وجد آفریں الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں اور ان لمحوں کو یاد کرتے ہیں جب وہ حضورؐ کے روضہ اقدس کے سامنے کھڑے تھے تو ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔

پندرھویں صدی کے مصری اسکالر السیوطیؒ نے ایک رسالہ لکھا تھا جس میں مدینہ منورہ میں رسول کریمؐ کے روضہ مقدسہ پر حاضری دینے والے زائرین کو آپؐ پر درود و سلام بھیجنے کے آداب سکھائے گئے ہیں:

جب وہ (زائر) مسجد نبویؐ میں داخل ہو تو اسے روضہ (''باغ'' حضورؐ کے مزار کے مغرب میں ستون تک جگہ) پر دو رکعت نفل ادا کرنے چاہییں، پھر وہ اپنا منہ قبلہ شریف کی طرف کرلے اور لحد کے قریب جا کر سرہانے سے چار قدم کے فاصلے پر اس طرح کھڑا ہو جائے کہ قندیل اس کے سر کے اوپر اور اس کا رخ قندیل کے سامنے کی دیوار کی طرف ہو۔ اس طرح جب وہ پائنی کی جانب کھڑا ہو تو اس کا منہ آں حضرتؐ کے چہرہ مبارک کی طرف ہو گا۔

زائر کو چاہیے کہ وہ اپنے سامنے روضہ مبارک کے زیریں حصے کو دیکھے، اس کی نگاہیں عجز و انکسار سے جھکی ہوئی ہوں اور وہ عالم استغراق میں عقیدت و احترام کے جذبات سے لرزاں و ترساں ہو۔ پھر اسے یہ کہنا چاہیے: ''اے خدا کی مخلوق کے لیے سرمایہ انبساط! آپؐ پر خدا کی رحمتیں نازل ہوں! اے خدا کے محبوبؐ! آپؐ پر خدا کی رحمتیں نازل ہوں! اے خاتم النبیینؐ! آپؐ پر خدا کی رحمتیں نازل ہوں! اے گروہ انبیا کے سردار! آپؐ پر خدا کی رحمتیں نازل ہوں! اے خوش خبریاں دینے والے! آپؐ پر خدا کی رحمتیں نازل ہوں! اے انسانیت کو علم و آگہی کا سبق سکھانے والے! آپؐ پر خدا کی رحمتیں نازل ہوں! اور آپؐ کی آل پر، آپؐ اور آپؐ کی ازواج مطہراتؓ اور امہات المومنینؓ پر، آپؐ اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ پر، آپؐ پر اور تمام نبیوں اور پیغمبروں پر اور خدا کے تمام متقی اور پرہیزگار عبادت گزاروں پر خدا کی رحمتیں نازل ہوں۔ (Padwick: Muslim Devotions, p.223)۔ جو شاعر کسی وجہ سے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ حاضر نہ ہو سکے، وہ ان مقدس شہروں کے فیوض و برکات کے بارے میں ہمیشہ رطب اللسان رہے ہیں۔ یونس ایمرے ۱۳۰۰عیسوی میں مکہ اور مدینہ جانے کے آرزومند رہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگر وہ ان مقدس مقامات پر حاضری دیتے تو ان کے دلی جذبات کیا ہوتے:

ترجمہ: اگر خدا مجھے وہاں جانے کا موقع دیتا

تو میں روتا ہوا وہاں حاضری دیتا

اور مدینے میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

کو روتا ہوا دیکھتا......

یونس ایمرے کے کوئی ڈیڑھ سو سال بعد ہرات کے جامیؔ نے ایک طویل نعت میں مدینہ منورہ کی ستائش کی جس میں حضورؐ کے شہر کا نام ردیف اور قافیے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے:

ترجمہ: مدینے کے ریگستان میں ہماری حیثیت گل لالہ کی سی ہے

ہمارا دل مدینے کی آرزو میں داغ داغ ہے

عقل مند کے سر سے جنت کی خواہش محو ہو سکتی ہے لیکن

مدینے کی آرزو اس کے دماغ سے کبھی نہیں نکل سکتی......

طوبیٰ کا درخت جس نے عرش کی چوٹی سے سر نکال رکھا ہے

اس کی حیثیت مدینے کے کھجور کے درخت کی ایک شاخ سے زیادہ نہیں

جب تم کھجوریں کھاؤ تو ان کی گٹھلیوں کو چوم لو کیوں کہ

مدینے کی کھجوروں کی گٹھلیاں فرشتوں کے گلاب کے باغ کی تسبیح کے دانے ہیں

مولانا جامیؔ یہ بیان کرنے کے بعد کہ مدینے کی گرد حضورؐ کے وجود کی برکت سے کس طرح پانی میں تبدیل ہو گئی ہے اور کس طرح آفاقی عقل مدینے کے سمندر میں غوطہ زن ہے، ایک مرتبہ پھر اپنے پسندیدہ ذومعنی الفاظ استعمال کرنے کی طرف پلٹتے ہیں اور یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا مدینہ کا پہلا حرف میم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پہلے حرف میم سے متشابہ نہیں اور کیا مدینہ کا میم محو کرنے سے دین کا لفظ نہیں بن جاتا؟

تمام اسلامی ملکوں کی طرح برصغیر ہند کے شاعر بھی سلطانِ مدینہؐ سے ہی امداد طلب کرتے ہیں:

ترجمہ: سلطانِ مدینہ! میری آہ و فغاں سنیے ——

آپؐ سفر و حضر میں حفاظت کرنے والے ہیں

آپؐ ہی ساحل پر پہنچاتے اور مسافروں کی رہنمائی کرتے ہیں

مدینے کے والی! میری فریاد سنیے!

میری ساری امیدیں آپؐ ہی سے وابستہ ہیں

کسی دوسرے مددگار کے متعلق میں نے کبھی نہیں سوچا

مدینے کے دولہا! میری پکار سنیے!

اے محمدؐ! پھر تشریف لائیں، آپؐ ہی اس گنہ گار کی امیدوں کا مرکز ہیں

یہ اشعار سندھ کے شاہ عبداللطیفؒ نے اٹھارویں صدی کے شروع میں عظیم سندھی تصنیف رسالو میں لکھے تھے۔ ان کے ہم وطن عبدالرؤف بھٹی نے، جنھوں نے تقریباً اسی زمانے میں لکھا، رسول کریمؐ کی مدح میں درجنوں نظمیں کہیں اور اپنے مختصر مترنم گیتوں میں اس امید کا اظہار کیا کہ انہیں آپؐ کی قربت نصیب ہوگی:

ترجمہ: روشن وتاباں مدینے میں ـــــ کاش میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہاں رہتا!

کاش میں تمام زائرین کے ساتھ مل کر شافع محشرؐ پر درود وسلام بھیجتا ـــــ

روشن وتاباں مدینے میں......

دل چاہتا ہے کہ میں آقا کو دل کی بات بتاتا!

روشن وتاباں مدینے میں......

میں جو ایک قابل نفرت گنہ گار ہوں، کھل کر اپنی خطاؤں کا اقرار کرتا!

روشن وتاباں مدینے میں ـــــ کاش میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہاں رہتا!

حیدرآباد دکن کے سابق ہندو وزیر اعظم سرکشن پرشاد شاد (وفات ۱۹۴۳ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں کہ انہوں نے بھی اردو کی ایک نعت میں سلطانِ مدینہؐ کے ساتھ گہری عقیدت اور روضہ مبارک پر حاضری کا اشتیاق ظاہر کیا ہے۔ (فاضل مصنفہ کی طرح مجھے بھی یہ نعت بے حد پسند ہے۔ قارئین کے استفادے کے لیے یہاں ان کی مکمل نعت درج کی جاتی ہے ـــــ مترجم)۔

بلوائیں مجھے شادؔ جو سلطانِ مدینہؐ ۔۔۔ جاتے ہی میں ہو جاؤں گا قربانِ مدینہ

وہ گھر ہے خدا کا تو یہ محبوبِ خدا ہیں ۔۔۔ کعبے سے بھی اعلیٰ نہ ہو کیوں شانِ مدینہ

روکیں گے نہ دربار میں جانے کے لیے شادؔ ۔۔۔ پہچانتے ہیں سب مجھے دربانِ مدینہ

ہے قربِ نبیؐ ہی سے تو یہ عزت و اجلال ۔۔۔ قالب ہے مدینہ تو وہ ہے جانِ مدینہ

لے جاؤں گا میں ساتھ فقط عشقِ محمدؐ ۔۔۔ تحفہ ہے مرے پاس یہ شایانِ مدینہ

دیکھے جو تحیر میں مرے عشقِ نبیؐ کو ۔۔۔ سکتے میں رہے نرگسِ بستانِ مدینہ

کھولے درِ جنت کو یہی کہتا ہے رضواں ۔۔۔ بے خوف چلے جائیں غلامانِ مدینہ

نشہ ہے وہ ان کو جو اترتا ہی نہیں ہے توحید کی مے پیتے ہیں مستانِ مدینہ
خاکِ رہِ یثرب کو بناؤں گا میں سرمہ دیکھوں گا ان آنکھوں سے جو میدانِ مدینہ
اللہ دکھا دے تو مجھے روضۂ اقدس باقی کہیں رہ جائے نہ ارمانِ مدینہ
کیوں میری شفاعت میں بھلا دیر لگے گی کیا مجھ کو نہیں جانتے سلطانِ مدینہ
کافر ہوں کہ مومن ہوں خدا جانے میں کیا ہوں پر بندہ ہوں ان کا جو ہیں سلطانِ مدینہ
کیا مجھ سے ثنا ہو سکے اک مور ہوں ادنیٰ اعلیٰ ہیں وہی جو ہیں سلیمانِ مدینہ
مومن جو نہیں ہوں تو میں کافر بھی نہیں شادؔ
اس زمرے سے آگاہ ہیں سلطانِ مدینہ

سرکشن پرشاد شادؔ کی طرح کئی دوسرے شاعر بھی اپنے آبائی وطن اور پریشان حال بلبل کی طرف سے باغ کو چھوڑ کر خدا سے دست بدعا ہیں کہ وہ محبوب خداؐ اور ان کے درمیان جدائی کے پردے کو ہٹادے کیوں کہ:

ترجمہ: دونوں جہانوں میں غریب کے لیے کوئی جگہ تلاش نہ کرو ـــــ
محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دروازہ غریبوں کے لیے کھلا ہے
بادِ نسیم جو احمدؐ کی آرام گاہ کے قریب سے گزرتی ہے ـــــ
وہ غریبوں کے لیے خاک شفا لے کر آتی ہے......
گنہ گار بے لباس ہے، اس کے پاس کوئی جائے پناہ نہیں، نہ کوئی کپڑا ہے
احمدؐ کی شفقت ورافت ہی غریبوں کا لبادہ ہے

عہدِ حاضر کے ایک اور ہندو شاعر کیفیؔ (پنڈت برج موہن کیفی ـ مترجم) نے روایتی صورت گری کرتے ہوئے دل کا ایک پرندے سے موازنہ کیا ہے اور خدا سے دعا کی ہے کہ وہ اس پرندے کو اڑا کر یثرب پہنچادے تاکہ زائر وہاں قرآن پاک کی چوبیسویں سورہ النور کی تلاوت کر سکے کیوں کہ وہاں وہ ربانی نور کا مشاہدہ کرتا ہے:

معراج ہو مومن کو نہ کیوں اس کی زیارت
ہے خلدِ بریں روضۂ پرنور کا خاکا

کیفی سے بہت پہلے جامیؔ نے لکھا تھا کہ آسمان اس مٹی پر رشک کرتا ہے جہاں نبی کریمؐ آرام فرمارہے ہیں: ''اے کاش! میں مٹی ہو جاتا'' (سورہ النزعات آیت ۴۰)۔ اور یہ صرف چند برس پہلے کی بات ہے کہ مصر کے ترقی پسند شاعر الفیطوری نے ''خدا کے گھر کے زائر کی ڈائری'' میں اپنے اشعار میں نور کی صدیوں پرانی تشبیہ کو دہرایا کیوں کہ

Hasnain Sialvi

مدینہ منورہ کے لئے المصطفیٰؐ کا نور ہر وقت چمکتا رہتا ہے:

ترجمہ: نبی کریمؐ کے جسم اطہر پر موجود خاک کا ہر ذرہ
نور کا ایک مینار ہے
جو آپؐ کے روضہ اقدس کے گنبد سے لے کر
آسمانوں کے قبے تک نورافشانی کر رہا ہے
اور وہ رعب وجلال جو ہماری جبینوں کو جھکا دیتا ہے
اس سے افق کی ایک لکیر کھنچ جاتی ہے، تہ در تہ افق
ہاتھوں اور ہونٹوں سے
''بسم اللہ'' کی شاہراہ بن جاتی ہے

شاعر کو، جو ہندوستان کا ایک مسلمان ہے، مدینہ منورہ میں ہر وہ چیز مل سکتی ہے جس کا اس نے خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا:

ترجمہ: اس روضہ اقدس کی بلبلوں کی زبان پر حکمت اور دانائی کے الفاظ ہیں
مدینے کے پھول دوسرے تمام پھولوں کے مقابلے میں زیادہ خوش نما اور رنگین ہیں

انیسویں صدی کے شروع میں وہابیوں کے ہاتھوں مدینہ منورہ میں روضہ مبارک کی تباہی بھی اس مقدس مقام سے عقیدت کی طویل تاریخ میں صرف ایک عارضی مرحلہ تھا۔ وہابی آپؐ کے روضہ مقدس پر حاضری اور مزاروں کی پرستش کو قرآنی تعلیمات اور مزاروں کی پوجا سے متعلق ایک حدیث کے منافی سمجھتے تھے۔ اس کے باوجود اس واقعے کے فوراً بعد روضہ مبارک پر زائرین کا پھر ہجوم ہو گیا کیوں کہ مسلمانوں کا عقیدہ تھا کہ یہاں وہ ہر خطرے سے محفوظ ہیں، انہیں یہ بھی یقین تھا کہ روضہ اقدس پر ان کی دعا سنی جائے گی:

ترجمہ: سلطانِ مدینہ! اے غریبوں کے دست گیر!
آپؐ مجھے یقیناً خالی ہاتھ نہیں لوٹائیں گے!

یہ منظر بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ تیونس کے مزدور دن بھر کی مشقت کے بعد اپنے ساتھیوں سے مل کر ایسے سادہ نغمے گاتے ہیں جن میں مدینہ منورہ میں آں حضرتؐ کے روضہ مبارک پر حاضری دینے کی آرزو کے ساتھ ساتھ حضورؐ پر درود وسلام بھی بھیجا جاتا ہے۔ بھارت اور پاکستان میں ایسی نعتوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں جن میں مدینہ اور رسول پاکؐ کی موجودگی کا تذکرہ کیا گیا ہے بلکہ محمد اقبالؒ کے آخری مجموعہ کلام کا نام ہی ارمغانِ حجاز ہے جو اسی روایت

سے ماخوذ ہے۔ حال ہی میں دکن کے ایک ہندوستانی مسلمان سید غیاث متین نے اپنی ڈرامائی اردو نظم میں لکھا ہے کہ انہیں خواب میں اپنے جد امجد حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے روضہ اقدس کی زیارت ہوئی ہے۔ خواب کے مطابق رسول کریمؐ مخملیں پردوں سے برآمد ہوئے اور اس طرح تشریف فرما ہوئے کہ سید غیاث آپؐ کے نورافشاں پاؤں کو آنکھوں سے چوم سکتے تھے۔ انہوں نے سوال کیا ہے کہ اگر یہ خواب حقیقت بن جائے تو کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہوگی؟ صرف یہی امید ہے جو سید غیاث کو زندہ رکھے ہوئے ہے اور وہ اس بابرکت لمحے کے منتظر ہیں جب حضورؐ کے ساتھ ان کی ملاقات ہوگی۔ یہ نظم حضرات صوفیہ کی ان روایتی کہانیوں سے ہم آہنگ ہے جن کے مطابق نبی کریمؐ اپنی قبر سے کسی بھی زائر کے ساتھ گفتگو کر سکتے ہیں (کیوں کہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ اپنی لحد میں بھی زندہ ہیں)، مثال کے طور پر چودھویں صدی میں اوچ کے بزرگ مخدوم جہانیاں نے، جن کے سید ہونے کے دعوے پر بعض عرب شک کا اظہار کرتے ہیں، جب روضہ اقدس پر حاضری کے دوران حضورؐ کو سلام کیا تو آپؐ نے روضہ مبارک سے ان الفاظ میں جواب دیا تھا:

''اور آپ پر بھی سلامتی ہو اے میرے بیٹے!'' (ایس بی بخاری: جواہرالاولیا صفحہ ۲۲۲)۔

رسول اللہؐ کے روضہ اقدس کی زیارت کا تصور سارے عالم اسلام کی مذہبی شاعری میں پوری طرح سرایت کر چکا ہے اور شاید ہی ایسا کوئی شاعر ہوگا جو یہ دعویٰ کر سکے کہ وہ حضورؐ کے اس قدر قریب ہے کہ اسے مدینہ منورہ جانے کی ضرورت نہیں:

ترجمہ: اے دوست! یہ نہ پوچھ: ''محمدؐ کہاں ہیں؟''
آپؐ میرے دل میں چھپے ہوئے ہیں، یہ ہیں محمدؐ!
کیا مدینہ میں مارے مارے پھرنے کی ضرورت ہے؟
یہاں وہاں ـــــ محمدؐ ہر جگہ ظاہر ہیں
آپؐ میرے دل میں، میری آنکھوں میں ہمیشہ بسے رہتے ہیں
قول و قرار کے دن سے، محمدؐ......

فارسی اور عوامی روایت میں نعتیہ شاعری

عربی میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شان میں کہی گئی نعتوں میں خصوصی کشش اور چاشنی اس زبان میں موجود درجہ کمال کے حسن و رعنائی میں مضمر ہے اور واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی کسی زبان میں اس کا ترجمہ ممکن نہیں اور نہ ہی اسے صحیح طور پر کسی اور زبان میں منتقل کیا جا سکتا ہے کیوں کہ کوئی بھی زبان عربی کے رمز و کنائے، تشبیہوں، استعاروں اور تلمیحات کے پیچیدہ چھتے کو عام طور پر کامیابی کے ساتھ ہو بہو نقل نہیں کر سکتی۔ اس کے بجائے عام قاری

اس رنگارنگ اور صوفیانہ اعتبار سے شاعری کی اس اونچی دنیا تک زیادہ آسانی سے رسائی حاصل کرسکتا ہے جس کا اظہار فارسی، ترکی اور اردو کی نعتیہ شاعری میں ہوتا ہے۔ ان تینوں زبانوں کی تشبیہیں ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں چناں چہ ایران کے شہری اور درباری شاعروں کی پسندیدہ تشبیہوں اور استعاروں نے مسلم ہندوستان کی علاقائی زبانوں پر بھی گہرا اثر چھوڑا ہے۔ میر شیر علی قانع (اٹھارویں صدی کے سندھی شاعر) کا مصرع ہے:

ترجمہ: نعت ہی دیوان کی نہر کا اصل سرچشمہ ہے

اسی طرح فارسی کے شاعر بھی نعت کو مرکزی اہمیت دیتے ہیں اور یہ ایک ایسا موضوع ہے جو ان کے کلام کو زندگی اور شہرت بخشتا ہے۔

یہ مشرقی افغانستان کے شہر غزنی کے سنائی تھے جنھوں نے گیارہ سو عیسوی کے لگ بھگ فارسی زبان میں نعت گوئی کا باضابطہ آغاز کیا۔ سنائی نے ایک درباری قصیدہ گو کی حیثیت سے اپنی سابق سرگرمیوں سے دست بردار ہو کر مذہب، خاص طور پر تقوے اور پرہیزگاری پر مبنی زاہدانہ شاعری میں گہری دل چسپی لینا شروع کر دی اور فارسی زبان میں راہبانہ تصوف کے اظہار کے لیے مثنوی لکھنے کی روایت کی بنیاد ڈالی۔ بعد میں وہ رسول کریمؐ کے سب سے پہلے اور کئی اعتبار سے سب سے بڑے قصیدہ گو بن گئے۔ اس سے پہلے انہوں نے دنیاوی بادشاہوں کی مدح سرائی کے لیے نفیس خطیبانہ فنی اسلوب اختیار کیا تھا، اب وہ زیادہ مہارت کے ساتھ حضور سرور کائناتؐ کی شان میں قصیدے لکھنے لگے اور جس طرح انہیں بادشاہوں اور رئیسوں سے نقد اور اشیا کی صورت میں انعام کی توقع ہوتی تھی، اسی طرح اب وہ رسول خداؐ، شافع محشرؐ اور تمام جسمانی اور روحانی محاسن کی حامل ذات پاکؐ سے کہیں زیادہ روحانی صلے کی امید کرنے لگے۔

ہم پیغمبر خداؐ کی مدح میں ایک نہایت اثر انگیز نظم لکھنے پر سنائی کے زیر بار ہیں اور یہ وہی نعت ہے جس نے بعد میں فارسی میں نعت گوئی پر مبنی لکھے جانے والے لٹریچر کے لیے اسٹیج تیار کیا۔ یہ قرآن کریم کی ۹۳ ویں سورہ الضحیٰ (قسم ہے چاشت کے وقت کی اور قسم ہے رات کی جب چھا جائے) ہے جس کی پہلے بھی نور محمدؐ کے حوالے سے تشریح ہو چکی ہے اور اسے آج تک تصوف کی دنیا کے مرکز و محور کی حیثیت حاصل ہے۔ سنائی نے یہ نعت فاضل لوگوں کے ایک جلسے میں فی البدیہہ پڑھی جس کے پہلے مصرعوں نے ہی سامعین کو مسحور اور اپنی طرف متوجہ کر لیا:

ترجمہ: جبر (تقدیر) اور قدر (اپنی مرضی کرنا) کی دستاویز
آپؐ کے چہرہ انور اور گیسوؤں پر محیط ہے
ایک کا اظہار سورہ اللیل سے ہوا ہے

اور دوسری کا سورہ الضحیٰ سے!

کفر والحاد کے لیے تاریکی اور ایمان کے لیے پاکیزگی

مصطفیٰؐ کے رخساروں اور گیسوؤں سے بڑھ کر کوئی بادشاہت نہیں

اگر آپؐ کی زلفیں اور چہرہ انور خدا کا قہر اور لطف و کرم نہ لاتے

تو کفر بے سروسامان اور ایمان بے بس ہوتا!

اس کا مطلب یہ ہے کہ آں حضرتؐ کی ذات اقدس میں اللہ تعالیٰ کے جمال اور جلال کے دو تکمیلی محاسن آشکار ہوتے ہیں ـــــ یہ وہ اوصاف ہیں جو پوری کائنات کو ہمہ وقت متحرک رکھتے ہیں۔ بعد میں آنے والے شاعروں، نظامیؔ سے لے کر محمد اقبالؒ تک نے رسول کریمؐ کی قربت حاصل کرنے کے لیے سنائیؔ کے تتبع میں آپؐ کے خوب صورت اور پرشکوہ محاسن کی مدح سرائی کی کیوں کہ حضورؐ کی ذات گرامی میں بیک وقت حضرت موسیٰؑ کی سختی اور عیسیٰ علیہ السلام کی نرم دلی کے جوہر موجود ہیں، آپؐ دشمنوں کے دل میں رعب اور خوف اور اپنے دوستوں کی روح میں محبت کے جذبات ابھار سکتے ہیں۔ (نظامیؔ: شرف نامہ اسکندری در کلیات خمسہ صفحہ ۸۴۵)۔ سنائیؔ کی نعت جاری ہے اور اب وہ رسول اللہؐ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

ترجمہ: آپؐ کے رخِ انور کی ضوفشانی کو ''صبح''

اور آپؐ کے دو کاکلوں کو ''رات'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے

روشن صبح اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تاباں و ضیا بار چہرہ مبارک کے درمیان موازنہ، جس کا نور ایمان اور قرآن کریم کی ۹۲ ویں سورہ اللیل، آں حضرتؐ کے سیاہ گیسوؤں اور کفر کی تاریکی سے گہرا تعلق ہے، فارسی شاعری میں جلد ہی معیاری فارمولے کی حیثیت اختیار کر گیا چناں چہ گلبرگہ ڈھاکا کے بزرگ گیسودراز (سید محمد حسینی بندہ نواز گیسودراز ـــــ مترجم) نے پندرھویں صدی کے شروع میں حضورؐ کو ایک مختلف نقطۂ نظر سے ان لفظوں میں نذرانہ عقیدت پیش کیا:

ترجمہ: صبح کی آمد! ـــــ یہ آپؐ کا نورانی چہرہ ہے

اور شام! یہ آپؐ کے سیاہ گیسوؤں کی پرچھائیوں کا نام ہے!

قرون وسطیٰ کے ترک شاعر عاشق پاشا اور ایران کے عظیم شعرا نے بھی موازنہ کرنے کے اس رجحان کو برقرار رکھا ہے ـــــ اور ہندوستان کے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفرؔ نے بھی اپنی ایک اردو نعت میں کہا ہے:

والیل تیرے گیسوئے مشکیں کی ہے ثنا
والشمس ہے ترے رخِ پُر نور کی قسم

بھارت اور پاکستان کی نعتیہ شاعری میں یہ روایت آج بھی زندہ ہے!

جس طرح سنائیؔ کی عظیم مثنوی حدیقۃ الحقیقہ بعد کی صوفیانہ اور نصیحت آموز فارسی شاعری کے لیے ایک نمونہ بن گئی، اسی طرح حضورؐ کی تعریف و تحسین میں سنائیؔ کے اشعار نے وہ بنیادی نظریات متعارف کرائے جن کی مستقبل کی صوفیانہ شاعری میں اپنے اپنے انداز میں تشریح کی گئی۔ قرآن کریم کی ۹۳ ویں سورہ الضحیٰ کی تفصیلی اور بسا اوقات حیرت انگیز تفسیر کے علاوہ ان کے ضخیم دیوان میں کئی اور نعتیں بھی شامل ہیں۔ ان نعتوں میں ایک حدیث مبارکہ کی بنیاد پر (جس میں آں حضرتؐ نے فرمایا ہے کہ آسمان میں جبریلؑ اور میکائیلؑ اور زمین پر ابوبکرؓ اور عمرؓ میرے نائب ہیں) رسول کریمؐ کو، جو ہر عقیدت مند کے لیے کشش کا باعث ہیں، اس طرح خراج تحسین پیش کیا گیا ہے:

ترجمہ: آسمان میں جبریل اور میکائیل

اور زمین پر عمرؓ اور صدیقؓ جیسے خدمت گار موجود ہیں

زمین پر دونوں نائب پہلے دو خلفا حضرت ابوبکرؓ اور جناب عمرؓ ابن الخطاب ہیں۔ سنائیؔ کی نظموں میں ان خلفا کی زبانی نبی کریمؐ کی مدح وستائش کی گئی ہے۔ بعد میں آنے والے سنی شاعروں کے نعتیہ کلام میں ان خلفائے راشدینؓ کو رسول اللہؐ کے سب سے وفادار دوست اور معاون قرار دیا گیا ہے۔ یہ اندازِ فکر رومیؔ اور جامیؔ کے پرتخیل شعروں سے ہوتا ہوا پٹھانوں اور سندھیوں کی لوک شاعری میں سرایت کر گیا بلکہ اردو کے دکھنی شعرا نے بھی، جو غالب شیعہ ماحول میں رہتے تھے، اپنی رزمیہ نظموں کی تعارفی نعتوں کے سلسلے میں پہلے خلفاؓ کا اکثر ذکر کیا ہے البتہ بعض اوقات حضرت علیؓ کے لیے خصوصی مقام متعین کیا گیا ہے۔

سنائیؔ کے شعری تخیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تاریخی حقیقت پر زیادہ توجہ نہیں دیتے اور اپنا سارا زورِ قلم نعتیہ شاعری پر صرف کر دیتے ہیں اور اس نصب العین کے لیے وہ پورے ذخیرہ الفاظ اور صوفیانہ اور افسانوی خیالات کو بھی نعتوں میں شامل کر لیتے ہیں۔ کیا یہ نبی کریمؐ کی ذات گرامی نہیں جن کے لیے یہ کائنات تخلیق کی گئی تھی اور کیا یہ آپؐ کا اسم گرامی نہیں جس کی طاقت سے تمام چیزیں معجزانہ طور پر حرکت میں ہیں؟

ترجمہ: میں نے ہوا سے پوچھا: ''تم سلیمانؑ کے حکم کی تعمیل کیوں کرتی ہو؟''

اس نے کہا: ''اس لیے کہ احمدؐ کا نام ان کی مہر پر کندہ ہے''

یہ صرف حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اسم گرامی کی برکت اور طاقت ہے کہ جن، ہوا، سمندر اور

جانور حضرت سلیمانؑ کے مطیع تھے، یہ رسول کریمؐ کی عظمت کی علامت ہے کہ خدا نے قرآن مجید میں آپؐ کے نام کی قسم کھائی ہے، یہ نام پوری کائنات کی وجہ بقا اور تمام مخلوقات کا آفتاب ہے۔ (خدا نے یہ قسم قرآن پاک کی پندرھویں سورہ الحجر کی ۷۲ ویں آیت میں لعمرک (تیری عمر کی قسم) کہہ کر کھائی ہے۔ اس نظریے کا حوالہ رضی نے بھی The Path of God's Bondsmen, p.406 میں دیا ہے۔ صوفی شاعروں نے حضورؐ کے خصوصی مقام کی وضاحت کرنے کے لیے اکثر اس نظریے کا ذکر کیا ہے)۔

سنائی نے حدیقۃ الحقیقہ میں پورا تیسرا باب اس سوال کے لیے وقف کیا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دوسرے تمام پیغمبروں پر کیوں ترجیح ملی ہے چناں چہ انہوں نے آں حضرتؐ کی عظمت کو انوکھے اور منفرد انداز میں ثابت کیا ہے:

ترجمہ: آپؐ کی مدح وستائش کے لیے وقت کی اقلیم سے

جمعۃ المبارک، شب برأت، لیلۃ القدر اور عیدالاضحیٰ کے تہوار مقرر ہوئے

اور مکاں کی کوکھ سے خمیدہ و بلند قامت

مکہ، یثرب (مدینہ)، غارِ حرا اور حرم عالم وجود میں آ گئے

مسلمان جمعۃ المبارک کو اجتماعی نماز ادا کرتے ہیں اور لیلۃ القدر وہ رات ہے جب قرآن حکیم پہلی مرتبہ حضورؐ پر نازل ہوا تھا۔ یہ رات عام طور پر ستائیسویں رمضان کو منائی جاتی ہے (سورہ القدر)۔ اس رات کو شب قدر بھی کہتے ہیں جس کے معنی اندازہ اور فیصلہ کرنا بھی ہیں۔ اس میں سال بھر کے لیے فیصلے کیے جاتے ہیں اس لیے اسے لیلۃ الحکم بھی کہا جاتا ہے۔ عیدالاضحیٰ کے موقعے پر قربانی کی جاتی ہے اور مسلمان فریضہ حج ادا کرتے ہیں۔ شب برأت شعبان کے مہینے میں چودھویں کی رات ہے جس میں رسول کریمؐ فاتحانہ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تھے۔ یہ تمام واقعات حضورؐ کی خاطر رونما ہوئے۔ اسی طرح مقدس شہر مکہ اور مدینہ، کوہ حرا پر غار، جہاں آں حضرتؐ پر پہلی وحی نازل ہوئی تھی اور خانہ کعبہ کی تکریم وتوقیر صرف حضورؐ کی وجہ سے قائم ہے۔ سنائی نے صوفیانہ روایت کی پاسداری کرتے ہوئے اس نظریے کی توثیق کی ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) موجودات سے پہلے موجود تھے:

ترجمہ: احمدؐ کی ظاہری صورت آدمؑ سے پیدا ہوئی لیکن حقیقت میں

آدمؑ ہی احمدؐ سے ظاہر ہوئے تھے

واقعہ یہ ہے کہ پہلے انسان اور پہلے پیغمبر (آدمؑ) بھی صرف حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور ازل کا پرتو ہیں۔

سنائی چوں کہ درباری قصیدہ گو شاعر تھے اس لیے اس پس منظر کی بنا پر انہوں نے ایسے جرأت مندانہ ذو معنی الفاظ اور مبالغہ آرائی سے پورا کام لیا ہے جسے وہ رسول کریمؐ کی ستائش سے پہلے دنیاوی شخصیات کی مدح کے لیے استعمال کرتے رہے تھے:

ترجمہ: جو لوگ آپؐ کو لا (نہیں) کہتے ہیں ان کی شکل لا کے کوزہ پشت حرف جیسی ہو جاتی ہے

لیکن خدا کا انعام یافتہ شخص وہ ہے جس نے آپؐ کو نعم (ہاں) کہا ہے

سب سے اہم بات یہ ہے کہ سنائی نے حضور رسالت مآبؐ کے اس فیصلہ کن کردار کو اجاگر کیا ہے جو آپؐ نے اسلام اور کفر کے درمیان خط امتیاز کھینچنے میں ادا کیا ہے:

ترجمہ: اگر خدا نے آپؐ کو ''تمام جہانوں کے لیے رحمت'' کے نام سے پکارا نہ ہوتا

تو پوری دنیا میں صمد اور صنم کے درمیان فرق کرنے والا کون ہوتا؟

سنائی کے ڈیڑھ سو برس بعد بصیریؒ نے تقریباً یہی نظریہ پیش کرتے ہوئے کہا:

ترجمہ: اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپؐ کا علم نہ ہوتا

تو کوئی شخص یہ نہ جانتا کہ نیکی کیا ہے اور برائی کیا!

اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر رسول اللہؐ نہ ہوتے تو خدا کی وحدانیت کو ماننے والوں اور جھوٹے اور عارضی معبدوں کے پجاریوں کے درمیان فرق کی وضاحت کون کرتا؟ آپؐ ہی وہ پیغمبرؐ ہیں جنہوں نے شریعت کا دوٹوک قانون نافذ کیا ہے اور:

ترجمہ: جب تک مذہب کے چمن میں آپؐ کے نام کی بادِ سحر نہ چلے

اس وقت تک مذہب کی شاخ پروان نہیں چڑھتی اور نہ ہی سنت کی جڑیں پھوٹتی ہیں

یہ حضورؐ ہی کی ذات اقدس ہے جنہوں نے وہ حدود و قیود متعین کی ہیں جن پر مسلمانوں کو ہر حال میں کاربند رہنا اور جن کے اندر رہ کر ایک تاریخی مذہب کی حیثیت سے اسلام کو دنیا میں روشناس کرانا ہے۔ بعد کی شاعری اور حضرات صوفیہ، خاص طور پر سنجیدہ اور متین صوفیانہ فکر رکھنے والوں کے صحیفوں میں اس نظریے کو بار بار دہرایا گیا ہے۔

سنائی اگلی صدیوں کے دوران فارسی میں فروغ پانے والی نعتیہ شاعری پر اس حیثیت سے بھی اثر انداز ہوئے ہیں کہ ان کی وجہ سے حضورؐ اور آپؐ پر نازل ہونے والی وحی اور فلسفے کی تعلیمات کے درمیان موازنہ کرنے کا رجحان پیدا ہو گیا۔ فلسفی حضرات ـــــ جو یونانی افکار کی پیروی کرتے تھے ـــــ راسخ العقیدہ مسلمانوں کی تنقید کا ہمیشہ نشانہ بنے ہیں چناں چہ سنائی اسی انداز فکر کی روشنی میں کہتے ہیں:

ترجمہ: ''رحمت للعالمین'' تمہارے لیے معالج بن کر آئے ہیں اور شفا بھی آپؐ ہی کے ذریعے آئی ہے

تم اِس اور اُس منحرف سے شفا کیوں تلاش کرتے ہو؟

حضورؐ کی سنت پر کاربند پیروکار شخص جس نجات اور شفا کا متلاشی ہے

وہ (ابن سینا کی دو کتابوں) النجات اور الشفا میں موجود نہیں

ابن سینا (بوعلی)، جو سنائی سے ٹھیک ایک صدی پہلے مشرقی ایران میں سرگرم تھا اور جس کی فلسفیانہ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر طب کی کتابیں نہ صرف دنیائے اسلام بلکہ قرون وسطٰی کے عیسائی یورپ میں بھی بے حد مقبول اور مشہور تھیں، تصوف کی ایک شاخ کے نزدیک عشق سے بے بہرہ اور عقلیت پسند فلسفی تھا (گوکہ اس کے فلسفے میں تصوف کے بعض عناصر شامل ہیں)۔ (ابن سینا کے تصوفانہ پہلو کے لیے دیکھیے کوربن کی کتاب Avicena and the Visionary Recital)۔ ابن سینا کے اس امیج کا ایک سبب یہ ہے کہ قرون وسطٰی کے عظیم عالم دین غزالی نے اپنی کتاب تہافۃ الفلاسفہ میں ابن سینا کے فکری نظام پر سخت نکتہ چینی کی ہے۔ غزالی کے ہم وطن سنائی نے چند عشروں کے بعد اس تنقید کو اپنی شاعری میں منتقل کر دیا۔ سنائی کے ایک سو سال بعد نبی کریمؐ نے خواب میں صوفی مجدالدین بغدادیؒ کو بتایا کہ ابن سینا نے آپؐ کے وسیلے کے بغیر حق تک پہنچنے کی کوشش کی تھی لیکن آپؐ نے اسے دھکا دے کر دور پھینک دیا جس کے نتیجے میں وہ دوزخ کی آگ میں گر گیا۔ (جامی: نفحات الانس صفحہ ۴۲۷)۔ یہ نظریہ تصوف کے رنگ میں رنگے راسخ الاعتقاد حلقوں میں بدستور موجود رہا کیوں کہ رسول کریمؐ کے فرمان کے مطابق شریعت خداوندی پر کاربند ہوئے بغیر حق تک رسائی ممکن نہیں جب کہ فلسفی لوگ اس نصب العین کے لیے عقلیت پسندی کی مختلف راہ اختیار کرتے ہیں۔ چند دہائیوں کے بعد اقلیم سخن میں سنائی کے جانشین فریدالدین عطارؒ نے، جن کا شعری مجموعہ تصوف کی دنیا کا گنجینہ ہے، سنائی کے فیصلے کی توثیق کرتے ہوئے اپنے مجموعے مصیبت نامے کے طویل تعارف میں لکھا:

ترجمہ: حقیقت میں عقل کل کی دو سو دنیائیں بھی

قرآن کریم کے حضورؐ سے ''قل'' (کہہ دیجیے) کے حکم کے سامنے ہیچ ہیں

ایک فلسفی سے بڑھ کر ہاشمی شریعت سے دور افتادہ کوئی شخص نہیں

شریعت تو آں حضرتؐ کے احکام پر عمل کرنے کا نام ہے، فلسفیوں کے سر پر خاک ڈالو!

قرآن کریم میں رسول اللہؐ کے لیے ''قل'' کا حکم تین سو سے زیادہ مرتبہ مذکور ہے۔ شمس الدین تبریزیؒ نے ان لوگوں کی سخت سرزنش کی ہے جن کا عقیدہ ہے کہ وہ حضورؐ کے وسیلے کے بغیر خدا تک پہنچ سکتے ہیں (جیسا کہ فلاسفر مبینہ طور پر کہتے ہیں)۔ چناں چہ شمس الدین تبریزیؒ کہتے ہیں: ''تم کہتے ہو مجھے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اب

مزید ضرورت نہیں رہی کیوں کہ میں خدا تک پہنچ گیا ہوں، لیکن خدا از محمدؐ مستغنی نیست۔ وہ یہ کیسے کر سکتا ہے کیوں کہ اس نے قرآن پاک کی ۲۵ ویں سورہ الفرقان کی ۵۱ ویں آیت میں کہا ہے: ''اگر ہم چاہتے تو ہر ہر بستی میں ایک ڈرانے والا بھیج دیتے۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر خدا کو واقعی کوئی اور پیغمبر بھیجنے کی ضرورت ہوتی تو وہ اسے مبعوث کر دیتا لیکن اپنے مقاصد کے لیے اسے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) ہی کافی ہیں اور اسے مزید پیغمبر بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

دو نسلوں کے بعد مولانا رومیؒ نے اس نظریے کو اپنے پسندیدہ معجزے کے ساتھ ملا کر اس طرح بیان کیا:

ترجمہ: جو فلسفی ''کھجور کے خشک درخت کا حضورؐ کے فراق میں رونے'' (حنانہ) کا انکار کرتے ہیں

وہ اولیا کے باطنی معنی سے بے خبر ہیں

رومیؒ نے حضورؐ سے مخاطب ہوتے ہوئے فلسفیوں کے بارے میں سنائیؒ اور عطارؒ سے بھی زیادہ سخت لب و لہجہ اختیار کیا ہے:

ترجمہ: اے کہ آپؐ کی ذات ''قل'' کے حکم کی شاہی راکب ہے

اے وہ کہ جن کی عقل کے سامنے آفاقی روح

اس شیر خوار بچے کی مانند ہے جو بچگانہ جہالت سے اپنی آستیں چباتا ہے

خود ہماری صدی میں یہ محمد اقبالؒ تھے جنہوں نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے ساتھ عشق اور اس عقل کے درمیان پرانے تضاد کو ایک مرتبہ پھر اپنی شاعری میں موضوع سخن بنایا ہے جس کا اولیں نمونہ بو علی سینا ہے اور جس کا مقدر ناکامی اور نامرادی ہے:

دل در سخن محمدی بند

اے پورِ علیؓ ز بو علی چند

ترجمہ: حضرت محمدؐ کی باتوں میں دل لگاؤ

اے علیؓ کی اولاد! بو علی (سینا) سے کب تک متاثر رہو گے

عطارؒ کی شاعری میں سنائیؒ کے کئی افکار اور تشبیہات شامل ہیں۔ بعض اوقات انہوں نے ان خیالات کو عمیق معانی پہنائے ہیں اور ان میں کئی نادر اجزا شامل کیے ہیں، اس کی ایک مثال حضورؐ کی وہ حدیث مبارکہ ہے جس میں آپؐ نے فرمایا ہے: ''انا احمد بلا میم'' (میں بغیر میم کے احمدؐ ہوں یعنی احد)۔ ممکن ہے کہ فارسی کے اس عظیم صوفی نے بعض خوابوں کو بھی اپنے کلام میں سمو دیا ہو! ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ رسول کریمؐ راہ حق کے متلاشی شخص کی چالیس

مرحلوں میں اعلیٰ ترین گائیڈ کی حیثیت سے رہنمائی کرتے ہیں، عطارؔ نے اپنی کتاب مصیبت نامہ میں ان چالیس مرحلوں کے لیے چالیس باب باندھے ہیں جن میں ہر مرحلے کی شاعرانہ توضیح کی گئی ہے۔ یہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی ہیں جو راہ حق کے مسافر کو "اس کی روح کے سمندر" کا وہ راستہ دکھاتے ہیں جہاں وہ آخرکار اپنے پروردگار کو پالیتا ہے جس کی تلاش میں وہ اس سے پہلے آسمان اور زمین میں عبث سرگرداں رہا ہے۔ عطارؔ کی تمام رزمیہ نظموں کے تعارف میں نبی کریمؐ اور آپؐ کے سفر معراج کے بارے میں رنگین تفصیلات بیان کی گئی ہیں (دیکھیے نواں باب) اور ان کے کلام میں نور محمدؐ نے سنائیؔ کے مقابلے میں زیادہ اہم رول ادا کیا ہے۔ عطارؔ کہتے ہیں:

ترجمہ: دونوں دنیاؤں میں جو بھی چمک دمک اور نکھار ہے
وہ محض حضورؐ کے دل کا عکس ہے

عطارؔ نے نور کے اس ستون کے نظریے پر بھی اظہار خیال کیا ہے جو لازمانی سے پہلے خدا کے حضور سجدہ ریز ہوگیا تھا۔ مینارۂ نور کا نظریہ سب سے پہلے سہل التستریؒ نے نویں صدی کے آخر میں پیش کیا تھا اور عطارؔ نے منطق الطیر کے تعارفی پیروں میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نور دنیا اور اس کے باسیوں کی تخلیق سے پہلے نور کے ایک ستون کی صورت میں عالم وجود میں آچکا تھا:

ترجمہ: عرش اور کرسی آپؐ ہی کا نور ہیں
جبریلؑ، روحانی قوتیں اور مقدس ارواح
اس دنیا اور اگلی دنیا کا دارومدار آپؐ ہی کی ذات پر ہے
اور یہ دنیا آپؐ کے وجود کے نور کی وساطت سے خوش وخرم ہے

عطارؔ کہتے ہیں کہ نبی کریمؐ تمام پیغمبروں کے طویل سلسلے کی آخری کڑی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ آپؐ حروف تہجی کو نہیں پڑھ سکتے، اس کے باوجود آپؐ لوحِ خداوندی کو پڑھ لیتے ہیں کیوں کہ ایک اُمی (ان پڑھ) ہونے کے ناتے حضورؐ خود تو خاموش رہتے ہیں لیکن آپؐ اللہ کے ذریعے گفتگو کرتے ہیں (عطارؔ: الٰہی نامہ صفحہ ۱۱ نیز شمل As Through a Veil) بلکہ عقل بھی صرف آں حضرتؐ کی روح پرفتوح کا عکس ہے اور:

ترجمہ: جنت آپؐ کے پیالے کا ایک گھونٹ ہے
دونوں جہان آپؐ کے اسم گرامی کی دو میمیں ہیں

عطارؔ کا علم تصوف بھی اسی قدر گہرا ہے جس قدر ان کی شاعری! ان کا کلام قرون وسطیٰ کے دوسرے فارسی شاعروں کے مقابلے میں گہرے غور وخوض کا متقاضی ہے کیوں کہ اگرچہ حضور سرور کائناتؐ کی مدح میں کہا گیا سارا نعتیہ کلام تقریباً

ایک جیسا اور ہر جگہ پایا جاتا ہے لیکن عطاؔر نے حضورؐ کی حیات طیبہ کے بارے میں جن مخصوص پہلوؤں کا تذکرہ کیا ہے، اس میں حیرت انگیز طور پر مختلف رنگوں سے مزین تصویر ابھر کر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔

سنائیؔ اور عطاؔر کے بعد مولانا جلال الدین رومیؔ کے کلام میں نبی کریمؐ کو ''سالار کارواں مصطفیٰؐ'' کے لقب سے پکارا گیا ہے لیکن ان کے کلام کو سمجھنا عطاؔر سے بھی زیادہ مشکل ہے کیوں کہ ان کا کلام ان کے صوفی محبوب شمس الدین تبریزیؒ ''آفتاب دین'' سے اس طرح جڑا ہوا ہے کہ اسے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا کے نزدیک شمس تبریز ''حضور پاکؐ کے اسرار کے سچے ترجمان اور حقیقت محمدیہ سے پوری طرح آگاہ ہیں:

ترجمہ: بتایئے اس دنیا میں احمد رسول اللہ کا ہمدم اور ہمراز کون ہے؟

شمس تبریز جو ''عظیم انسانوں میں سے ایک ہیں!''

کیوں کہ

جب آپ پڑھتے ہیں تو آفتاب کو دیکھتے ہیں

''والصبح اذا اسفر'' (قسم ہے صبح کی جب کہ روشن ہو جائے)

اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ شمسؒ ''محبت کی وجہ سے مصطفیٰؐ کے ساتھ اکٹھے سانس لیتے ہیں'' جس کی وجہ یہ ہے کہ رسول پاکؐ کا اصل جو ہر محبت ہے ـــــ وہ اولیں محبت جس کی بنا پر خدا نے حضورؐ کو لولاک'' بلکہ آپؐ کے لیے...... '' کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

رومیؔ کی غزلوں میں جو مفرد اشعار شامل ہیں، ان میں رسول اللہؐ کے حیرت انگیز محاسن، نور اور آپ کی شان و شوکت کا تذکرہ کیا گیا ہے:

ترجمہ: درویشوں کو آپ کی ''رحمت للعالمینی'' سے سکھ اور چین ملتا ہے

ان کے چوغے چاند کی طرح روشن اور دوشالے گلاب کے پھولوں کی مانند مہکتے ہیں

رومیؔ کہتے ہیں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مکہ سے مدینہ منورہ ہجرت تصوفانہ سفر کا نمونہ ہے کیوں کہ اپنے گھربار کو چھوڑ کر مسلسل سفر کرنے سے ہی انسان کی روح پاک صاف ہو کر تزکیہ نفس کے نصب العین سے ہم کنار ہو سکتی ہے۔ مولاناؔ نے ''محمدؐ کی شراب'' کا بھی اکثر ذکر کیا ہے ـــــ وہ جائز اور مباح شراب جو بنی نوع انسان کو روحانی وجدان کے ذریعے القا اور الہام سے روشناس کرے، یہ شراب تبریز کے دروازے پر مل سکتی ہے۔ رسول کریمؐ نہ صرف ساقی بلکہ جام و قدح بھی ہیں جس میں خدائی عشق و محبت کی شراب موجود ہے ـــــ یہ کلام الٰہی میں حضورؐ کے امی (خالی برتن) ہونے کے وصف کی جانب اشارہ ہے (دیکھیے چوتھا باب)۔ اور آپؐ ایک بہت بڑے کیمیاگر ہیں جن میں

انسان کی پیتل نما سفلہ فطرت کو خالص سونے میں ڈھالنے کی استعداد موجود ہے۔ عطار کی طرح رومی بھی ''احمدؐ بلا میم'' کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ایک نظم میں، جو عربی اور فارسی کا امتزاج اور قرآنی تلمیحات سے مملو ہے، وہ نجد کی نسیم سحر سے التماس کرتے ہیں کہ وہ محبوب پیغمبرؐ کو ان کا سلام پہنچا دے۔ رومی کی عظیم مثنوی، جو کوئی ۲۶ ہزار مصرعوں پر مشتمل نصیحت آموز نظم ہے، حضور سرور کائناتؐ سے متعلق کہانیوں کا حقیقی اور بے مثل خزانہ ہے، انہوں نے آں حضرتؐ کے خاتم النبیین کے رول کی بھی مدح سرائی کی ہے (اور تکرار لفظی کی صنعت کو کمال خوبی کے ساتھ استعمال کیا ہے)۔ رومی نے اپنے کلام میں کئی مشہور حدیثوں کا بھی حوالہ دیا ہے اور طویل اور بعض اوقات نہایت حیرت انگیز قصوں کے ذریعے ان کی تشریح کی ہے۔ آں حضرتؐ کے ساتھ ان کی گہری عقیدت اور گرم جوشی ۶۵۰ سال گزرنے کے باوجود ماند نہیں پڑی اور ''آپؐ کی ذات اقدس کے ساتھ محبت ہی ان کا مذہب ہے۔'' رومی کے کلام میں اس عقیدت کی واضح جھلک نظر آتی ہے، ایک بہتر دنیا کی جانب شاہراہ پر ایک روحانی پیشوا کے رول کی مدح وستائش ان کے ہر ہر شعر سے آشکار ہے۔

افلاکی نے بھی مناقب العارفین میں رومی اور شمس تبریزؒ کی حضورؐ کے ساتھ والہانہ محبت اور عقیدت کا حوالہ دیا ہے جس کا تقاضا ہے کہ اس موضوع پر باضابطہ طریقے سے اظہار خیال کیا جائے۔ شمس تبریزؒ کی طرح رومی بھی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلے کے بغیر خدا تک رسائی ممکن نہیں کیوں کہ صرف رسول کریمؐ کی ذات اقدس ہی عقیدت مند مسلمانوں کو خدا تک پہنچا سکتی ہے:

ترجمہ: جب مصطفیؐ کی ظاہری شکل وصورت معدوم ہوگئی
تو دنیا نے ''خدا کو سب سے عظیم اور برتر'' مان لیا

''خوب جان لو کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی ہادی و رہنما ہیں اور جب تک کوئی شخص نبی کریمؐ تک نہیں پہنچتا، وہ ہم تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا۔'' یہ وہ الفاظ ہیں جو خدا کی طرف سے رومی پر القا ہوئے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام انوار و اکرام کی بارش سب سے پہلے حضورؐ پر ہوتی ہے جس کے بعد آپؐ ہی انہیں دوسرے لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ (Arberry: Discourses of Rumi, p.232)۔ ''چناں چہ یہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ کی ذات اقدس بنیاد ہے...... موجودات کی ہر چیز، عظمت و سرفرازی، عجز وانکسار، منصب اور سربلندی، یہ سب حضورؐ کے اختیار اور آپ کا سایہ ہیں کیوں کہ ان سب خصائص کا اظہار آپؐ کی ذات کے ذریعے ہوا ہے۔'' (Arberry: Discourses of Rumi, p.117)۔

لیکن رومی رسالت کے منصب کی مشکلات کا بھی اعتراف کرتے ہیں اور اس واقعے کی جانب اشارہ کرتے ہیں جب ایک مرتبہ آں حضرتؐ نے ٹھنڈی سانس لے کر فرمایا تھا: ''اے کاش! محمدؐ کا خدا محمدؐ کو پیدا نہ کرتا!'' مولانا رومی حضورؐ

کے اس قول کی صداقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''خدا کے ساتھ کامل اتحاد کے مقابلے میں ایک پیغمبر ہونا ایک بوجھ اور مصیبت نظر آتی ہے۔'' (Arberry: Discourses of Rumi, pp 211-12)۔ ایک اور مکالمے میں وہ یہ قصہ بیان کرتے ہیں:

وہ (خدا) سب سے پہلے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ خود مشغول رہا جس کے بعد اس نے آپؐ کو حکم دیا: ''آپؐ انسانوں کو بلائیے، ان کے ساتھ مشاورت اور ان کی اصلاح کیجیے!'' اس پر حضورؐ رو پڑے اور آہ و فغاں کرتے ہوئے کہا: ''اوہ میرے خدایا! میں نے کیا گناہ کیا ہے؟ آپ مجھے اپنی جناب سے کیوں دور کرتے ہیں؟ مجھے اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں چاہیے!'' لیکن خدا نے یہ کہتے ہوئے آپؐ کی تشفی فرمائی: ''آپؐ انتہائی مصروفیت میں بھی میرے ساتھ ہوں گے۔ آپؐ کسی بھی معاملے کی طرف متوجہ ہوں گے، آپؐ میرے ساتھ ہی وابستہ رہیں گے۔'' (Arberry: Discourses of Rumi, p.78)۔

یہاں پیغمبرانہ طرزِ عمل کی ''دوسری سنجیدگی اور متانت'' کا بڑی خوب صورتی کے ساتھ حوالہ دیا گیا ہے۔

جس کسی نے مولویہ درویشوں کے صوفیانہ رقص سے پہلے مترنم انداز میں نعت شریف سنی ہے، اسے اس بات کا مکمل ادراک ہو جائے گا کہ رومیؔ کو رسول کریمؐ کے ساتھ، جن سے وہ یوں مخاطب ہوتے ہیں، کس قدر گہری عقیدت اور محبت ہے:

یا حبیب اللہؐ رسول اللہؐ یکتا توئی

وہ آں حضرتؐ کو ''پیغمبروں کی آنکھوں کا نور'' قرار دیتے ہیں جنھوں نے معراج کی رات ۹ سبز سیاروں پر قدم مبارک رکھے تھے۔ اس کے بعد وہ نبی کریمؐ سے التماس کرتے ہیں:

ترجمہ: اے خدا کے پیغمبرؐ! آپؐ جانتے ہیں کہ آپؐ کی امت کس قدر نااہل اور نکمی ہے ——
آپؐ کی ذات گرامی ہی ان بے بس، کمزور و ناتواں لوگوں کی ہادی و رہنما ہے
لیکن پیغمبر خداؐ میں یہ خصائص بھی موجود ہیں:

ترجمہ: باغ نبوت کے صنوبر اور روحانی اسرار کی بہار
شریعت کے سبزہ زار کا غنچۂ گلاب اور پُروقار عندلیب آپؐ ہی ہیں

آخر میں شمس تبریزؒ سے امداد کی درخواست کی جاتی ہے جنھیں رسول مقبولؐ کی نعت از بر ہے جو خدائے بزرگ و برتر کے منتخب پیغمبرؐ ہیں۔ (Heper: Mevlevi Ayinleri, pp.1-4)

تیرہویں صدی میں مولانا رومیؔ کے ایک ہم عصر فخر الدین عراقیؔ ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کے ۲۵ برس جنوبی

پنجاب کے شہر ملتان میں سہروردی سلسلے کے بزرگ بہاالدین زکریا ملتانی کی چوکھٹ پر گزارے۔ انہیں نعت لکھنے کی تحریک مدینہ منورہ میں ملی چناں چہ انہوں نے نہایت پرشکوہ الفاظ میں کہا ہے:

ترجمہ: کل جہانوں کے لیے رحمت، اللہ کے پیغمبرؐ

جن کی دہلیز پر جبریلؑ نے کہا: میں آپؐ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں

''پس اس نے اللہ کے بندے کو وحی پہنچائی جو بھی پہنچائی''...... (سورہ النجم آیت ۱۰)

ازل سے بھی پہلے آپؐ سے خطاب کے لیے یوں لکھوایا گیا: ''قسم ہے چاشت کے وقت کی!''

(سورہ الضحیٰ آیت ۱)۔

(معراج کا) مقررہ وقت آنے پر نقارہ بجایا گیا اور خدا نے کہا:

''پاک ہے وہ اللہ تعالیٰ جو اپنے بندے کو رات ہی رات میں لے گیا۔'' (سورہ بنی اسرائیل آیت ۱)۔

عراقیؔ نے بے پناہ لفاظی سے کام لیتے ہوئے واضح کیا ہے کہ خدا نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے ''چاشت کی قسم'' نور کی تخلیق کے لمحے پر کھائی تھی اور سورہ النجم کی پہلی آیت، جس میں آپؐ کے سفر معراج کا حوالہ دیا گیا ہے، زمین پر حضورؐ کی حیات طیبہ کے دوران نوبت بجا کر اعلان کرنے کے مترادف ہے۔ پھر دوسرے شاعروں کی طرح عراقیؔ بھی دن کی روشنی اور رات کے درمیان موازنہ کرتے ہیں جو حضورؐ کے جمال وجلال کا پرتو ہیں، آپؐ خدا کے دن اور مادی دنیا کی تاریکی کے درمیان کھڑے ہیں، اصل میں آپؐ ہی موجودات کا آفتاب ہونے کے باوجود ''رات کو سفر کرتے ہیں۔''

عراقیؔ کے قصائد فارسی اسلوب کی نمائندہ مثالیں ہیں جن سے رعایت لفظی اور لطیف خیالات کی عکاسی ہوتی ہے۔ یہ شستہ اور منفرد طرز بیان ایران کے غیر صوفی شاعروں، خاص طور پر خاقانیؔ کے دور میں نقطہ عروج پر پہنچ گیا۔ بارہویں صدی میں کوہ قاف کا یہ شاعر نہایت عالم فاضل شخص تھا، خدا نے اسے فصاحت و بلاغت کی دولت سے ناقابل یقین حد تک مالا مال کر رکھا تھا، اسے اس جوہر کے اظہار پر کامل عبور حاصل تھا چناں چہ اس نے نبی کریمؐ کی مدح سرائی کے لیے بے شمار پرشکوہ نعتیں لکھیں۔ خاقانیؔ کے نزدیک آں حضرتؐ کی ذات اقدس ''مجسم دین'' ہے۔ حضورؐ کے ساتھ کامل عقیدت میں ڈوبے ہوئے اشعار لکھنے پر انہیں ''حسان عجم'' کا لقب ملا۔ خاقانیؔ نے مکہ معظمہ میں حج اور مدینہ منورہ میں حضورؐ کے روضہ مبارک کی زیارت کے بارے میں جو تفصیلات لکھیں، وہ بے حد اثر انگیز اور وجد آور لیکن فارسی میں لکھے جانے والے مشکل ترین قصیدے ہیں۔ انہوں نے کئی پرمعنی ترکیبیں اور اصطلاحیں ایجاد کیں۔ خاقانیؔ نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور خانہ کعبہ اور حضورؐ کے چہرہ اقدس کے سیاہ تل اور کعبے کے

حجر اسود کے درمیان، جسے ہر مسلمان حج کے دوران چومنے کا آرزومند ہے، موازنہ بھی کیا ہے۔ چناں چہ خاقانی کے دور سے حضورؐ اور کعبے اور آپؐ کے سیاہ تل اور حجر اسود کے درمیان موازنہ کرنے کا رجحان فارسی شاعروں کا پسندیدہ موضوع بن گیا، مثال کے طور پر سولہویں صدی کے ہندوستان کے مولانا قاسم کاہی کہتے ہیں:

ترجمہ: احمدؐ وہ کعبہ ہیں جن کی قربت کے لیے ہم سب کوشاں ہیں

حجر اسود یقیناً حضورؐ کے رخ انور کا سیاہ تل ہے

اسلامی قرون وسطٰی کے شاعروں میں، جو خصوصی طور پر قصیدہ گو یا صوفی نہیں تھے، سعدیؔ (وفات ۱۲۹۲عیسوی) اپنی لطیف، واضح اور شفاف زبان کی وجہ سے فارسی پڑھنے والوں کے پسندیدہ شاعر رہے ہیں۔ گو کہ ان کی نعتیہ نظموں کی تعداد قدرے مختصر ہے، اس کے باوجود فارسی ادب ان کی اس نظم کا ممنون احسان ہے جسے پورے عالم اسلام، خاص طور پر ہندوستان میں بہت پڑھا جاتا اور اس سے محبت کی جاتی ہے۔ یہ نظم سعدیؔ کی مثنوی بوستان کے تعارفی حصے میں شامل ہے اور اس کے لیے نہایت سادہ لیکن پرشکوہ الفاظ اور آسانی سے یاد ہو جانے والے متقارب قافیے کا انتخاب کیا گیا ہے:

نسیم، قسیم، جسیم، وسیم

ترجمہ: حسین وجمیل، دل کش ودل ربا، نفیس اور عالی ظرف

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، یہ الفاظ اسلامی نام رکھنے کے نظام پر بھی اثر انداز ہوئے ہیں۔ اس رباعی کے پہلے شعر میں سعدیؔ نے حضورؐ کو ان لفظوں سے مخاطب کیا ہے:

شفیع، مطاع، رسول، کریم

ترجمہ: شافع محشرؐ، جس کی اطاعت کی جائے، خیر خواہ اور کریم النفس

مطاع سے مراد ہے ''جس کی اطاعت کی جائے'' (سورہ التکویر آیت ۲۱)۔ رسول کریمؐ کے لیے یہ ایک کامل فطری لقب ہے کیوں کہ قرآن حکیم میں مسلمانوں کو ''خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرنے کا'' حکم دیا گیا ہے۔ لیکن سعدیؔ سے بھی تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے غزالیؔ نے اپنی تصوفانہ کتاب مشکوٰۃ الانوار میں اس اصطلاح کو استعمال کیا ہے جہاں اس لقب سے مراد، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، وہ پراسرار قوت ہے جسے عام طور پر اولیں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے منسوب کیا جاتا ہے۔ سعدیؔ کی طرف سے اس اصطلاح کو استعمال کرنے سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ مطاع کے لفظ کا حضورؐ کے لقب کی حیثیت سے استعمال بہت عام رہا ہوگا اور اس کے اضافی اثرات سے قطع نظر جامیؔ جیسے کئی دوسرے شاعر بھی نعتیہ کلام میں اس لفظ کو باقاعدگی کے ساتھ استعمال کرتے رہے ہیں۔

ایک اور شاعر، جس نے مطائع کی اصطلاح استعمال کی، وہ امیر خسروؒ تھے۔ اگرچہ وہ بنیادی طور پر عموماً درباری شاعر سمجھے جاتے ہیں لیکن شمالی ہندوستان سے تعلق رکھنے والے عظیم صوفی معلم، دہلی کے نظام الدین اولیاؒ کے ساتھ ان کی قریبی نسبت تھی اور انہوں نے امیر خسروؒ کو تصوف کی زبان سکھا دی تھی۔ چناں چہ امیر خسروؒ نے اپنی رزمیہ نظموں کے تعارفی پیروں میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے کئی شاندار اور عمدہ القاب استعمال کیے ہیں (دیکھیے چھٹا باب)، مثال کے طور پر انہوں نے اپنی کتاب مجنوں لیلیٰ کے شروع میں کہا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

ترجمہ: پیغمبروں کی سلطنت کے شہنشاہ

اور قرطاس جاہ وحشمت کے طغریٰ ہیں

غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کے حامل امیر خسروؒ کے مطابق آسمان میں چاند بھی نبی کریمؐ کی عظمت اور بڑائی کی گواہی دیتا ہے، یہ پہلے نصف دائرے میں حرف ن کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور پھر حضورؐ کے ادب اور احترام میں ایک دائرے کی صورت میں حرف م بن کر فارسی کا لفظ نم یعنی شبنم بن جاتا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساگر میں چاند کی حیثیت شبنم کے ایک قطرے سے زیادہ کچھ نہیں اور فرشتوں کے بال و پر آں حضرتؐ کے آستانے پر جانے والی شاہراہ پر جھاڑو سے صفائی کرتے ہیں۔ امیر خسروؒ اس حدیث مبارکہ کا بھی حوالہ دیتے ہیں جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے: ''میں بغیر میم کے احمد ہوں۔'' یہ ایک ایسا نفیس موضوع ہے جسے امیر خسروؒ زندگی بھر دہراتے رہے ہیں اور ان کے بعد کی صدیوں میں اسلام کی مشرقی اقلیم میں اس کا بار بار ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد امیر خسروؒ گول میم کو مہر نبوت قرار دیتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جو شخص اس مقدس میم کو کالر کی طرح اپنی گردن میں حمائل کرلے گا، اس حلقہ دار قمری کی طرح، جس کی گردن میں طوق ہو، وہ مکمل اعتماد اور پختہ یقین کے ساتھ گھومے پھرے گا۔ عربی اور فارسی میں ''فاختہ کے گلے کے ہار'' کا استعارہ اس نہایت قریبی تعلق کو ظاہر کرنے کی غرض سے استعمال کیا جاتا ہے جسے ختم یا منقطع نہیں کیا جا سکتا (ٹھیک اسی طرح جیسے فاختہ کے گلے کے گرد پروں کا ہالہ اس کے بال و پر کا حصہ ہوتا ہے)۔

لیکن امیر خسروؒ وجدان کی ان بلندیوں کو نہ چھو سکے جو رزمیہ شاعری میں ان کی مثالی شخصیت نظامیؒ کو حاصل تھی۔ نظامیؒ ایران کے غیر صوفی مصنفوں میں رسول کریمؐ کے سب سے بڑے قصیدہ گو تھے چناں چہ انہوں نے حضورؐ کی تخلیق (آفرینش) کو کمال مہارت کے ساتھ آفرین (تعریف وتوصیف) کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے۔ اس طرح بعد کی فارسی شاعری میں اس ترکیب کو قبول عام حاصل ہو گیا۔

پندرھویں صدی کے شاعر اور سوانح نگار جامیؒ نعتیہ شاعری کے شعبے میں غالباً سب سے کثیر الکلام مصنف ہیں

جنہوں نے حقیقت محمدیہؐ کے اسرار پر گہری تحقیق کی ہے اور اس غرض کے لیے عمیق مذہبی جذبات کا اعلیٰ فنی مہارت کے ساتھ اظہار کیا ہے۔ اس سے پہلے ہم کئی مرتبہ ان کے انوکھے اور اثر انگیز الفاظ کے معنی اور ماہیت کا ذکر کر چکے ہیں۔ محمد اقبالؒ نے ان کی نعتیہ شاعری کو بے حد سراہا ہے جس میں پرشکوہ قصیدے، محبت بھری غزلیں اور سات عظیم رزمیہ نظموں کے طویل تعارفی ابواب شامل ہیں۔ ایک تعارفی مضمون میں انہوں نے کم سے کم پانچ نعتیں لکھی ہیں۔ ایک نعت میں انہوں نے حضور رسالت مآبؐ کے سفر معراج کی تابناک لفظوں میں تمثیل پیش کی ہے۔ لیکن ان کی ایک اور نظم میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا لفظ ردیف کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ جامیؔ نے یہ نظم سعدیؔ کے اس سادے قصیدے سے متاثر ہو کر لکھی ہے جس میں یہی ردیف استعمال ہوئی ہے:

ترجمہ: چاند حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حسن و جمال تک نہیں پہنچ سکتا

صنوبر میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جیسی قد و قامت کی خوبی کہاں......

جامیؔ نے عربی میں یہ بیت بھی لکھا ہے:

ترجمہ: مجھ میں حضورؐ کی کاملیت کی مدح و ستائش کرنے کی طاقت نہیں ـــــ

خدایا! محمدؐ اور آپؐ کی آل پر رحمتیں نازل فرما!

نظم کے پہلے حصے کا آغاز استفہامیہ انداز میں یوں کیا گیا ہے:

ترجمہ: پانی کا چشمہ کیا ہے؟ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاؤں کی دھول!

اور ''مضبوط رسی''؟ یہ حضورؐ سے والہانہ عقیدت کے بندھن کا نام ہے

اس کے بعد وہ روایتی اسلوب میں اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہیں:

ترجمہ: آپؐ کی تعریف کے حدود کو خدا کے سوا کون جانتا ہے؟

میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ثناخوانی کرنے کی جرأت کرنے والا کون ہوں؟

دوسری غزل میں جامیؔ رسول کریمؐ کی ازل سے موجود عزت و تکریم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ترجمہ: کائنات اور موجودات کے ورق پر جو بھی لکھا گیا ہے

وہ محض محمدؐ کے صحیفے کا انتخاب ہے

اس کے بعد شاعر شطرنج کے استعارے کو استعمال کرتا ہے:

ترجمہ: آپؐ کو شاہ کے لقب سے نہ پکارو کیوں کہ جو کوئی شطرنج کے میدان میں

محمدؐ سے مات نہیں کھاتا وہ ملکہ کی طرح کوزہ پشت ہو کر چلتا ہے

لیکن جلد ہی وہ رسول کریمؐ کی آفاقی عظمت، حمد اور مناجات کی طرف لوٹ آتے ہیں اور چوتھی غزل کا آغاز

اس طرح کرتے ہیں:

ترجمہ: آسمان محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ اظہار عقیدت کے طور پر خمیدہ ہے

محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی فیاضی کے سمندروں میں اس کی حیثیت محض ایک قطرے کی سی ہے

اسی طرح ساتویں غزل میں وہ کہتے ہیں:

ترجمہ: چاند محمدؐ کے حسن و جمال کا پرتو ہے

مشکِ غزال محمدؐ کے تل اور گیسوؤں کا ایک جھونکا ہے

''سیدھا کھڑا ہو گیا'' کے باغ میں سرو وصنوبر میں سے کسی کا

محمدؐ کے متناسب قد وقامت سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا!

چوں کہ جامیؔ کو یقین تھا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اعلیٰ وارفع مقام کے معاملے میں کوئی غیر ضروری مبالغہ آرائی نہیں کی گئی، اس لیے انہوں نے اپنی مدح سرائی کا خاتمہ اس طرح کیا ہے:

ترجمہ: ہستی کی زنجیر کا منبع

محمدؐ کے عطر بیز گیسوؤں کے سوا اور کوئی نہیں!

عربی روایت کی طرح فارسی میں بھی بے حد پیچیدہ ادبی زبان معرض وجود میں آ گئی جس میں رسول کریمؐ کی تعریف وتوصیف اور آپؐ سے امداد کی درخواست کی گئی۔ بعد میں آنے والے کئی شاعروں نے حضورؐ کی شان میں جو قصیدے لکھے، ان کی زبان تقریباً ناقابل فہم تھی جس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے ابن عربی کے جانشینوں کی حیثیت سے عرفانِ الٰہی کی جستجو میں مکمل طور پر فنی اصطلاحیں استعمال کیں لیکن یہ تجریدی اور نظری اصطلاحات دینی کتابوں تک میں آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ اس طرح فارسی میں لکھا جانے والا احمد یہ کلام ایک معمے کی صورت اختیار کر گیا۔ اس کی ایک بہترین مثال سولہویں صدی کے آخر کے عرفیؔ کی ایک نظم ہے جس میں شاعر —— جو شیراز سے ہجرت کر کے ہندوستان کے مغل دربار میں پہنچ گیا تھا اور جسے اب بھی فارسی کا عظیم قصیدہ گو مانا جاتا ہے، یہ واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ہر شے سے پہلے تخلیق کیا جانے والا قدیمی نور اور وقت حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات میں پراسرار طور پر یک جا کیے گئے ہیں لہٰذا حضورؐ کلی طور پر بے مثل ہیں۔ ابتدائی مصنفین کے لیے یہ کوئی نیا نظریہ نہیں تھا کیوں کہ جامیؔ بعض نعتوں میں پہلے ہی یہ نظریہ پیش کر چکے تھے۔ لیکن عرفیؔ نے اس راز کی وضاحت کرنے کے لیے کلاسیکل عربی شاعری کے ذخیرہ الفاظ کو بڑی مہارت سے استعمال کیا ہے اور سلمیٰ اور لیلیٰ کے روایتی ناموں کو استعارے کے طور پر متعارف کرایا ہے چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

ترجمہ: جس روز انہوں نے حساب لگایا تو ناممکنات میں سے کوئی بھی آپؐ کے ہم پلہ نہیں ہو سکتا تھا

انہوں نے آپؐ جیسی ہر ذات کے لیے ''ناموجود'' کو تاریخ پیدائش کے طور پر لکھ دیا

یہاں تک کہ انہوں نے آپؐ کے وجود کو ہنگامی ضرورت کے تحت مقام اتصال تحریر کر دیا

ایک مشترک کلمہ توصیف کے لیے کسی مادی شے کا تعین نہ ہو سکا

غرض تقدیر نے ایک اونٹ پر دو پالکیاں رکھ دیں

ایک پالکی آپؐ کے وجود کی سلمٰی اور دوسری آپؐ کے ازلی وجود کی لیلیٰ کے لیے......

اور قاری، جس نے اس صنف کے ۴۸ مصرعوں کو کسی نہ کسی طرح ختم کرنے کی کوشش کی ہے، نعت کے آخری شعر کو پڑھ کر مبہوت ہو جاتا ہے جس میں عرفیؔ نے یہ دعویٰ کیا ہے:

ترجمہ: میں علم کے بل بوتے پر نہیں، خلوص دل کے ساتھ آپؐ کی مدح کر رہا ہوں

میں بت کدے سے کعبے کے آہو کو کیسے نکال سکتا ہوں؟

مغل دور کے ہندوستان میں عرفیؔ کی شاعری کی خوب پذیرائی ہوئی اور ان کے تھوڑی ہی دیر بعد عثمانی ترکوں میں بھی اس کو بڑی داد ملی جہاں کئی شاعروں نے ان کی پیروی میں نعتیں لکھیں۔ عرفیؔ کے ہم عصر نظیریؔ (نیشاپوری۔ مترجم) نے اپنی نعتیہ شاعری میں عرفیؔ کے مذہبی ذخیرہ الفاظ کو استعمال کرتے ہوئے ایک طویل قصیدہ لکھا جس میں قرآن کریم اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں رسول اللہؐ کی مدح سرائی کی گئی۔ یہ قصیدہ نظیریؔ کے ایمان وایقان پر تصوفانہ تبصرہ اور عظیم شعری حسن کا بے مثال مرقع ہے۔ انہوں نے حضورؐ کی عظمت کے مرکزی خیال کو توانا شعروں میں بیان کیا ہے اور آپؐ کے داخلی اور ظاہری محاسن اور افعال، آپؐ کے عجز وانکسار اور قوت، آپؐ کے ''فقر'' اور شان وشوکت کا کمال مہارت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے:

ترجمہ: حضورؐ نے تمرد اور سرکشی کے برعکس

''میرے بعد کوئی نبی نہیں'' کا زوردار نظریہ پیش کیا

اور پیارے دوستوں کے لیے ''میں تو صرف ایک انسان ہوں'' کے الفاظ نازل کیے گئے......

اس میں کوئی شک نہیں کہ نظیریؔ نے جو نعتیں لکھیں، وہ بے حد اثر انگیز اور دل پذیر تھیں لیکن ہندوستان ہی کے ایک اور فارسی گو شاعر قدسیؔ مشہدی نے جو نعت لکھی، عوام میں اسے حد درجہ قبول عام حاصل ہوا اور یہ سادہ اور خوب صورت نعت برصغیر ہندوستان کے قوالوں میں اب بھی بہت مقبول ہے۔ قدسیؔ نے جامیؔ کے قواعد وضوابط کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے محبوب پیغمبرؐ کو یوں مخاطب کیا ہے:

مرحبا! سیدِ مکی، مدنی العربی!

دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

چشمِ رحمت بکشا سوئے من انداز نظر
اے قریشی لقبی، ہاشمی و مطلبی!

ترجمہ: مرحبا اے سردار مکہ، اے مدنی، اے عربی
میرے دل و جاں آپؐ پر قربان ہوں، آپؐ کے القاب کتنے اچھے ہیں
رحمت کی آنکھیں کھولیے، میری طرف نظر ڈالیے
اے وہ ہستی کہ جن کا لقب قریشی، ہاشمی اور مطلبی ہے
(جدید محققین کے مطابق یہ نعت کسی مقامی قدسی کی ہے، قدسی مشہدی کی نہیں۔ مترجم)۔

بہت سے فارسی گو شاعروں، خاص طور پر ہندوستان کے مسلم شعرا نے نبی کریمؐ کی عربی نسبت پر بہت زور دیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ عربی عنصر کو اپنے اسلامی ورثے کا اہم حصہ سمجھتا اور اس عنصر کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ مسلمان اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہیں کہ عرب ان کے دین اور تہذیب وثقافت کی سرزمین ہے اور یہ کہ ان کے آبا واجداد کو، جیسا کہ دہلی کے شاہ ولی اللہؒ نے اٹھارویں صدی میں کہا تھا، جلاوطن کر کے ہندوستان بھیجا گیا تھا۔ حضورؐ کے عربی ورثے پر زور دینے کا رجحان پوری طرح واضح ہے اور اعلیٰ پائے کے ادب، خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں کی مقبول شاعری میں اس کا ہر جگہ بھرپور اظہار کیا گیا ہے۔ تقریباً سترہویں صدی میں سندھی زبان میں آں حضرتؐ کی شان میں لکھی جانے والی ایک ابتدائی نعت میں شاہ میاں عنایتؒ نے حضورؐ کو بار بار ''حبیب، قریشی، عرب'' کے لقب سے مخاطب کیا ہے:

ترجمہ: اے شاہِ عرب! ہمارے ساتھ رہیے!
اے سلطانِ مدینہ! ہماری مدد کیجیے!

جہاں تک قدسیؔ کا تعلق ہے، وہ بھی اپنی نعت کا آغاز آپؐ کے روایتی القابات سے کرتے ہیں اور نعت کے آخر میں خود کو حضورؐ کے سگِ آستانہ سے تشبیہ دیتے ہیں:

نسبتِ خود بہ سگت کردم و بس منفعلم
زاں کہ نسبت بہ سگِ کوئے تو شد بے ادبی

ترجمہ: میں نے اپنی نسبت آپؐ کے کتے سے کی اور بہت شرمندہ ہوں
کیوں کہ آپؐ کی گلی کے کتے سے نسبت بھی بے ادبی ہے

فارسی شاعری، خصوصاً جامیؔ کے جانشین شعرا میں خود کو رسول کریمؐ کے در کا کتا یا اس خوش نصیب کتے سے کم تر مخلوق کہنے کا رجحان پایا جاتا ہے کیوں کہ جامیؔ نے اپنے کلام میں خود کو سگِ رسول کا کمترین غلام قرار دیا ہے۔ دیہی

علاقوں کی مقبول شاعری میں بھی یہ اصطلاح اکثر استعمال کی جاتی ہے چناں چہ حضورؐ کا ایک پنجابی عقیدت مند یہ کہتا ہے:

ترجمہ: میں حضورؐ کی آل کا کتا ہوں
اور وفاداری کے ساتھ ان کے دروازے کی نگہبانی کرتا ہوں

ممکن ہے کہ شاعروں میں سگِ رسولؐ کہلوانے کے رجحان کو اس نظریے سے بھی تقویت ملی ہو کہ ایک ناپاک کتا، جسے گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں اور جس کی موجودگی نماز کو غارت کر دیتی ہے، نیک اور پارسا لوگوں کی صحبت کے نتیجے میں پاک صاف ہوسکتا ہے۔ مسلمان قرآن کریم کی اٹھارویں سورہ کہف میں بیان کیے گئے غار میں سونے والے سات نوجوانوں کے قصے سے بخوبی آگاہ ہیں۔ (آپ دیکھیں گے کہ آفتاب بہ وقت طلوع ان کے غار سے دائیں جانب کو جھک جاتا ہے اور بوقت غروب ان کے بائیں جانب کترا جاتا ہے اور وہ اس غار کی کشادہ جگہ میں ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کی رہبری فرمائے وہ راہ راست پر ہے اور جسے وہ گمراہ کر دے ناممکن ہے کہ آپ اس کا کوئی کارساز اور رہنما پاسکیں۔ آپ خیال کرتے ہیں کہ وہ بیدار ہیں حالاں کہ وہ سوئے ہوئے تھے۔ خود ہم ہی انہیں دائیں بائیں کروٹیں دلایا کرتے تھے، ان کا کتا بھی چوکھٹ پر اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے تھا۔ اگر آپ جھانک کر انہیں دیکھنا چاہتے تو ضرور الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوتے اور ان کے رعب سے آپ پر دہشت چھا جاتی۔ آیات ۱۷، ۱۸۔ مترجم)۔ غرض یہ کتا ۳۰۹ برس تک غار میں ان نوجوانوں کے ساتھ رہا اور اس وفاداری کے باعث اس کا احترام کیا جاتا ہے۔ شاعر حضرات نے نہ صرف عجز وانکسار بلکہ اس کامل امید کے ساتھ کتے سے مماثلت ظاہر کی ہے کہ رسول کریمؐ کی چوکھٹ پر مسلسل بیٹھے رہنے سے ان کے باطن کا تزکیہ ہو جائے گا۔

قدسی نے نعت کا خاتمہ آں حضرتؐ سے فارسی اور عربی میں ملی جلی اس درخواست سے کیا ہے:

سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پے درماں طلبی

ترجمہ: میرے آقا! آپؐ میرے محبوب اور میرے دل کے معالج ہیں
قدسی علاج کروانے کے لیے آپؐ کی طرف آیا ہے

ہندوستان میں فارسی اور ابتدائی اردو شاعری میں نعت گوئی سے ان دو اہم سلسلوں میں پیش رفت کی عکاسی ہوتی ہے: اول یہ کہ فلسفیانہ نظریات کے استعمال میں بے حد اضافہ ہو گیا اور قرون وسطیٰ کے مذہبی تصورات کو اختصار کے ساتھ پیچیدہ اصطلاحات اور نادر استعاروں کے ذریعے پیش کرنے کا رجحان فروغ پذیر ہوا جس کی ایک مثال اٹھارویں صدی میں رسول اللہ کی مدح میں لکھی جانے والی یہ رباعی ہے:

ترجمہ: اے وہ ذات جس کا نور قرآن کی بسم اللہ سے ظاہر ہے

آپ ٗنورِ مجسم اور آپ ؐ کے عارض سورہ نور ہیں
اِس دنیا میں آپ ؐ امت کے رہنما اور اُس دنیا میں شافع ہیں
اے اسمائے ربانی کی مظہر ذات، ہادی اور رحمت للعالمین ؐ!

عثمانی ترک لٹریچر سے اس پیش رفت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے چناں چہ ترکی اور ہندوستان میں فارسی میں لکھی جانے والی طویل نظموں میں اس رجحان کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔ اس دور کے نعتیہ کلام میں قرآن حکیم کی ۵۳ ویں سورہ النجم کی آٹھویں اور نویں آیات کا اکثر حوالہ دیا گیا ہے جن میں کہا گیا ہے: ''پھر نزدیک ہوا اور اتر آیا۔ پس دو کمانوں کے بقدر فاصلہ رہ گیا بلکہ اس سے بھی کم۔'' انیسویں صدی کے جنوبی ہندوستان کے ایک صوفی شاعر نے حضورؐ کو ہدیہ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ آں حضرت ؐ کے نور کی موجودگی میں ہر صبح اور ہر شام کے آفتاب اور ماہتاب کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ (Kokan: Khanwada-i- Qazi Badruddin, pp.191-94)۔ ان نظموں کے ذریعے حضور رسالت مآب ؐ سے متعلق صوفیانہ تصورات کا حلقہ وسیع ہو گیا اور اگر چہ عام لوگ فارسی زبان سے آشنا نہیں تھے، اس کے باوجود اس زوردار شاعری نے انہیں خاصا متاثر کیا اور وہ حیرت اور ذوق وشوق کے جذبے سے سرشار ہو کر یہ محسوس کرنے لگے کہ وہ کسی حد درجہ پرشکوہ اور پراسرار کلام کو سن رہے ہیں۔

اس صنف میں دوسری اہم پیش رفت کا تعلق نبی اکرمؐ کے ساتھ محبت اور عقیدت کے والہانہ اظہار سے ہے جسے فارسی اور اردو شاعری میں ہمیشہ سے ایک مضبوط عنصر کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہ صورت حال غالباً علاقائی زبانوں میں شاعری کی وجہ سے پیدا ہوئی جس میں آں حضرت ؐ کے ساتھ مسلمانوں کے دلی لگاؤ اور قریبی تعلق کا اظہار کیا گیا ہے۔ احادیث کے مصدقہ مجموعوں میں رسول کریمؐ سے یہ الفاظ منسوب ہیں: ''جب تک کوئی شخص میرے ساتھ اپنے باپ، بیٹے اور تمام انسانوں سے زیادہ محبت نہ کرے، اس وقت تک وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔'' (فروزانفر: احادیث مثنوی نمبر ۲۲۸)۔

ایک اور حدیث مبارکہ میں کہا گیا ہے کہ رسول کریمؐ کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق بچوں کی باپ سے محبت کے مصداق ہے۔ (دیکھیے گیارہواں باب)۔ لیکن بعد میں شاعر حضرات حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے محبت کے لیے عشق کی توانا اصطلاح استعمال کرنے لگے جو زیادہ قلبی محبت اور جذباتی عقیدت کی آئینہ دار ہے۔ ایسی کئی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں حضورؐ کے عقیدت مند خود کو عاشق ظاہر کرتے ہیں۔ یہ اصطلاح مغرب میں روحانی محبت کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ معراج العاشقین اور قوت العاشقین اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ اٹھارویں صدی کے شروع میں سندھی زبان میں ایک کتاب لکھی گئی جس میں آں حضرت ؐ کے بارے میں کئی روایات بیان کی گئی ہیں۔ یہ روایات عاشقوں کے ایمان اور عقیدت کے لیے تقویت کا باعث ہیں:

کیا تھا نور جب اللہ نے پیدا محمدؐ کا
اسی دن سے ہوا ہے عاشقِ شیدا محمدؐ کا

خدا بھی حشر میں پوچھے گا گر عاشق تو کس کا ہے
تو کہہ دوں گا محمدؐ کا، محمدؐ کا، محمدؐ کا

یہ ہدیۂ عقیدت انیسویں صدی میں شیفتہ دہلوی نے پیش کیا۔ ان سے کچھ ہی عرصہ پہلے روہیلہ شہزادے محبت خان نے زیادہ رومانوی انداز میں اس موضوع پر یوں اظہار خیال کیا:

محمدؐ مصطفیٰ رنگِ گلِ عشق
دو زلف اس کی بہارِ سنبلِ عشق
وہی ہے آفتابِ انورِ عشق
اسی سے ہے درخشاں اخترِ عشق

یہ اشعار اس شخص نے کہے ہیں جس کی مادری زبان اردو نہیں، پشتو ہے البتہ یہ کلام پشتو میں لکھی جانے والی عوامی شاعری کے بہت قریب ہے جس میں عشق پر زور دیا گیا ہے۔ اور اب برسبیل تذکرہ: سکیا نامی ہندو نے پشتو زبان میں ایک نظم لکھی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول کریمؐ ایک مرتبہ جب اپنے بدترین دشمن ابوجہل کی بیٹی سے مخاطب ہوئے تو وہ فوری طور پر آپؐ سے محبت کرنے لگی تھی۔ (Darmesteter: Chants Populaires des Afghans, p.104)۔

نعتیہ شاعری میں مقبول عام اور اعلیٰ طرزِ ادا کے دل کش امتزاج کا حسین مرقع محسن کاکوروی (وفات ۱۹۰۵ عیسوی) نے تخلیق کیا جنہیں دورِ جدید کے پہلے کے اردو میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ انہوں نے اپنی بے حد مشہور نعت کا آغاز سادہ ہندی پیرائے میں اس طرح کیا ہے:

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لائی ہے صبا گنگا جل

اپنی نظم کے ہیجان انگیز تعارف میں وہ روایتی انداز میں موسمِ برسات کا تذکرہ کرتے ہیں (جس میں عاشق محبوب سے فراق کی شکایت اور وصلِ یار کی تمنا کرتے ہیں)۔ پھر وہ سری کرشن اور بے کل حسیناؤں (گوپیوں) کے ساتھ اس کے راز و نیاز کا ذکر کرتے ہیں لیکن اس کے فوراً بعد وہ اچانک گلِ خوش رنگ رسولِ مدنی و عربی کی طرف متوجہ ہو کر لفاظی سے بھرپور اردو میں عربی اور فارسی کی تراکیب استعمال کرتے ہیں۔

بھارت اور پاکستان میں نعتیہ شاعری کے ارتقا کا مطالعہ کرتے وقت اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ اس علاقے میں مذہبی موسیقی کی روایت ہمیشہ زندہ رہی ہے چناں چہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مدح و ستائش میں کہی گئی زیادہ تر نظمیں مترنم ہیں اور انہیں گا کر سنایا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سادہ نظمیں مقفیٰ ہیں اور ان میں قافیے اور ردیف کی خصوصیات موجود ہیں۔ ان نعتوں میں، جنہیں دعائیہ انداز میں بار بار دہرایا جاتا ہے، ٹیپ کے مصرعوں میں عام

طور پر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا پہلا حرف میم استعمال کیا جاتا ہے جس سے حضورؐ کے رول کی اہمیت کو اجاگر کیا جاتا ہے چناں چہ ایک سندھی شاعر کہتا ہے:

مٹھا میر محمدؐ مدد مار کر

ترجمہ: پیارے سلطانِ مدینہ محمدؐ! ہماری امداد کیجیے!

بیشتر نعتوں میں مٹھا محمدؐ کو حضورؐ کے دوسرے القابات مکی، مدنی کے ساتھ شامل کرلیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ بعض مقبول نام مثلاً فاران (مکہ معظمہ کا مضافاتی علاقہ) اور آپؐ کے دوسرے القابات، مثال کے طور پر یتیم، دریتیم بھی اکثر نعتوں میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ روایت سنائی سے شروع ہوئی اور جامی کو، جو بعد میں آنے والے شاعروں کے لیے مسلسل رہنمائی کا سرچشمہ بنے رہے، ایسی ترکیبیں اور القابات استعمال کرنے میں کمال مہارت حاصل ہے۔ برصغیر کے مغنی، مطرب اور قوال تو ان ترکیبوں اور القابات کو دہرانے میں ان سے بھی سبقت لے گئے ہیں اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ پچھلی چار صدیوں میں ارتقا کی مختلف منزلیں طے کرنے والی اردو کی نعتیہ شاعری مذہبی موشگافیوں اور دقیق لفاظی پر مبنی اصطلاحات کی حامل اسی دور کی فارسی نعتیہ شاعری کے مقابلے میں بہت کم بوجھل اور سبک بار ہے۔

نیپرٹ Knappert نے لکھا ہے: ''سواحلی زبان کے مذہبی لٹریچر میں پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ، جو خدا کی سب سے پیاری مخلوق ہیں، گہری محبت، عقیدت اور اطاعت شعاری کی روح واضح طور پر نظر آتی ہے۔'' نہ صرف سواحلی بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی تمام زبانوں میں اس عقیدت کا عکس دکھائی دیتا ہے چناں چہ نیپرٹ نے آگے چل کر لکھا ہے: ''تمام مسلمان خدا کے روشن و تاباں نمائندے (رسول کریمؐ) کے ساتھ بے حد محبت کرتے ہیں۔'' (Knappert: Swahili Islamic Poetry, p.1:40)۔ غرض آں حضرتؐ کی مدح میں لکھے گئے قصیدے پڑھنا مسلمانوں کی شخصی زندگی کے اہم واقعات میں شامل ہے۔ سندھ، کشمیر اور بیشتر دوسرے علاقوں میں شادی بیاہ، بچوں کی پیدائش اور ختنے اور دوسری اہم تقریبات کے موقعے پر نعتیں پڑھی جاتی ہیں اور بھارت اور پاکستان کی مسلم خواتین ایسے خصوصی اجتماعات منعقد کرتی ہیں جن میں حضورؐ کی شان میں لکھی جانے والی نعتیں اور قصیدے ترنم کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔

برصغیر کی زبانوں میں کئی سی حرفیوں کے اشعار قرآنی آیات یا احادیث سے شروع ہوتے ہیں جن سے رسول اللہؐ کے بے مثل مقام کا عندیہ ملتا ہے۔ میم کا حرف شاعروں کو قرآنی تلمیح ما زاغ البصر وما طغیٰ' (نہ تو نگاہ بہکی نہ حد سے بڑھی، سورہ النجم، آیت ۱۷) کی یاد دلاتا ہے۔ اسی طرح حرف ق اس حدیث مبارکہ کی طرف اشارہ ہے: قلبی لا ینام (میرا دل نہیں سوتا)۔ لیکن ق کے حرف سے عموماً قاب قوسین (پس دو کمانوں کے بقدر فاصلہ رہ گیا بلکہ اس سے بھی کم، سورہ النجم آیت ۹) مراد لی جاتی ہے۔ ب اس حدیث قدسی کا پہلا حرف ہے: انا احمد بلا میم۔

عربی روایت میں سی حرفی کی ایک مختلف صنف پائی جاتی ہے، اس کی ایک مثال عثمان مرغانی کی مخمس النور البراق فی مدح النبی المصداق ہے۔ یہ ایک غنائیہ نظم ہے جس کے ہر پانچویں مصرعے کا آغاز ترتیب وار حروفِ تہجی سے ہوتا ہے۔

ہندوستان میں شاعری کی ایک اور صنف بارہ ماسہ ہے، جس میں ایک معشوقہ سال کے بارہ مہینوں کے خصائص کی مناسبت سے محبوب کے فراق میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتی ہے۔ یہ صنف پورے برصغیر میں استعمال ہوتی ہے۔ ہر نظم میں ہجر کے صدموں سے نڈھال حسینہ کے منہ سے اپنے دولہا یا شوہر کی جدائی میں شعر کہلوائے گئے ہیں۔ مسلمانوں کے حوالے سے لڑکی عام طور پر انسانی روح کے روپ میں اپنے محبوب پیغمبرؐ کی یاد میں بے تاب ہو کر المیہ گیت گاتی ہے۔ ان بارہ ماسوں میں ہندوستانی کے بجائے اسلامی مہینوں کی ترتیب پر عمل کیا جاتا ہے، دولہا کی روح کو مکہ میں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہے اور قمری سال کے آخری مہینے ذوالحج میں آپؐ مدینہ منورہ میں واقع اپنے روضہ اقدس میں محوِ استراحت ہیں۔ یہاں یہودیوں اور عیسائیوں کی روایت کے مطابق ایک طرح کے ''عروسی تصوف'' کی کیفیت پائی جاتی ہے جو پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں مسلمانوں کے اندازِ فکر کے لیے بنیادی طور پر اجنبی اور نامانوس ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ صنف ہندووَانہ خیالات سے متاثر ہو کر وضع کی گئی ہے جیسے رادھا کی طرف سے کرشن کے ساتھ ملاقات کی آرزو! اسی طرح بارہ ماسوں میں ہندومت کے لٹریچر کی اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں۔ سندھی اور پنجابی میں شاعری کی یہ صنف عام ہے جس میں شاعر ایک خیالی محبوبہ کے لبادے میں اپنے آپ سے مخاطب ہوتا ہے جیسے وہ خود ایک دلہن ہو اور حضورؐ میں دولہا کے خصائص موجود ہوں:

ترجمہ: خوش آمدید! اے دولہا خوش آمدید! اے محمد عربیؐ!
رحم کیجیے! اے سب سے زیادہ رحم کرنے والے!

سندھی کی مذہبی شاعری میں، جو اٹھارویں صدی کے شروع میں عبدالروف بھٹی کے دور سے ترقی کر رہی ہے، ''مدینے کے دولہا'' کی اس قدر تکرار ہے کہ شاعروں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ سفرِ معراج کے دوران:

ترجمہ: جبریلؑ آگے پیدل چل رہے تھے اور دولہا (حضورؐ) گھوڑے پر سوار تھے

غالباً یہ تشبیہ صرف ہندوستانی مسلمانوں، خاص طور پر وادی سندھ اور پنجاب کے میدانی علاقوں کی شاعری تک محدود ہے جہاں کے صوفی شاعر اپنی روح کا سندھ کی لوک کہانیوں کی ہیروئنوں سے موازنہ کرتے ہیں، جیسے سسی اور سوہنی جنھوں نے محبوبوں کی تلاش میں اپنے آپ کو قربان کر دیا تھا۔ اس معاملے میں ان شاعروں نے بہت دور رہنے والے پیغمبرؐ کو تمثیل کے طور پر ظاہر کیا ہے۔

عوامی زبانوں کے شعروں میں بعض اوقات ناقابلِ انکشاف تصوفانہ اسرار کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ میلان خاص طور پر اس صورت میں پایا جاتا ہے جب یہ اشعار کسی اہم مقامی مذہبی مرکز میں لکھے گئے ہوں۔ اس کی

وجہ یہ ہے کہ مقامی روایتی داستانوں کو بھی اکثر ان شعروں میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ گلبرگہ میں، جہاں عظیم چشتی بزرگ گیسودرازؒ دفن ہیں، سالانہ عرس کے موقعے پر ایک قدیم ہندی گیت گایا جاتا ہے جس میں کہا گیا ہے:

ترجمہ: تھوڑا سا نمک پانی میں ڈال دو

جب یہ حل ہو جائے تو اسے کیا کہا جائے گا؟

اسی طرح مصطفیٰؐ نے خود کو خدا کی ذات میں پگھلا دیا

جب اپنی ذات پگھل جاتی ہے تو پھر خدا کس کو کہیں گے؟

گو کہ اس قسم کی صورت گری رسول کریمؐ کے رول کے کٹر شارحین کے نزدیک موزوں نہیں، اس کے باوجود یہ شعر مقامی مسلمانوں میں بہت مقبول ہیں۔

تمام علاقوں کے شاعروں نے امید ظاہر کی ہے کہ انہیں خواب میں حضورؐ کی زیارت نصیب ہوگی۔ انہیں توقع ہے کہ آں حضرتؐ بصیریؒ کی طرح انہیں بھی نعت لکھنے کا صلہ دیں گے۔ بصیریؒ کے زمانے کے چند عشروں کے بعد اناطولیہ میں یونس ایمرے نے خواب میں حضورؐ کی زیارت کو خوش بختی سمجھ کر ان خیالات کا اظہار کیا:

ترجمہ: آج رات ایک لطیف خواب میں

مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زیارت نصیب ہوئی

دل کے شفاف آئینے میں

میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیکھا

فرشتے قطار در قطار کھڑے تھے

وہ خوب صورت سبز کپڑوں میں ملبوس تھے

ان سب نے مل کر کہا: ''محمد''!

میں نے خواب میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زیارت کی

محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے ایک پیالہ دیا

میں اسی کے نشے میں مخمور تھا

آقا نے مجھ پر اس قدر احسان کیا

میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیکھا

میری حیثیت سمندر میں ایک قطرے کی سی ہے

میں نے دیکھا کہ میرے زخم مندمل ہو گئے ہیں

آج مجھ پر انوار و اکرام کی کیسی بارش ہوئی ہے
میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زیارت کی

دوسرے لوگ شاعروں نے اس بات پر فخر و انبساط کا اظہار کیا ہے کہ ان کا تعلق اس امت سے ہے، جس کا انتخاب خدا نے کیا ہے اور جس پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں:

ترجمہ: محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا امتی ہونے کے ناتے میں نے ایمان کا لباس پہن رکھا ہے
اور میں ایک طاؤس کی طرح ناز و انداز سے چلتا ہوں

یہ پندرہویں صدی میں ترکی کے مولانا رومی تھے۔ اور تین سو سال بعد ان کے ایک ہم وطن سنائی نے زیادہ نفیس انداز میں یہ مصرعے لکھے:

ترجمہ: آپؐ صدق و صفا کے آفتاب ہیں جن کے سامنے
پوری دنیا کی حیثیت محض ذرہ غبار کی سی ہے
آپؐ کا وجود زمان و مکان کے لیے قوت محرکہ ہے اے خدا کے رسولؐ!
جو لوگ آپؐ کے عشق کا جام پی لیتے ہیں انہیں خضر کے آب حیات کی حاجت نہیں رہتی
کیوں کہ آپؐ کی محبت ابدی حیات ہے اے خدا کے پیغمبرؐ!

خود ہمارے زمانے میں مصر کے لوک مطرب بھی اسی قسم کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں لیکن ان کا انداز بیان زیادہ فنی نہیں:

ترجمہ: ہر قسم کے عشق کی ممانعت کی گئی ہے
لیکن حضورؐ کے ساتھ عشق کرنے کی اجازت ہے
شراب پینے سے منع کیا گیا ہے
لیکن آں حضرتؐ کے لعاب دہن سے پینا روا رکھا گیا ہے

مقبول عام مطربوں کے نزدیک رسول کریمؐ کے ساتھ محبت ان کے ایمان و ایقان کی روح ہے۔ آپؐ کی ذات سے عشق نہ صرف انسانوں بلکہ تخلیق کی گئی ہر شے کا مرکز حیات ہے کیوں کہ پتھروں، درختوں، چوپایوں اور دیواروں تک نے حضورؐ کی عظمت و صداقت کا اعتراف کیا ہے چناں چہ ایک سندھی شاعر کہتا ہے:

ترجمہ: کنول کا پھول خواب میں آفتاب کو دیکھتا ہے
پروانہ شمع کی لو پر فریفتہ ہے
بلبل گلاب کے پھولوں کا تذکرہ کرتی رہتی ہے

اور چکور بے قراری سے چیخ و پکار کرتا ہے
لیکن یہ سب چیزیں اس جلیل القدر شہنشاہ کی محبت میں گرفتار ہیں

مقبول شاعروں کے علاوہ اعلیٰ کلاسیکل ادب کے اساتذہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ جس طرح رسول خداؐ کائنات کی تخلیق کے معنی اور غرض و غایت ہیں، اسی طرح آپؐ مخلوق کی رہنمائی کرتے ہوئے اسے حیات جاودانی کی طرف لے جائیں گے اور جیسا کہ نجم الدین رضی دیا نے کہا ہے: آپؐ ہی میر کارواں ہیں'' جنہوں نے سب سے پہلے عدم کے پردے سے باہر قدم رکھا تھا۔'' (Razi: The Path of God's Bondsmen, p.157)۔ موجودات کی اس دنیا میں آپؐ ہی وہ روحانی رہنما ہیں جو، جیسا کہ عطارؔ نے مصیبت نامہ کے آخر میں لکھا ہے: ''حق کے متلاشی کو ''روح کے سمندر'' کی جانب رہبری کرتے ہوئے اسے خدا کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔''

مولانا رومؔی جب فخریہ انداز میں یہ کہتے ہیں کہ

ترجمہ: ہمارے میر کارواں فخر کائنات مصطفےٰؐ ہیں

تو وہ وادی سندھ اور اناطولیہ کے ان شاعروں کی ہم نوائی کرتے ہیں جو مکہ معظّمہ میں خانہ کعبہ تک پہنچانے میں پیشوائی کرنے والا عظیم کارواں سالار ہے۔ اور اگر شاعر حضرات بڑے دریاؤں کی وادیوں یا سمندر کے قریب رہتے ہوں تو وہ اس ناخدا کی حیثیت سے آپؐ کی تعریف کرتے ہیں جو زندگی کی کمزور کشتی کو پتوار سے چلا کر ریت کے ٹیلوں اور گردابوں سے بچاتا اور امن و سلامتی کے دور دراز ساحل پر پہنچا دیتا ہے۔ سندھ کے شاہ عبداللطیفؒ نے بھی اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اسی طرح بنگالی کا ایک لوک شاعر ان ماہی گیروں اور ملاحوں کی زندگی سے متعلق تشبیہیں اور استعارے استعمال کرتا ہے جو یہ جانتے ہیں کہ دوسرے ساحل تک پہنچنے کے لیے انہیں ایک تجربہ کار اور دانش مند ناخدا کی ضرورت ہے:

ترجمہ: میں آپؐ جیسے ہمدرد دوست کو
کبھی نہیں پا سکوں گا
آپؐ نے مجھے چہرہ اقدس کی زیارت کرائی
اے اسلام کے پیغمبرؐ! اب مجھے چھوڑ کر نہ جایئے
آپؐ خدا کے محبوب دوست ہیں
ایمان و صداقت کے دور افتادہ ساحل کے پتوار چلانے والے
آپؐ کی رہبری کے بغیر
ہم دوسرے ساحل کی دنیا کو کبھی نہیں دیکھ پائیں گے!

گیارھواں باب

طریقہ محمدیہ اور حیات طیبہ کی نئی تعبیر

مسلمان عام طور پر محمڈن کہلانے سے انکار کرتے ہیں چناں چہ جدید دور سے پہلے کے صوفیہ حضرات کے بعض گروپ اپنے لیے ''طریقہ محمدیہ'' کی اصطلاح کو استعمال کرتے اور نبی کریمؐ کی سنت پر کاربند رہتے ہوئے تصوفانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ''طریقہ محمدیہ'' کی اصطلاح سب سے پہلے اٹھارویں صدی کے ہندوستان کے صوفی رہنماؤں نے استعمال کی۔ طریقہ محمدیہ پر عمل کرنے والے مسلمانوں نے انیسویں صدی کے پہلے نصف حصے کے دوران برصغیر میں اہم سیاسی رول ادا کیا۔ (Schimmel: The Golden Chain of Sincere Muhammadans)۔ اسی مدت میں شمالی افریقا کے صوفیوں کے کئی گروپوں نے بھی مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مثالی کردار کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے طریقہ محمدیہ کی اصطلاح کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ حال ہی میں انڈونیشیا کے مسلمانوں میں ''محمدیہ'' تحریک نے زور پکڑنا شروع کر دیا ہے۔ (Peacock: Purifying the Faith: The Muhammadiya Movement in Indonesian Islam)۔

ہندوستان میں طریقہ محمدیہ کے ایک نقیب احمد سرہندیؒ تھے جنہیں ان کے مداح مجدد الف ثانی (دوسری ہزاری میں دین کی تجدید کرنے والے) کے نام سے موسوم کرتے ہیں کیوں کہ آپ سنہ ایک ہزار ہجری (۱۵۹۱، ۱۵۹۲ عیسوی) کے فوراً بعد منظر عام پر آئے تھے۔ (Friedmann: Shaykh Ahmad Sirhindi)۔

احمد سرہندیؒ کا تعلق سلسلہ نقشبندیہ سے تھا جسے وسطی ایشیا میں فروغ حاصل ہوا اور جس نے پندرہویں صدی کے دوران وسط ایشیا کی سیاست میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ہرات کے تیموری دربار سے وابستہ تقریباً تمام اسکالروں اور شاعروں کا تعلق نقشبندیہ سلسلے سے تھا جن میں شاعر جامی اور طاقت ور وزیر میر علی شیر نوائی شامل تھے۔ اسی عرصے میں بخارا اور اس کے ملحقہ علاقوں کی سیاست نقشبندی بزرگ عبید اللہ احرارؒ کے زیر اثر تھی۔ وہ سیاسی فہم و فراست رکھنے والی

طلسماتی شخصیت کے مالک تھے۔ جامی نے اپنی اہم نصیحت آموز رزمیہ نظموں کے مجموعے کو عبید اللہ احرار سے منسوب کرتے ہوئے اسے تحفۃ الاحرار کے نام سے موسوم کیا ہے۔ نقشبندی سلسلہ سولہویں صدی کے آخر میں افغانستان کے راستے ہندوستان پہنچا۔ خواجہ باقی باللہؒ اس کڑی کی اہم شخصیت تھے اور اکبر کے زمانے میں کئی دانشوروں کے ساتھ ان کے دوستانہ تعلقات قائم تھے۔ احمد سرہندیؒ بھی نقشبندیہ سلسلے میں شامل ہو گئے اور انہوں نے اکبر بادشاہ کے رجحانات کے خلاف تبلیغ کا آغاز کر دیا۔ بہت سے لوگ یہ محسوس کرتے تھے کہ اکبر کے رجحانات کے باعث اسلام اور ''کفر'' کے درمیان سرحدیں دھندلا گئی ہیں۔ احمد سرہندیؒ اسلام کے سوا کسی اور مذہبی طریقے کو روا نہیں سمجھتے تھے۔ آپ کا نظریہ تصوف کی چاشنی کے حامل ایک ایسے اسلام کی عکاسی کرتا تھا جو ہر طرح کی بت پرستی، الحاد، شرک اور ہندو عنصر سے پاک اور خالص ہو۔ اسلام کی اس تصریح کے مطابق نبی کریمؐ کی شخصیت کو دین میں مرکزی مقام حاصل تھا کیوں کہ یہ آپؐ ہی کی ذات مبارک تھی جنھوں نے اسلام اور بت پرستی کے درمیان خطِ امتیاز کھینچا تھا اور جس کا اظہار بے شمار شاعر حضرات اپنی پر مغز نعتوں میں مسلسل کرتے چلے آ رہے تھے۔ ہندو اور دوسرے مذاہب کے لوگ کلمہ شہادت کے پہلے حصے کو، جس میں خدا کی وحدانیت کی گواہی دی گئی ہے، تسلیم کرنے کو تیار تھے لیکن وہ کلمہ شہادت کے دوسرے حصے کو ماننے سے انکار کرتے تھے جس میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدا کے رسول کی حیثیت سے بے مثال پوزیشن کا اقرار کیا گیا ہے۔ آپؐ کے اسی منصب کی بدولت اسلام کو ایک منفرد مقام حاصل ہے جو اسے دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتا ہے۔

کئی دوسرے نقشبندی رہنماؤں کی طرح احمد سرہندیؒ کے بھی یقیناً سیاسی عزائم تھے اور ان کے اس سیاسی کردار کو ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے وجود کا احساس دلانے کے ضمن میں اہم حیثیت حاصل ہے۔ خود ہماری صدی میں بھی اس دو قومی نظریے کا دفاع کرنے والے لوگ احمد سرہندیؒ کے اس کردار کو اجاگر کرتے رہے ہیں جس کی رو سے ہندوستان کے مسلمان باہم پیوست اور ہندو اکثریت کے مقابلے میں ایک حد درجہ منفرد قوم ہیں۔ احمد سرہندیؒ کے تصوفانہ نظریات اور اپنے صوفیانہ رول کے بارے میں ان کے ریمارکس میں زیادہ دلچسپی نہیں لی گئی البتہ تاریخ عالم کے خدائی پلان میں اپنے عہد میں ان کے رول کے متعلق ان کے اقوال اس قدر جرأت مندانہ تھے کہ اکبر کے بیٹے جہانگیر نے انہیں کچھ عرصے کے لیے قید کر دیا'' یہاں تک کہ اس کے مزاج کی حرارت اور اس کے ذہن کا انتشار فرو ہو گیا۔'' جہانگیر نے اپنی یادداشتوں ''تزک جہانگیری'' میں وحشت اور خوف کے عالم میں احمد سرہندیؒ کا تذکرہ کیا ہے لیکن ان کے مکتوبات کو ظریفانہ انداز میں ''خرافات کا مرقع'' قرار دیا ہے۔

جہاں تک مجھے علم ہے، نقشبندیوں نے اسلام کے مشرقی ملکوں کے بیشتر شاعروں اور صوفیہ حضرات کی اس

پسندیدہ حدیث ''انا احمد بلا میم'' (میں میم کے بغیر احمد یعنی احد ہوں) کو استعمال نہیں کیا کیوں کہ انہیں خدشہ تھا کہ اس سے بت پرستی، شرک اور وحدت الوجودی نظریات کو فروغ اور اسلام کی بے مثال پوزیشن کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ لیکن احمد سرہندیؒ بھی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اسمائے گرامی کی ذو معنی اہمیت سے گریز نہ کر سکے کیوں کہ کم سے کم عطار کے زمانے سے انہیں قبول عام حاصل تھا چناں چہ انہوں نے دعویٰ کیا کہ زندگی میں حضورؐ کی دو منفرد حیثیتیں تھیں جن کا اظہار آپؐ کے اسم مبارک محمدؐ کی دو میموں کے دو کالوں سے ہوتا ہے: ان میں سے ایک کا تعلق انسانی اور جسمانی حیات اور دوسرے کا تعلق ملکوتی اور روحانی دنیا سے ہے۔ احمد سرہندیؒ کہتے ہیں کہ اسلامی تاریخ کے پہلے ایک ہزار برسوں میں محمدؐ کے نام کی پہلی میم آہستہ آہستہ اوجھل ہوگئی اور اس کی جگہ الف کے حرف نے لے لی جو خدا کی وحدانیت کی علامت ہے۔ اس طرح محمدؐ نے احمدؐ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ (یہاں قارئین کو خود احمد سرہندیؒ کے اپنے نام میں بھی یہ لطیف کنایہ نظر آئے گا)۔ انہوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ایک عام مسلمان کو (اس سے مراد غالباً وہ مسلمان ہے جو رسول کریمؐ کی سنت پر پوری طرح کاربند ہو) حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حقیقی ظہور کی ازسرِنو اصلاح اور تجدید کرنی چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں مسلمانوں کو نہ صرف حضورؐ کی روحانی بلکہ سیاسی اور سماجی تعلیمات پر بھی عمل پیرا ہونا چاہیے تاکہ اسلام کو ایک نئی عظمت اور شان و شوکت حاصل ہو سکے۔ اس طرح ''رسالت کی کاملیت'' پوری آب و تاب کے ساتھ دوبارہ ظاہر ہوگی۔

احمد سرہندیؒ اپنے آپ اور اپنے تین وارثوں کو قیوم تصور کرتے تھے۔ اس اصطلاح سے مراد وہ اعلیٰ ترین روحانی قوت ہے جو دنیا کی رفتار کو محفوظ اور درست رکھتی ہے۔ یہ ایک عجیب اتفاقیہ مطابقت ہے کہ ۱۷۳۹عیسوی میں نادر شاہ کے ہاتھوں دہلی کی لوٹ مار اور تباہی کے تھوڑی ہی دیر بعد چوتھے اور آخری قیوم پیر محمد زبیر کا انتقال ہو گیا۔ یہ واقعہ کسی زمانے کی توانا مغل سلطنت کے خاتمے کا نقطہ آغاز تھا۔ مغل سلطنت ۱۷۰۷عیسوی میں آخری طاقت ور بادشاہ ۹۰ سالہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد ٹکڑے ٹکڑے ہونا شروع ہوگئی تھی۔ داخلی اور بیرونی جنگوں اور بے چینی کے باعث اس سلطنت کی بنیادیں ہل گئیں اور ۱۷۳۹ء میں دہلی کا سقوط ہندوستان کے ایک بڑے حصے پر مغلوں کی بالادستی کے خاتمے کی ظاہری علامت تھا۔ لیکن ٹوٹ پھوٹ کے اسی زمانے میں مسلمان علما کے ایک گروپ نے ''اسوہ حسنہ'' کے طور پر رسول کریمؐ کے رول کی اہمیت کو اجاگر کیا اور اسی مدت کے دوران دہلی کے تین عظیم صوفی مفکر، جو سب کے سب نقشبندیہ سلسلے سے وابستہ تھے (اگرچہ ان کا تصوف کے دوسرے سلسلوں سے بھی تعلق تھا) اس نئے ''محمدیؐ'' علم معرفت کے لیڈر کی حیثیت سے منظر عام پر آگئے جس کا مقصد مایوس مسلمانوں میں نئی روح پھونکنا اور نبی کریمؐ اور آپؐ کے پہلے چار جانشینوںؓ کے سنہری دور کی جانب واپسی کے لیے ان کی رہنمائی کرنا تھا۔

ان میں سب سے مشہور رہنما شاہ ولی اللہؒ تھے جن کا شمال مغربی ہندوستان میں سیاسی کردار بے حد نمایاں تھا۔ وہ خود کو رسول اللہؐ کا نائب ''متابع'' کہلواتے تھے۔ انہوں نے خواب میں ۱۳ مرتبہ حضورؐ کی زیارت کی جن میں آپؐ نے ان کے مذہبی تشخص کی ترتیب اور آراستگی کے لیے دل چسپ بصیرت افروز ہدایات دیں۔ شاہ ولی اللہؒ نے یہ محسوس کرلیا کہ انہیں آں حضرتؐ کی امت مرحومہ (جس پر خدا کی رحمت ہے) کے ایک مختصر طبقے کی رہنمائی کرنے کا فریضہ سونپا گیا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کے دوست اور بزرگ ساتھی مظہر جان جاناںؒ ''سنی تراش'' اس کام میں ان کے شانہ بشانہ کھڑے رہے۔ وہ بھی نقشبندی سلسلے سے وابستہ اور رسول کریمؐ کی سنت کی سختی سے پیروی کرنے میں بہت مشہور تھے۔ مظہر جان جاناںؒ نے نہ صرف مثالی صوفیانہ زندگی بسر کی بلکہ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے اچھے شاعر بھی تھے اور انہیں ''اردو شاعری کا چوتھا ستون'' تصور کیا جاتا تھا۔ اس گروپ کی تیسری شخصیت خواجہ میر دردؔ تھے۔ وہ اردو کے، جب اٹھارویں صدی کے شروع سے دہلی اور لکھنؤ میں مصفا اور شستہ زبان کے سانچے میں ڈھل رہی تھی، صحیح معنوں میں اعلیٰ پائے کے صوفی شاعر تھے۔ لیکن میر دردؔ بھی ایک تخمینی عالم تھے جنہیں طریقہ محمدیہ کی تشکیل میں ایک معاون کی حیثیت حاصل تھی۔ ان کے والد ناصر محمد عندلیبؔ چوتھے قیوم کے دوست اور عقیدت مند تھے۔ انہیں امام حسنؓ نے خواب میں طریقہ محمدیہ کے بنیادی اصول بتائے تھے۔ (اتفاق سے نبی کریمؐ کے بڑے نواسے حضرت حسنؓ ابن علیؓ شاذلیہ سلسلے کے لیے بھی، جو نقشبندیوں کی طرح ایک ''سنجیدہ اور متین'' سلسلہ ہے، روحانی فیضان کا اہم ذریعہ ہیں)۔ غالباً غیر شیعہ بلکہ شیعہ مخالف صوفی سلسلوں نے امام حسینؓ کے بجائے امام حسنؓ کو اس لیے مثالی نمونے کے طور پر چنا ہے کیوں کہ شیعوں نے امام حسینؓ کے ساتھ گہری عقیدت کے باعث بعض ایسے طور طریقے اختیار کر رکھے ہیں جنہیں سنی لوگ حضورؐ کی آل کے دلی احترام کے باوجود برداشت نہیں کر سکتے۔

عندلیبؔ نے اپنے بیٹے میر دردؔ کو، جن کی عمر اپنے والد کے کشف کے وقت (۱۷۳۴ء) ۱۳ برس کے قریب تھی، طریقہ محمدیہ میں داخل کیا جس کے بعد دوسرے لوگوں نے بھی ان کی پیروی کی۔ یہ طریقہ بنیادی طور پر اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس میں تصوف کے اعتبار سے ایسی بلند ترین بنیاد پرستی (اسلامی تعلیمات کی حرف بہ حرف پیروی) پائی جاتی ہے جس میں راہ حق کا متلاشی حقیقت محمدیہ کے اصول سے یک رنگ ہو کر منزل مقصود کو پالیتا ہے۔ چناں چہ میر دردؔ اور ان کے مریدوں نے اس طریقے پر کاربند پرانے صوفیوں کے تین اجزا: شریعت، طریقت اور حقیقت کو یک جا کر کے یہ نظریہ پیش کیا کہ طریقہ محمدیہ میں شریعت محمدی پر ثابت قدمی سے عمل پیرا ہونے کے نتیجے میں سالک اس حقیقت محمدیہ کو پالیتا ہے جس میں وہ ۱۹۹ اسمائے گرامی کے فیوض سے روحانی کائنات کا مالک بن کر انسان کامل بن جاتا ہے (اگرچہ میر دردؔ نے اپنی تحریروں میں یہ اصطلاح استعمال نہیں کی) کیوں کہ ''انسانیت دین محمدی پر مشتمل ہے''۔ (درد:

علم الکتاب صفحہ ۴۳۲)۔

میر دردؔ نے فارسی میں بھی کئی کتابیں لکھیں جن کا واحد مقصد طریقہ محمدیہ کو عام کرنا تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ صرف یہی طریقہ دہلی کے ان باشندوں کو بچا سکتا ہے جو نادر شاہ کے حملے کے بعد آنے والے عشروں میں مسلسل یورشوں، قحط اور سیاسی عدم استحکام کا شکار تھے۔ میر دردؔ نے طریقہ محمدیہ کی جو تشریح کی ہے، اس کے مطابق ان کے والد عندلیبؔ تمام عملی مقاصد کے لیے رسول کریمؐ کے نمائندے کے فرائض انجام دیتے ہیں جن کی وہ جسمانی اولاد ہیں (سید ہونے کے ناتے) اور اسی بنا پر وہ فنافی الرسولؐ کے بلند ترین منصب پر فائز تھے۔ رسول کریمؐ کے نائب کے مرتبے پر میر دردؔ کی مسند نشینی اور مختلف پیغمبروں کے مراحل سے گزر کر حقیقت محمدیہ کو پالینے کے بارے میں ان کے وہ دعوے نفسیاتی اعتبار سے بہت دل چسپ ہیں جو انہوں نے طویل فارسی نثر میں کیے ہیں۔ یہ وہی نظریات ہیں جو دوسرے صوفی شاعروں نے وجد آور شعروں میں بیان کیے ہیں۔ (دردؔ: علم الکتاب صفحہ ۵۰۴ نیز Schimmel: Pain and Grace, pp.78-80)۔

میر دردؔ کو، جو اپنے آبائی شہر دہلی سے کبھی باہر نہیں گئے، موسیقی سے محبت تھی اور وہ اس فن کی سرپرستی کرتے تھے۔ لیکن انہیں سیاست سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ ان کی کتابوں میں، جو خاصی تعداد میں موجود ہیں، شیعوں کے متعلق کوئی توہین آمیز ریمارکس شامل نہیں۔ ان کے برعکس مظہر جان جاناںؒ شیعوں کے سخت مخالف تھے بلکہ انہیں محرم میں شیعوں کے جلوس کا تمسخر اڑانے پر بڑھاپے میں قتل کر دیا گیا تھا۔ مظہر جان جاناںؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے حلقوں نے نبی کریمؐ کی سیاسی اہمیت کو اجاگر کرنے پر زور دیا، مثال کے طور پر مظہر جان جاناںؒ نے جدید دور کے نزاعی مسلکوں اور مسلمانوں کے دو بڑے فرقوں کے درمیان تعلقات کے حوالے سے لکھا ہے:

سنی اور شیعہ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ہمارے پیغمبر علیہ السلام پوری دنیا کے لوگوں کے لیے رحمت، تمام پیغمبروں میں افضل اور آپؐ کی امت تمام امتوں میں سب سے بہترین امت ہے۔ آپؐ کے دین اسلام نے پچھلے تمام مذاہب کو منسوخ کر دیا ہے...... چناں چہ یہ ضروری ہے کہ آپؐ کا قانون دوسرے تمام قوانین سے زیادہ طاقت ور اور آپؐ کی امت تعداد میں دوسری تمام امتوں کے مقابلے میں زیادہ ہو...... یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ مسلمانوں کی غالب اکثریت سنی ہے اور اس گروپ کو عددی برتری کے علاوہ قوت کے اعتبار سے بھی مکمل بالادستی حاصل ہے۔ تمام ولی اور اسکالرز بلکہ اسلامی ملکوں کے بیشتر حکمران اور بادشاہ، جو دینِ اسلام کی سطوت اور استحکام کا باعث ہیں، ماضی اور زمانہ حال میں اسی فرقے (سنی) سے تعلق رکھتے ہیں۔ (مکاتیب مرزا مظہر: صفحہ ۲۱۴)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مظہر جان جاناںؒ کے یقین کے مطابق حضور علیہ السلام کی عظمت آپؐ کی کثیر امت سے ثابت ہوتی ہے چناں چہ ملت اسلامیہ کی عددی برتری ہی اس کی صداقت کا ثبوت ہے۔ آں حضرتؐ کی نبوت کی

صداقت اس حقیقت سے بھی آشکار ہوتی ہے کہ آپ کی تعلیمات اور سیاسی سرگرمیاں کامیابی سے ہم کنار ہوئی ہیں اور اس کا اعتراف ابتدائی زمانوں سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اٹھارویں صدی کے اسکالرز حضورؐ کی سماجی اور سیاسی اہمیت پر زیادہ زور دیتے رہے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ کسی بھی پیغمبر کی صداقت اور خلوص کا اندازہ اس کی تبلیغ کے سیاسی اور سماجی نتائج سے لگایا جاسکتا ہے کیوں کہ:

خدا اپنے پیغمبر کو ایسی فہم و فراست اور ذہانت عطا کرتا ہے جس کے ذریعے وہ مناسب ذرائع کو بروئے کار لا کر ایک صحت مند معاشرہ تشکیل دیتا ہے۔ ان ذرائع میں اچھی پرورش، گھریلو معیشت، سماجی میل ملاپ، مدنی وسائل کا بہترین استعمال اور ملت کا نظم و نسق شامل ہیں۔ (Baljon: A Mystical Interpretation of Prophetic Tales by an Indian Muslim, p.58)

یہاں یہ دل چسپ حقیقت توجہ کے لائق ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کے ڈیڑھ سو سال بعد عہد حاضر میں اسلام کے عظیم شارح محمد اقبالؒ نے بھی اس ضمن میں یہی رائے ظاہر کی ہے تاہم انہوں نے فارسی کی پیچیدہ اصطلاحات کے بجائے فلسفیانہ انگریزی کو استعمال کیا ہے:

غرض کسی پیغمبر کے مذہبی مشاہدے کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ یہ جائزہ لیا جائے کہ اس نے کس نوع کے انسان پیدا کیے ہیں اور اس کی تعلیمات کی روح نے کس قسم کی ثقافتی دنیا تخلیق کی ہے؟

(Iqbal: Six Lectures on the Reconstruction of Religious Thought in Islam, p.124)۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے ——— جیسا کہ محمد اقبالؒ نے کسی اور جگہ صحیح کہا ہے کہ جدید نقطہ نظر سے اسلام کی تعبیر و تشریح کرنے کے کام کا آغاز اصل میں شاہ ولی اللہؒ سے شروع ہوتا ہے کیوں کہ عصر حاضر کے اسکالروں کو رسول کریمؐ کے معجزوں کی نسبت ایک قوم کے معمار کی حیثیت سے آپؐ کے کردار، سماجی رویے اور طرز عمل کے نمونے میں زیادہ دل چسپی ہے۔

مسلمانوں کو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مثالی کردار اور خود ان کے اپنے سیاسی انتشار اور افراتفری کے مسئلوں کا ہمیشہ سے سامنا رہا ہے اور اس طرح ایک سراب آئیڈیل اور افسوس ناک سیاسی حقائق کے درمیان گہرا تفاوت ان کے لیے مسلسل پریشانی کا سبب بنا رہا ہے۔ رسول کریمؐ اور پہلے چار خلفاؓ کا سنہری دور وہ پیمانہ ہے جس سے مسلمان اپنی موجودہ صورت حال کو ناپتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے ہندوستان جیسے دور میں، جب مسلم حکومت کو فی الواقع شکست ہوگئی اور برطانیہ اور فرانس جیسے غیر ملکی سامراجیوں نے برصغیر پر قبضہ کرلیا تو پیغمبر اسلامؐ کی شخصیت تیزی کے ساتھ ملت اسلامیہ کے مرکز و محور کی حیثیت اختیار کرنے لگی۔ گو کہ قیامت کے دن حضورؐ کے شافع محشر کی

حیثیت سے رول کا اکثر تذکرہ کیا جاتا اور شاعر حضرات آں حضرتؐ سے امداد کی درخواست کرتے لیکن اسی زمانے میں قوم کی اصلاح کے خواہش مند رہنما حضورؐ کے پیغام کے عملی پہلوؤں کو اجاگر کرنے لگے۔ یہ وقت کی اہم ترین ضرورت تھی کیوں کہ مسلمانوں کو دوبارہ زور پکڑنے والے مرہٹوں اور سکھوں جیسے غیر مسلم طبقوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر انہیں یہ مسئلہ درپیش تھا کہ وہ انگریزوں کی حکومت میں اپنی زندگیوں میں کیسے توازن پیدا کریں کیوں کہ انگریزوں نے کامیابی کے ساتھ زندگی کے تمام شعبوں پر عملاً اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا۔ اس ضمن میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ شاہ ولی اللہؒ نے مرہٹوں اور سکھوں کے خلاف پٹھانوں (روہیلوں اور احمد شاہ درانی) سے تو امداد کی درخواست کی لیکن انگریزوں کے خلاف کبھی ایک لفظ تک نہ کہا جوان کی زندگی میں ۱۷۵۷ عیسوی میں بنگال میں پلاسی کے مقام پر پہلی فیصلہ کن فتح حاصل کر چکے تھے اور جن کے اثر ورسوخ میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔

شاہ ولی اللہؒ کو پورا یقین تھا کہ وہ رسول اللہؐ کے نائب ہیں چناں چہ انہوں نے ان تمام مسلمانوں کی نہایت سخت الفاظ میں سرزنش کی جو اپنے فرائض اور خدائی احکام کو نظر انداز کرتے ہوئے ہر قسم کی برائیوں میں ملوث تھے، وہ لوگ جو خدائے واحد کی پرستش کرنے کے بجائے بزرگوں کے مزاروں پر حاضری دیتے اور اپنی زمینوں پر شراب کی دکانیں اور قحبہ خانے تعمیر کرنے کی مخالفت نہ کرتے۔ شاہ ولی اللہؒ نے نہایت غیظ وغضب میں ان لوگوں پر بھی رکیک حملہ کیا جو قرآن اور حدیث کے بجائے فلسفے کا مطالعہ کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ استفسار کیا کہ کیا یہ گمراہ ''اسکالرز'' کتوں سے بھی کمینے نہیں ہیں جو دو ہزار سال پرانے فلسفے کی خشک ہڈیوں کو چاٹتے ہیں؟ (شاہ ولی اللہؒ: الطاف القدس صفحہ ۹۵)۔ اس موقع پر سنائیؔ، عطارؔ، رومیؔ اور دوسرے ابتدائی صوفی شاعروں کے اشعار فوراً یاد آجاتے ہیں جنہوں نے بار بار یہ کہا ہے کہ کوئی بھی شخص ہاشمی نبیؐ کی لائی ہوئی شریعت سے اتنا دور نہیں جتنا دور ایک فلاسفر ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کے اپنے فکری نظام کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ ان کی کئی کتابیں عربی یا فارسی کے پیچیدہ اور مخصوص طرز پر لکھی گئی ہیں اور ان کے جملوں کے ٹھیک ٹھیک معنی دریافت کرنا کوئی آسان کام نہیں (اگرچہ ان کے پوتے شاہ اسماعیل شہید نے اپنے دادا کی اصطلاحات کی تشریح کے لیے ایک خاص کتاب لکھی ہے)۔ کئی دوسرے ہندوستانی مسلمانوں کی طرح شاہ ولی اللہؒ بھی رسول کریمؐ کے عربی پہلو کو نمایاں کرتے ہیں اور ''ہاشمی، قریشی، مکی، مدنی'' پیغمبرؐ، جن کے بارے میں قدسیؔ نے ایک صدی پہلے نعتیں لکھی تھیں، ان کے تفکر اور استغراق کا ٹھیک اسی طرح مرکز نگاہ ہیں جس طرح بعد میں محمد اقبالؒ نے آپؐ کی ذات کو مرکزی نکتہ بنایا تھا۔ شاہ ولی اللہؒ نے اسلام کے عربی کردار، اس کی پاکیزگی اور سادگی کا ہندوستان کی مذہبی روایت کی پراگندہ کثرت کے ساتھ موازنہ کیا ہے اور کہا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو دنیا میں ایک مخصوص مقام حاصل ہے جو ہندو 'بت پرستوں' کے درمیان خدا کی وحدانیت کے گواہ ہیں۔

شاہ ولی اللہؒ کے مطابق ہر پیغمبر اپنی ذات میں مختلف مدارج کا حامل ہوتا ہے۔قرب کی کاملیت تقوے اور پرہیز گاری کے ان کاموں سے حاصل ہوتی ہے جو فرض منصبی کے علاوہ ہوں۔(اس مقام کو، جس پر اولیا فائز ہوتے ہیں، قرب نوافل سے تعبیر کیا جاتا ہے)۔خدا کا قرب مذہبی فرائض کو باقاعدگی کے ساتھ ادا کرنے سے ملتا ہے جسے قرب فرائض کہا جاتا ہے (یہ پیغمبروں کا مقام ہے)۔فرشتوں کی دنیا ملکوت کی قربت بھی اسی طرح حاصل ہوتی ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کا ملکوتی دنیا سے، جہاں سے زمین پر واقعات ظہور پذیر ہوتے اور ان کا انتظام ہوتا ہے، نہایت خصوصی تعلق ہے کیوں کہ حضورؐ کا قلب تقدس کے کرے حضرات القدس کا آئینہ ہے۔ یہ وہ کرہ ہے جس میں واقعات آسمانی بادشاہتوں کی اعلیٰ سطح پر منعکس ہوتے ہیں۔حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی روح کا صیقل پتھر ''حجر بہجت'' کے ساتھ بھی موازنہ کیا گیا ہے۔ یہ وہ نظریہ ہے جو ابنِ عربی کے فلسفے میں بہت پہلے پیش کیا گیا تھا۔صرف ایسا صیقل قلب ہی تمام ربانی تجلیات اور القا والہام کو وصول اور اسے منعکس کر سکتا ہے۔خدا کی طرف سے دنیا پر حکمرانی اور اپنی امت کی دیکھ بھال کا منصب عطا ہونے کے بعد یہ ضروری تھا کہ آپؐ کی صیقل کی گئی روح سب سے بااختیار مجلس مشاورت الملا الاعلیٰ کی اہم کارروائیوں میں حصہ لے اور اسے ماضی اور مستقبل کے واقعات کا علم ہو۔ چناں چہ پیغمبر کی روح ماضی کی انسانی نسلوں کے قصوں کو منعکس کرتی ہے اور اسے اپنی امت کی فلاح و بہبود کے لیے اہم چیزوں کا علم ہوتا ہے۔ اسی طرح رسول کریمؐ کو قیامت کے دن پیش آنے والے واقعات کا علم عطا کیا گیا ہے۔غرض شاہ ولی اللہؒ نے ماضی اور مستقبل کے واقعات کے بارے میں حضورؐ کے علم کی وضاحت کی ہے ـــــ ایک ایسا علم جس کا قدرتی حوادث کے حوالے سے نہ تو ادراک ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کی وضاحت کی جا سکتی ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کی ایک عبارت خاصی پراسرار ہے۔انہوں نے آں حضرتؐ کو تین دائروں میں ظاہر کیا ہے۔آپؐ نئے چاند (ہلال) سے مکمل چاند کی صورت اختیار کرتے ہیں جو آپؐ کی کاملیت اور خاتم النبیین کے منصب کی آئینہ دار ہے۔ایک اور پیراگراف میں وہ حضورؐ کو اس انداز سے منفرد حیثیت کا حامل تصور کرتے ہیں جن میں مکمل داخلی ہم آہنگی موجود ہے اور جنہیں تقدس کے کرے کی امداد حاصل ہے۔لیکن اہم بات یہ ہے کہ رسول کریمؐ نے ایک کامیاب امت کی تخلیق میں سرگرم کردار ادا کیا ہے۔روایتی اسلامی طریقے کی رو سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ایک اور حیثیت خاتم النبیین کی ہے جنہیں انسانوں اور جنوں کی طرف مبعوث کیا گیا، جو اپنی امت کے گناہ گاروں کی شفاعت کریں گے اور جنہوں نے اپنے پیروکاروں کو یہ ترغیب دی ہے کہ وہ اپنی زبانوں کو کسی وقفے کے بغیر آپؐ کے محاسن بیان کرنے میں مصروف رکھیں۔

محمد اقبالؒ نے شاہ ولی اللہؒ کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے اسلام میں ایک نئی

روح پھونکنے کی ضرورت کو محسوس کیا تھا۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں شاہ ولی اللہؒ کے ان ریمارکس کا بھی حوالہ دیا ہے کہ ہر پیغمبر اپنی مخصوص قوم کی تربیت کرتا رہا ہے جو بعد میں سب لوگوں کے لیے قابلِ قبول قانون وضع کرنے کے عمل میں بنیاد اور مرکز کی حیثیت سے استعمال ہونے لگی۔ لگتا ہے کہ یہ نظریہ شاہ ولی اللہؒ کی جامع عربی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے ایک اقتباس سے ماخوذ ہے۔ یہ بات بھی دل چسپ ہے کہ اٹھارویں صدی کے اس مصلح کی یہ رائے ہے کہ رسالت کے پیغام کا تعلق ان لوگوں کے کردار سے ہوتا ہے جن کی طرف متعلقہ پیغمبر بھیجا جاتا ہے:

رسالت کسی چیز کو صیقل کر کے اسے جہاں تک ممکن ہو سکے، خوب صورت بنانا ہے خواہ یہ چیز کوئی چراغ ہو یا مٹی کا ڈھیر...... کسی قوم کے جبلی کردار کا اس کے مواد کے ساتھ موازنہ کرنا چاہیے خواہ وہ قندیل ہو یا مٹی!

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پیغمبر مختلف سطحوں پر کیوں تبلیغ کرتے رہے ہیں۔ ایک کے بعد دوسری قوم کے نام ان کے پیغام میں نکھار آتا گیا یہاں تک کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا پیغام پوری طرح جامع اور وسیع ہو گیا۔ صرف آپ کی ذات اقدس میں وحی والہام کے تمام پہلوؤں کو سمونے کا جوہر موجود ہے۔ آپؐ سے پہلے آنے والے پیغمبروں کو اپنے الفاظ اس مخصوص نسل انسانی کے شعور کے موافق ڈھالنا پڑتے جس کی طرف وہ مبعوث کیے گئے تھے۔

شاہ ولی اللہؒ بعض اوقات جدید ریمارکس سے، خاص طور پر نبی کریمؐ کے معجزوں کی تشریح کے سلسلے میں اپنے قاری کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتے ہیں اور جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، ان کے نزدیک چاند کا دوٹکڑے ہونا قدرتی علت کی روشنی میں پوری طرح قابل فہم ہے۔ انہوں نے حضورؐ کے سفر معراج کی تفصیلات بھی انوکھے انداز میں بیان کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آں حضرتؐ کے جسم اطہر کے ذریعے تمام تر کاملیتوں کا بھرپور اظہار ہوتا ہے جب کہ آپؐ کی ''حیوانی کاملیتیں'' براق کی شکل میں ظاہر ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ نے، جنہوں نے چاند کے دوٹکڑے ہونے جیسے معجزوں کا، جن سے مسلمان بے پناہ محبت کرتے ہیں، عقلی استدلال کی روشنی میں تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے ایک طویل، روایتی نظم میں رسول کریمؐ کے معجزوں اور نشانیوں کی تعریف کی ہے جس میں ٹھیک وہی تشبیہیں اور استعارے استعمال کیے گئے ہیں جو فارسی بولنے والی دنیا کے سیکڑوں پا کباز شاعران سے پہلے استعمال کر چکے تھے۔

ایک مسئلہ، جس پر بعد میں آنے والے نقشبندی حضرات بہت زور دیتے رہے ہیں اور جو طریقہ محمدیہ میں اہم رول ادا کرتا ہے، اس کا تعلق قرب نوافل اور قرب فرائض سے ہے۔ پہلی اصطلاح حدیث النوافل کے بارے میں حدیث قدسی سے ماخوذ ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''میرا بندہ فرائض منصبی کی ادائیگی کے علاوہ نوافل کے ذریعے میرے قریب ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ جب وہ ایک بالشت میری طرف آتا ہے تو میں بقدر ایک قدم اس کے قریب جاتا ہوں اور اگر وہ پیدل آئے تو میں دوڑتا ہوا اس کی طرف جاتا ہوں۔ پھر میں اس کے ساتھ اس قدر محبت کرنے لگتا

ہوں کہ میں اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے، میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے۔'' صوفیہ حضرات نے اس حدیث قدسی کی تشریح کرتے ہوئے یہ عندیہ دیا ہے کہ انسان مسلسل ریاضت کے ذریعے خدا کا قرب حاصل کر کے خدا کی ذات میں گم ہو جاتا ہے۔ بے خودی اور مدہوشی کی یہ آخری کیفیت ہے کیوں کہ یہ لوگ روحانی طور پر پوری طرح بے خود ہو جاتے ہیں کہ خدا کی ذات میں گم ہو کر اس دنیا میں واپس آنا نہیں چاہتے۔ (فروز انفر: احادیث مثنوی نمبر ۴۲ نیز Graham: Divine Word and Prophetic Word, pp.98,173)

دوسری طرف ''مذہبی فرائض کی بجا آوری کے نتیجے میں حاصل ہونے والی قربت'' کو پیغمبروں کا طریق کار تصور کیا جاتا ہے جو مذہبی فریضوں کی تسلسل کے ساتھ ادائیگی کے باعث خدائی وحدت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہ نظریہ ایک اور حدیث قدسی کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے جس کی تشریح ''اعتدال کی راہ پر کار بند تصوف'' کے مثالی نمائندے رضی دیا نے ان لفظوں میں کی ہے:

خدا فرماتا ہے: میرا قرب حاصل کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں ہے کہ میں نے بندوں پر جو لازم کیا ہے، اس پر عمل کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرون وسطیٰ کے اس صوفی رہنما کے مطابق ''شریعت کا ہر حکم بلند و برتر جادوئی چیز کے تالے کی چابی ہے۔'' (Razi: The Path of God's Bondsmen, p.151)۔ اس راہ پر چلنے والے لوگ خدائی بادشاہت قائم کرنے کی غرض سے جدوجہد کرنے کے لیے سنجیدہ اور لطیف خیالات لے کر دنیا میں واپس آئیں گے۔ نقشبندیوں کے نزدیک یہ سب سے ممکنہ بلند مقام ہے اور یہ معراج سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی واپسی کی کامل تشریح کے عین مطابق ہے تاکہ آپؐ امت کی رہنمائی کر سکیں۔ خدا سے قربت کے مشاہدے کی ان دو قسموں سے اس فرق کی واضح نشان دہی ہوتی ہے جسے مذہب کے تاریخ دان (ناتھن سوڈربلوم کے دور سے) ''پیغمبرانہ'' اور ''صوفیانہ'' مشاہدے سے تعبیر کرتے ہیں۔

دہلی کے تین صوفی علما میں سے ایک عالم میر دردؔ نے اپنی فارسی کی تصانیف میں کئی ابواب اسی مسئلے کے لیے وقف کیے ہیں۔ ایک نجیب الطرفین سید ہونے اور حضورؐ کے ساتھ قریبی تعلق کی بنا پر وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ اپنے عالی ظرف جد امجد آں حضرتؐ کی مخلصانہ پیروی اور شریعت مطہرہ کے فرائض کی مسلسل ادائیگی کے ذریعے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ اپنے تعلق میں مزید اضافہ کر سکیں گے۔ آخر وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں انہیں یہ مشاہدہ ہوا کہ وہ رسول کریمؐ کے سچے جانشین ہیں اور انہیں بنی نوع انسان کو سچے ''دین محمدی'' کی طرف دعوت دینے کا فریضہ سونپا گیا ہے:

وہ (خدا) مجھ سے ہم کلام ہوا: ''......اے خدا کے نائب اور خدا کی نشانی (آیت)! یقیناً میں نے تمہاری اتباع کی کیفیت دیکھ لی ہے، اب میری ربوبیت کا مشاہدہ کرو کیوں کہ تم میرے بندے ہو جسے میں نے اور میرے پیغمبرؐ نے قبول کرلیا ہے......''

اور جب دردؔ نے یہ تسلیم کرلیا کہ وہ ''تمہارے محبوبؐ کی اولاد اور تمہاری بلبل (عندلیب) کا حصہ ہے تو خدا اس سے یوں مخاطب ہوا: ''میں نے تمہیں میزان اور محمدؐ کو میزان کہہ کر پکارا ہے، اب جو بھی تمہاری اطاعت کرے گا، وہ خدا اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرے گا۔'' (درد: علم الکتاب صفحہ ۶۱)۔

غرض ۶۰۔۱۷۵۰ عیسوی کے لگ بھگ نہ صرف شاہ ولی اللہؒ خود کو رسول کریمؐ کا نائب سمجھتے تھے بلکہ میر دردؔ بھی اپنی مسندنشینی کے مشاہدے کے بعد اپنے آپ کو ہر لحاظ سے حضورؐ کا نائب تصور کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں میں سے کسی بھی بزرگ نے، جو دہلی میں زیادہ فاصلے پر نہیں رہتے تھے، اپنی کتابوں میں ایک دوسرے کے نام کا ذکر نہیں کیا (گو کہ شاہ ولی اللہ کے بیٹے دردؔ کے ساتھ مل کر اردو شاعری کا مطالعہ کرتے تھے)۔

یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ اٹھارویں صدی کے دوران ہندوستان میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تاریخی یا نیم تاریخی کردار کو نئی اہمیت یہاں کی سیاسی صورت حال کی بنا پر دی گئی کیوں کہ مصائب کا شکار امت مسلمہ کو اپنی بقا کے لیے ایک مضبوط اور روشن و درخشاں عملی نمونے کی ضرورت تھی۔ اس تحریک کے پس پردہ فرقتِ وطن کا عارضہ اور سنہری دور کے لوٹ آنے کی آرزو بھی کارفرما تھی۔ کیا حضورؐ نے خدا کی آخری شریعت کی حامل ''تمام امتوں میں سب سے افضل امت'' تخلیق نہیں کی تھی؟ لیکن اب یہ امت ماضی کی شان و شوکت کے باوجود علاقے میں سکھوں، ہندوؤں اور یورپی قوموں کی یلغار کے سامنے بے بس تھی اور اس کے پاس ماضی کے احساس تفاخر کے سوا کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ اصل وطن کی یاد کو حضور رسالت مآبؐ کی عزت وتکریم کے حوالے سے اب تک ایک اہم جزو کی حیثیت حاصل رہی تھی اور مسلمانوں کا آئیڈیل دور وہ تھا جب وہ آں حضرتؐ کی قیادت میں فتح پر فتح حاصل کرتے چلے آ رہے تھے۔ ہندوستان کے محصور مسلمانوں کے پاس اب اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا کہ وہ اس امید کے ساتھ حضورؐ کی ذات اقدس سے دوبارہ رجوع کریں کہ اس طرح ملت اسلامیہ ایک مرتبہ پھر اقبال مند ہو جائے گی۔

اس دلی آرزو کے باوجود مسلمانوں کی حالت سال بہ سال ناگفتہ بہ ہوتی جارہی تھی۔ ۱۸۰۶ عیسوی کے بعد آخری مغل حکمران عام طور پر برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ لیکن طریقہ محمدی کی حرارت اب بھی دلوں کو گرما رہی تھی۔ ۱۷۸۵ عیسوی میں میر دردؔ کی وفات کے کوئی ۳۵ سال بعد طریقہ محمدیہ نے ایک سیاسی تحریک کی شکل اختیار کرلی جسے شاہ ولی اللہؒ کی اولاد کی دینی سطح پر مکمل حمایت حاصل تھی۔ اس تحریک کے بانی

رائے بریلی کے سید احمد نے اپنے ساتھیوں سے مل کر ان سکھوں کو برصغیر کے شمال مغربی علاقوں سے نکال باہر کرنے کی کوشش کی جو مسلم اکثریت کے ساتھ آباد تھے۔(History of the Freedom Movement؛ غلام رسول مہر، سید احمد شہید نیز Hunter: Our Indian Musalmans)۔ ابتدائے اسلام کی طرح حریت پسند بھی نبی کریمؐ کی ذات اقدس کو مرکز و محور تصور کرتے تھے چناں چہ سچے مسلمان ان کے گرد اکٹھے ہو جاتے اور حضورؐ کی حیات طیبہ کی یاد انہیں اس پختہ یقین پر آمادہ کرتی کہ اسلام کو آخر کار تمام دشمنوں پر فتح حاصل ہو جائے گی۔ ۱۸۳۱ عیسوی میں سکھوں کے ہاتھوں سید احمد اور ان کے مذہبی مشیر شاہ ولی اللہؒ کے پوتے اسماعیل کی شہادت کے بعد ملت اسلامیہ کا شیرازہ بکھر جانے کے باوجود باقی ماندہ حریت پسندوں کا جوش و خروش برقرار رہا اور وہ اپنے اعلیٰ نصب العین کی خاطر کئی عشروں تک لڑتے رہے۔ اب وہ سکھوں کے بجائے انگریزوں کے خلاف برسرِ پیکار تھے اور یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ وہ ہندوستان میں ایک حقیقی اسلامی حکومت بحال کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

یہ سیاسی تحریک، جو رسول کریمؐ کی ذات پر مرکوز تھی، صرف ہندوستان تک محدود نہیں تھی بلکہ تقریباً اسی زمانے میں جب ہندوستان کے مسلم حریت پسند حضورؐ کے نام پر اٹھ کھڑے ہوئے تھے، شمالی افریقا اور اسلام کی وسطی ریاستوں میں بھی اسی قسم کی تحریکیں شروع ہو گئیں۔ تصوف کے دونوں سلسلے سنوسیہ اور تجانیہ شروع ہی سے آں حضرتؐ کی شخصیت کو اپنی مذہبی زندگی کا مطمحِ نظر تصور کرتے تھے چناں چہ انہوں نے فاتح فوجوں کے لیڈر کی حیثیت سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے رول کو اپنا مرکز نگاہ بناتے ہوئے ''خدا اور اس کے رسولؐ کے نام پر'' فرانس اور اٹلی کی نوآبادیاتی طاقتوں کے خلاف لڑنا شروع کر دیا۔

رسول اللہؐ کے ساتھ گہری محبت اور عقیدت تصوف کے سنوسیہ سلسلے کا طرہ امتیاز اور آپؐ کی ذات ہی ان کا محور ہے۔ تقریباً اسی زمانے میں مکہ مکرمہ میں مرغانیہ سلسلہ پروان چڑھنے لگا اور مصر اور سوڈان میں اسے قبول عام حاصل ہونے لگا۔ اس سلسلے کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اس میں دوسرے تمام سلسلوں کے مقابلے میں حضورؐ کی شخصیت سے کہیں زیادہ عقیدت اور محبت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ان تمام مذہبی گروپوں سے تعلق رکھنے والے لوگ آج تک جو دعائیں، مناجاتیں اور طلب فیضان کے لیے ورد کرتے ہیں، ان سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ انہیں حضورؐ کے ساتھ کس قدر محبت ہے!

کانسٹینس ای پیڈوک Constance E. Padwick نے ان تحریکوں کے رہنماؤں کے بنیادی مشاہدے کا ذکر کرتے ہوئے احمد التجانی کے بارے میں لکھا ہے:

خدا نے انہیں جن انعامات سے نوازا، ان میں خواب میں رسول کریمؐ کی مسلسل زیارت شامل ہے اور حالت یہ تھی کہ

حضورؐ آنکھ جھپکنے کے لیے بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتے تھے۔ ان پر خدا کا ایک اور فضل وانعام یہ تھا کہ وہ ہر بات کے متعلق نبی کریمؐ سے سوال اور ہر چھوٹے بڑے معاملے میں آپؐ کے ساتھ مشورہ کرتے تھے چناں چہ ان کی تربیت مکمل طور پر آں حضرتؐ کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ (Padwick: Muslim Devotions, p. 150)۔

اسی طرح سنوسیہ (اور مرغانیہ سلسلے) کے بانی کا اپنے محبوب پیغمبرؐ کے ساتھ مسلسل رابطہ رہتا تھا: تصوف کے اس سلسلے کی بنیاد اس کے بانی کی داخلی زندگی میں رسول اللہؐ کی ذات اقدس کی زیارت میں جذب ہونے پر رکھی گئی ہے جو اپنی ظاہری زندگی میں حضورؐ کے ہر قول و فعل کی مکمل اتباع کرتے تھے۔ اسی طرح ان کی زبان پر ہر وقت رسول کریمؐ پر مسلسل درود و سلام کا ورد جاری رہتا تھا۔ وہ تنہائی میں ریاضت اور کھلے عام عبادت کے دوران بھی یہی ورد کرتے رہتے یہاں تک کہ ان کے قلب پر آں حضرتؐ کی حمد وثنا کا غلبہ ہوگیا اور یہ عمل ان کی روح میں سرایت کر گیا۔ حضورؐ کا ذکر سنتے ہی ان پر جذب و مستی کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ آپؐ کی زیارت کا شوق ہمہ وقت ان کے دل میں سمایا رہتا۔ غرض حضورؐ کے سوا دوسری کسی مخلوق کا ان کے نزدیک کوئی وزن نہیں تھا۔ (Padwick: Muslim Devotions, pp.150-51)۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، تجانیہ سلسلے کے رہنما اپنے پیروکاروں کو زیادہ سے زیادہ مرتبہ الفاتحہ دعا پڑھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اس دعا کو بھی، جسے عزیمیہ کہتے ہیں، پڑھتے ہیں:

خدایا! میں تجھ سے تیرے چہرے کے نور کی وساطت سے، جس سے عرش عظیم اور تمام جہان معمور ہیں، سوال کرتا ہوں کہ تو ہمارے عظیم المرتبت آقا اور خدائے بزرگ و برتر کے پیغمبرؐ کی آل پر رحمتیں نازل فرما! (Padwick: Muslim Devotions, pp.164-65)۔

مرغانیہ سلسلے میں، جس نے دعائیہ شاعری اور حضورؐ پر درود و سلام بھیجنے سے متعلق وسیع لٹریچر شائع کیا ہے، ایک عقیدت منداس طرح دعا کرتا ہے:

اے خدایا! اپنے پیغمبرؐ کے عظیم مرتبے، آپؐ کے ساتھ اپنی شفقت و رافت اور تیری ذات سے حضورؐ کی بے پناہ محبت کے صدقے میں تجھ سے سوال کرتا ہوں...... اے مالک! میری طرف سے آپؐ کے ساتھ محبت کے طفیل، میرے کانوں کو آں حضرتؐ کی گفتگو سے بہرہ مند کر! (Padwick: Muslim Devotions, p.147)۔

انیسویں صدی میں مشرق اور مغرب کے مسلمانوں میں یہ دعائیں بہت مقبول تھیں لیکن یہ صدی پورے عالم اسلام کے لیے سیاسی انتشار کا زمانہ تھا۔ چناں چہ اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں بھی بعض ہندوستانی مسلمان حضورؐ کے رول کے ضمن میں مختلف قسم کی موشگافیاں کرتے رہے ہیں۔ ممتاز عالم دین فضل حق خیرآبادی، جنھیں ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف ناکام فوجی بغاوت میں سرگرمی سے حصہ لینے کی پاداش میں جلاوطن کر کے جزائر

انڈیمان بھیج دیا گیا تھا، طریقہ محمدیہ کے ایک رہنما اسماعیل شہید کے ساتھ اس مسئلے پر بحث مباحثہ کرتے رہے ہیں کہ آیا ضرورت پڑنے پر خدا ایک اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پیدا کر سکتا ہے؟ مولانا فضل حق کا استدلال تھا کہ خدا کسی بھی صورت میں ایک اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تخلیق نہیں کر سکتا۔ ان کے برعکس اسماعیل شہید کا کہنا تھا کہ خدا ایسا کر سکتا ہے لیکن وہ ایسا نہیں کرے گا۔ جب مرزا غالبؔ سے، جنہوں نے اس کے فوراً بعد ۱۰۱ اشعار پر مبنی ایک پرشکوہ نعت لکھی، اس سلسلے میں رائے دریافت کی گئی تو ان کے جواب سے ان کے دوست فضل حق کو مایوسی ہوئی، انہوں نے اسماعیل شہید کی حمایت کی اور اپنے خیالات کو بڑی احتیاط کے ساتھ اس فارسی شعر میں پیش کیا:

ہر کجا ہنگامہ عالم بود

رحمت للعالمینے ہم بود!

ترجمہ: جہاں کہیں بھی کائنات کا ہنگامہ ہوگا

وہاں ایک رحمت للعالمین بھی ہوگا

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر خدا ذہین مخلوق پر مشتمل دوسری دنیاؤں کو پیدا کرے تو وہ انہیں پیغمبرانہ رہنمائی سے محروم نہیں کرے گا۔ اس کے ایک سو سال بعد محمد اقبالؒ نے جاوید نامے میں یہی نظریہ پیش کیا کیوں کہ وہ مسئلہ، جو انیسویں صدی کے شروع میں واقعی غیر اہم تھا، سائنسی ترقی کی بدولت اب زیادہ اہمیت اختیار کر گیا تھا، مثال کے طور پر علم ہیئت کے ماہرین کی طرف سے زیادہ اور بڑے کہکشاؤں کی ایجاد اور ان کی ساخت اور ترکیب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں نامیاتی زندگی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ اس صورت میں ان دور افتادہ دنیاؤں میں بسنے والوں پر کیا بیتے گی؟ کیا انہیں پیغمبروں کی روحانی رہنمائی کی ضرورت نہیں ہوگی؟ لیکن اگر ایسا ہے تو غالبؔ کے جواب کو اسلام کے ختم نبوت کے مرکزی اصول اور عقیدے کے ساتھ کس طرح ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے؟ محمد اقبالؒ نے جاوید نامے کی اس نظم میں، جس میں یہ نازک نکتہ اٹھایا گیا ہے، بڑی مہارت کے ساتھ مزید بحث کرنے سے گریز کیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے سید سلیمان ندویؒ سے جو خط و کتابت کی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ غالبؔ کے اس شعر سے خاصے پریشان تھے۔ (اقبال نامہ، ۱: ۱۱۷۔ ۱۹۲۲ء)۔

لیکن انیسویں صدی کے مسلمان مفکران نظریات پر نسبتاً کم غور و خوض کرتے تھے۔ ہندوستان اور بعد میں مصر کے مسلمانوں کو ان سے بھی زیادہ سنگین مسئلوں کا سامنا تھا۔ ان کے انگریز نوآبادکار حاکموں نے ان کے محبوب پیغمبرؐ کے بارے میں یورپی مستشرقین کی لکھی ہوئی کتابیں متعارف کرا دیں اور وہ ایک حیران کن وحشت کے عالم میں ولیم موئر William Muir اور الائز اسپرنگر Aloys Springer کی لکھی ہوئی حضورؐ کی سوانح عمریاں پڑھتے رہے چناں چہ یہ ایک فطری

بات ہے کہ آں حضرتؐ کی حیات مقدسہ کے بارے میں یورپی مصنفوں کے ''تنقیدی'' انداز فکر کے نتیجے میں رونما ہونے والے پہلے تصادم کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ایک نیا مذہبی طریق کار اختیار کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ ظاہر ہے کہ عقاید سے متعلق یہ نئی علمی اور منطقی بحث عام طور پر معذرت خواہانہ تھی اور اس میں رسول کریمؐ کی شخصیت پر زیادہ زور دیا گیا۔

ہندوستانی اسلام کے عظیم مصلح سر سید احمد خان سب سے پہلوں میں ایک تھے، اگر وہ پہلے نہیں تھے، جنھوں نے پیغمبر اسلامؐ کے متعلق، جن کے ساتھ انہیں بے پناہ محبت تھی، مذہبی خیالات کو جدید خطوط پر استوار کیا۔

(i) Troll: Sayyid Ahmad Khan (ii) Baljon: The Reforms and Religious Ideas of Sayyid Ahmad Khan

لیکن کٹر عقاید رکھنے والے مسلمانوں نے انگریزوں سے تعاون کرنے پر پوری قوت کے ساتھ سر سید پر حملہ کیا اور چوں کہ سر سید نے روایتی مذہبی تعلیم کسی مدرسے میں حاصل نہیں کی تھی اس لیے ایک عام دنیادار کی حیثیت سے انہوں نے مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو جدید بنانے کے حق پر ناجائز تصرف کیا تھا۔ سید احمد نے اپنی ابتدائی جوانی کے زمانے میں ــــ جب وہ سنت پر سختی سے کاربند رہنے والے مسلمان تھے ــــ ایک ''اصلاح یافتہ مولود'' لکھی تھی جس کے ذریعے وہ حضورؐ کی شخصیت کو روایتی اور الحاقی قصے کہانیوں سے پاک کرنا چاہتے تھے۔ نقشبندیوں کی طرح ان کا آئیڈیل بھی یہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنی زندگی میں اخلاق محمدی پر عمل کرنا چاہیے اور اخلاقیات کے تمام معاملوں میں آپؐ کے اسوہ حسنہ کی پیروی کرنی چاہیے۔ اپنے پیشرو شاہ ولی اللہؒ کی طرح سید احمد بھی یہ تسلیم کرتے تھے کہ قرآن کریم کی بہت زیادہ تفسیریں، الٰہیات کے عالم اور اضافی تشریحیں مسلمانوں کے لیے زبردست خطرہ ہیں کیوں کہ یہ تفسیریں اس مقدس کتاب کے سادہ اور واضح پیغام کو درخشاں و تاباں کرنے کے بجائے اسے دھندلا دیتی ہیں۔ چناں چہ وہ اس بات پر نوحہ کناں ہیں کہ خدا کے احکام ''جو اعلیٰ کردار کے حامل معصوم، امین اور سادہ دل پیغمبرؐ'' جاہل اور ان پڑھ صحرا نشینوں کے لیے صاف، واضح اور سادہ الفاظ میں لے کر آئے تھے، اب انہیں محض ندرت پیدا کرنے کی غرض سے لطیف مابعد الطبیعیاتی مسئلوں اور منطقی موشگافیوں کے ذریعے اس قدر تبدیل کر دیا گیا ہے کہ ان کی حقیقی پاکیزگی اور سادگی کو پہچاننا ناممکن ہو گیا ہے۔ (H.A.R.Gibb: Whither Islam, p.199)۔ پچاس سال بعد محمد اقبالؒ نے بھی انہی لفظوں میں یہ شکایت کی: ''مجھے یقین ہے کہ اگر رسول اکرمؐ کا ایک مرتبہ پھر ظہور ہو اور آپؐ اس ملک میں اسلام کا درس دیں تو اس ملک کے باشندے موجودہ حالات اور طرز عمل کی وجہ سے اسلام کی صداقت کو سمجھ نہیں پائیں گے۔'' (محمد اقبالؒ کا ۲۰ جنوری ۱۹۲۵ء کا مکتوب نیز شمل: Gabriels Wing, p.74)۔

سر سید اس نکتے پر مسلسل غور و فکر کرتے رہے کہ نبی کریمؐ کی ذات اقدس کو کس طرح ملتِ اسلامیہ کے لیے

ایک زندہ حقیقت بنایا جائے اور دنیا کے سامنے آپ کی عظمت کو کیسے ثابت کیا جائے ــــــ ایسی عظمت اور بزرگی جو مغربی طاقتوں کے مقابل مسلمانوں کی موجودہ صورت حال کے تناظر میں ڈرامائی طور پر نمایاں دکھائی دے سکے چناں چہ انہوں نے مختلف معجزوں پر مشتمل کتابیں لکھیں اور اس موضوع پر کئی تقریریں کیں۔ (Troll: Sayyid Ahmad Khan, pp.322-24)۔ سرسید کے Essay on the Life of Mohammad میں ان مغربی مصنفوں کے کئی اقتباسات کا حوالہ دیا گیا ہے جنہوں نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی برتری اور بڑائی کے متعلق مثبت بیانات دیے تھے۔ اس قسم کے اقتباسات معذرت خواہانہ ادب کا حصہ بن گئے۔ تھامس کارلائل ہندوستان کے تمام جدت پسند مسلمانوں کے لیے پسندیدہ مصنف تھے جن کی کتاب On Heroes and Heroworship میں آں حضرتؐ کے بارے میں ریمارکس کو مسلمانوں نے اس قدر دہرایا ہے کہ آپؐ کے متعلق اُس کے تنقیدی الفاظ کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا یا ان سے تغافل برتا گیا۔ (Watt: Carlyle and Muhammad)۔ واشنگٹن ارون Washington Irvin کی کتاب کے حوالے بھی مثبت انداز میں دیے گئے۔ (ارون کی تصنیف Life of Muhammad کا جلد ہی تمام بڑی یورپی زبانوں میں ترجمہ ہو گیا۔ اردو میں اس کتاب کا ترجمہ ۱۸۹۲ عیسوی میں کیا گیا)۔ بدقسمتی سے ہندوستان کا کوئی بھی مصلح جرمن زبان نہیں جانتا تھا اس لیے وہ گوئٹے کی Mahomets Gesang اور West-Ostlicher Divan (کارلائل کا ذریعہ وجدان) میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں گوئٹے کے مثبت خیالات کا مطالعہ نہ کر سکے اور یہ محمد اقبالؒ ہی تھے جنہوں نے پچاس سال بعد اس المناک فروگذاشت کا ازالہ کیا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان مصلح، جو فرانسیسی نوآبادکار حکمرانوں کے علاقوں میں رہتے یا فرانس کی ثقافت کے زیرِ اثر تھے، روشن خیالی کے دور میں فرانسیسی زبان میں لکھی جانے والی ان کتابوں سے آگاہ نہیں تھے جن میں کئی مصنفوں نے (جن کا آغاز Boulainvilliers سے ہوتا ہے) پیغمبر اسلامؐ کی حیات طیبہ کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ نے سیرت مقدسہ کو آں حضرتؐ سے منسوب کئی فرضی داستانوں سے پاک کرنے کی تذبذب کے ساتھ پہلی کوشش کی، سرسید نے اس ضمن میں ان کی پیروی کی اور گو کہ ان کی ابتدائی تصانیف میں ''رسول کریمؐ کے ہزاروں لاکھوں معجزوں'' کا خصوصی تذکرہ کیا گیا تھا، اس کے باوجود انہوں نے شاہ ولی اللہؒ کی کتابوں کے بڑے پیمانے پر حوالے دیے۔ (Troll: Sayyid Ahmad Khan, p.43)۔ مثال کے طور پر وہ یہ یقین کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے کہ بدر کی جنگ میں فرشتوں نے آں حضرتؐ کی امداد کی تھی، وہ اس نظریے کو ترجیح دیتے تھے کہ اس معرکے میں صرف خدائے ذوالجلال کی منشا کارفرما تھی اور خدا نے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے فرشتوں پر کوئی بوجھ نہیں ڈالا تھا۔ (احمد خان: مقالات سرسید جلد ۱۳۔ صفحات ۹۲ تا ۱۰۳)۔ سرسید کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ رسالت ایک جبلی انسانی جوہر ہے۔

یہاں ان کے جز وقتی رفیق کار مولانا شبلی نعمانیؒ بھی ان کی پیروی کرتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ نبوت ''فطری اور خلقی اوصاف کے ارتقا میں آخری اور کامل ترین مرحلہ ہے، یہ ایک روحانی وصف یعنی قوت قدسیہ یا ملکۂ نبوت ہے۔''

-(Troll: Reason and Revelation in the Theology of Mawlana Shibli Numani, p.25)

جہاں تک اس عقیدے کا تعلق ہے کہ قرآن کریم لفظ بہ لفظ ایک الہامی کتاب ہے، سرسید شاہ ولی اللہؒ سے بھی زیادہ کٹر عقیدے پر کاربند ہیں اور وہ اس امکان کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر صرف قرآن حکیم کے معانی وحی کی صورت میں نازل ہوئے تھے جنہوں نے بعد میں انہیں انسانی زبان کے قالب میں ڈھالا تھا۔سرسید قرآن مجید کے ہر ہر لفظ کو ربانی اور طاقت ور لفظ سمجھتے تھے۔ان کے نزدیک حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک بے مثل مستند رہنما ہیں اور آپؐ نے اپنی عملی زندگی پر توحید کے نظریے کا کامل اطلاق کر رکھا تھا۔(Troll: Sayyid Ahmad Khan and Islamic Jurisprudence, p.91)۔اور اسی شخص نے، جس پر ماڈرن ازم کے الزام میں رکیک حملے ہوئے تھے، ایک ایسی رقت انگیز دعائیہ نظم لکھی جس میں صدیوں پیشتر صوفیہ حضرات کی لکھی ہوئی دعاؤں جیسی گرمی جذبات موجود ہے:

ترجمہ: اے میرے خدا! مجھے آتش سوز و ساز میں جلتا ہوا سینہ عطا کر!

اے میرے خدا! مجھے روتی ہوئی آنکھیں بخش دے!

اے میرے خدا! مجھے احمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عشق سے مخمور رکھ!

اے میرے خدا! جو کوئی حضورؐ کے عشق میں مبتلا ہے، اسے معاف کر دیا گیا ہے

اے میرے خدا! مجھے مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عشق سے بہرہ ور کر اور

پھر مجھے آپؐ سے وصل کا مرہم عطا کر

اے میرے خدا! مجھے مدینے کی خاک بنا دے!

میری کشتی کو اس کے گھاٹ سے باندھ دے!

اے میرے خدا! مجھے وقت کے تغافل سے آزاد کر دے!

مجھے المصطفیٰؐ کے مدفن پر پہنچا دے جو کل کائنات کے آقا ہیں

مجھے ایمان کی دولت کے ساتھ آپؐ کے شہر میں آسودہ خاک کر

جنت البقیع میں میری قبر بنا دے......

اے احمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! میری روح کو آپؐ کے قدموں میں ہی چین ملتا ہے

اس جگہ کے لیے میں نے خدا سے دعا کی ہے

تعلیمی جریدے ''تہذیب الاخلاق'' میں سرسید کے ایک رفیق کار حیدرآباد دکن کے چراغ علی تھے۔ وہ تنقیدی انتہا پسندی میں سرسید پر بھی سبقت لے گئے۔ انہوں نے بیشتر احادیث کو مسترد کر دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ احادیث سے ''ایک پراگندہ سمندر'' عالم وجود میں آ گیا ہے۔ وہ وسیع تر الفاظ میں صرف دینی مسئلوں میں آں حضرتؐ کو سند مانتے تھے چناں چہ انہوں نے لکھا ہے:

''بلاشبہ ہمیں دینی معاملوں میں حضورؐ کی امداد کی ضرورت ہے اور ہم اس حیثیت میں آپؐ کی رہنمائی کو تسلیم کرتے ہیں لیکن جب آپؐ اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں تو آپؐ بھی صرف ایک انسان تھے۔'' دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضورؐ جب مذہبی امور پر گفتگو کرتے تو آپؐ کی بات چیت سہو و خطا اور لغزش سے پاک ہوتی لیکن دنیوی معاملوں پر اظہار خیال کرتے وقت آپؐ غلطی کے مرتکب ہو سکتے تھے۔ چناں چہ آپؐ کو زراعت اور طب کے مسئلوں میں ایک معلم کا درجہ حاصل نہیں تھا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، یہ عقیدہ کلاسیکل اسلام میں بھی موجود تھا، مثال کے طور پر باقلانی کے نظریات! لیکن چراغ علی کی طرف سے احادیث پر نکتہ چینی تمام مسلمہ معیاروں سے آگے نکل گئی۔ (چراغ علی نے اس قدر انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا جس طرح گولڈزیہر Goldziher نے چراغ علی کی وفات کے بعد جرمن زبان میں شائع ہونے والی کتاب Muhammedanische Studien میں کیا تھا۔ یہ دونوں افراد ایک دوسرے سے واقف نہیں تھے)۔ چراغ علی کے اس حد سے زیادہ انتہا پسندانہ رویے کے سبب ہندوستان کے اہل حدیث سرسید اور ان کے جدت پسندانہ نظریات سے سخت متنفر ہیں۔

لیکن سرسید اور ان کے بے شمار دوستوں میں سے کوئی بھی شخص، جس نے حضورؐ کی احادیث مبارکہ کی جدید تشریح کے ذریعے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اسلام ترقی سے پوری طرح موافقت رکھتا ہے، سید امیر علی کی کتاب The Life and Teachings of Muhammad یا Spirit of Islam میں پیش کی جانے والی حضورؐ کی دل کش تصویر اور اسلامی کلچر کا مقابلہ نہ کر سکا۔ یہ کتاب سرسید کی وفات کے تھوڑی دیر پہلے شائع ہوئی اور اسلامی ملکوں میں لٹریچر کی اس نئی صنف کے نمونے کے طور پر اس کی حد درجہ پذیرائی ہوئی اور جیسا کہ ولفریڈ کینٹ ویل اسمتھ Wilfred Cantwell Smith نے لکھا ہے: ''اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان اپنے پیغمبرؐ پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔'' (W.C.Smith: Modern Islam in India, p.52)۔ سید امیر علی کی کتاب میں نبی کریمؐ کی شخصیت کو ان تمام خوبیوں کا حامل قرار دیا گیا ہے جن کا ایک انسان تصور کر سکتا ہے۔ انہوں نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیات طیبہ کے خارجی پہلوؤں پر، جس طریقے سے آپؐ دستار باندھتے تھے یا آپؐ کو کون سا پھل پسند تھا، جو سیرت کی عام کتابوں کے بڑے موضوع ہیں، اظہار خیال نہیں

کیا بلکہ ان کے بجائے آپؐ کے روحانی رویے، آپؐ کے فلسفہ حیات اور اخلاقی محاسن کو موضوع سخن بنایا ہے۔ Spirit of Islam میں آں حضرتؐ کی پاک دامنی اور عجز وانکسار کے پہلوؤں پر زور دیا گیا ہے اور تمام امتیوں کے لیے آپؐ کی رحمت ورافت کو اجاگر کیا گیا ہے۔تشدد، جبر واکراہ اور مشکل حالات میں حضورؐ نے جس صبر واستقلال اور تحمل و برداشت کا مظاہرہ کیا، مسلمانوں کے لیے وہ ایک بہترین نمونہ ہے۔غرض اس کتاب میں آپؐ کو تصوف کی دنیا کا انسان کامل ظاہر کرنے کے بجائے اس زمین پر پیدا ہونے والا یکتائے روزگار اور کامل ترین انسان ثابت کیا گیا ہے۔ سید امیر علی اور ان کے تمام پیروکاروں کے نزدیک حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حقیقی معنوں میں ایک ماڈرن انسان ہیں۔ان لوگوں کو یقین ہے کہ جب مسلمانوں نے اس نکتے کو سمجھ لیا تو انہیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اسلام نہ صرف ترقی کی موافقت کرتا ہے بلکہ ترقی کا نام اسلام ہے۔

مذہبی عقاید کو زمانے کے حالات کے مطابق بنانے کے علم برداروں کو علمی موشگافیوں اور مذہبی نزاکتوں کے بجائے بنیادی طور پر علمی مسئلوں میں زیادہ دل چسپی تھی اس لیے انہوں نے خود سے یہ دریافت کیا کہ بچوں کو حضورؐ کے متعلق تمام دل کش لیکن غیر ضروری روایتی داستانیں پڑھنے یا آپؐ کے تصوفانہ خصائص کے بارے میں نظمیں یاد کرنے کی کیا حاجت ہے، دین اسلام کے بانی کی استدلالی تصویر ان کے لیے زیادہ مفید ہے تاکہ وہ حضورؐ کی توہین آمیز تشریح کرنے والے مغربی اسکالرز کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو سکیں اور دوسرے یہ کہ وہ رسول کریمؐ کی طرف سے ہمیشہ کے لیے پیش کیے جانے والے عملی نمونے کے مطابق اپنی زندگی بسر کر سکیں۔

جس طرح انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں افسانوی مسیحؑ کے ساتھ عقیدت کی تذلیل کر کے عیسائیوں کے پروٹسٹینٹ عقاید میں کشش پیدا ہو گئی، اسی طرح عالم اسلام میں بھی ایک سیرت تحریک چل پڑی جس کے نتیجے میں رسول کریمؐ کی سوانح حیات پر مبنی نئی کتابوں کا سیلاب آ گیا۔(دل چسپ بات یہ ہے کہ انیسویں صدی کے آخر کے مصری ریفارمر محمد عبدہٗ کی لائبریری میں ڈیوڈ فریڈرک اسٹراس David Friedrick Straus کی لکھی ہوئی کتاب Life of Jesus کا ایک نسخہ موجود تھا۔چناں چہ مسلمانوں کے سیرت نگاری پر مشتمل لٹریچر پر اس کتاب کا اثر ایک فطری بات ہے)۔(Hourani: Arabic Thought in the Liberal Age, p.135)۔ہندوستان میں سیرت تحریک کا آغاز موجودہ صدی کے پہلے نصف حصے میں ہوا۔کتابوں کی دکانیں جلد ہی حضورؐ کی مختلف النوع سوانح عمریوں سے بھر گئیں۔ان میں اردو زبان میں مولانا شبلی نعمانیؒ کی سیرت النبی کو (جسے ان کے جانشین سید سلیمان ندویؒ نے مکمل کیا) ممتاز مقام حاصل ہے۔اس طرح ''ہمارے محبوب پیغمبر'' یا ''دلربا پیغمبرؐ کی پیاری زندگی'' جیسی مقبول عام کتابیں شائع ہونے لگیں۔تاریخیت کے تناظر میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیات طیبہ میں اس قدر گہری دل چسپی پیدا ہو

گئی کہ ۱۹۱۱عیسوی میں سندھ کے ایک ہندو اسکول ماسٹر لال چند جگتانی نے اس لیے رسول کریمؐ کی سیرت طیبہ شائع کردی کیوں کہ اسے اس بات سے تشویش ہوگئی تھی کہ اس کے مسلمان شاگردوں کو اپنے دین کی تاریخی اساس اور حضورؐ کی سوانح عمری کا کوئی علم نہیں تھا اور انہیں محض عوامی شاعری میں محفوظ قصے کہانیاں یاد تھیں۔ تین سال بعد حیدرآباد سندھ کے ایک مسلمان نے سندھی زبان میں سیرت کی پہلی کتاب لکھی۔ عہد حاضر کا قاری ہندو مصنف کی لکھی ہوئی سیرت کو پڑھ کر اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کیوں کہ اس نے کسی تعصب کے بغیر یورپی اور فارسی دونوں ماخذوں سے استفادہ کیا تھا۔ اس کے بعد اردو، پنجابی، سندھی اور کئی دوسری زبانوں میں شاعری اور نثر میں آں حضرتؐ کی سیرت طیبہ پر کئی کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں دیسی زبان میں لکھی گئی تازہ ترین کتاب سندھی کی مثنوی محمدی (۱۹۵۸عیسوی) شامل ہے۔ یہ طویل نظم حافظ عبداللہ بسمل نے لکھی ہے۔ لاہور میں شیخ محمد اشرف اور اسی شہر میں فیروز سنز کی پبلشنگ لسٹ پر ایک نظر ڈالنے سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیات طیبہ پر شائع ہونے والی مختلف کتابوں کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے جن کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے باوجود ۱۹۶۰ کے عشرے میں مشرقی بنگال کے ایک گاؤں میں واقع بعض مقبروں کے سال تعمیر کے بارے میں میرے استفسار پر وہاں کے ایک معمر شخص نے معصومیت سے کہا: ''بہت بہت پرانے، میم! کئی ہزار سال پرانے، ہمارے پیغمبرؐ کی طرح!'' سیرت تحریک کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں کو تاریخ سے آگہی حاصل نہیں (اور صورت حال اب بھی ویسی ہی ہے)۔

باایں ہمہ تاریخی حقائق سے روشناس کرانے کی کوششوں کے نتیجے میں حضورؐ کے معجزوں کے متعلق مسلمانوں کا نقطہ نظر کسی حد تک تبدیل ہو گیا ہے۔ شیخ قدوائی نے ۱۹۰۶ء میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معجزوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپؐ کا سب سے بڑا معجزہ وہ نہیں جس پر عوام الناس یقین رکھتے ہیں مثلاً چاند کو دو ٹکڑے کرنا، کھجور کے درخت کا آہیں بھرنا یا بھیڑ کا باتیں کرنا بلکہ آپؐ کا سب سے بڑا معجزہ عرب کی سماجی، روحانی، اخلاقی اور مذہبی تبدیلی ہیئت ہے۔ اس رجحان کو بعد میں آنے والے عشروں میں معذرت خواہانہ لٹریچر میں مرکزی نکتے کی حیثیت حاصل ہونے والی تھی۔ جیسا کہ سرسید نے کہا تھا، کیا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ سچا معجزہ نہیں کہ آپؐ نے ''رہزن بدویوں'' کو مہذب انسان بنا دیا تھا؟ یا اگر دوسرے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ایک انسان ہونے کے ناتے کیا آپؐ کاملیت کے اس درجے پر فائز نہیں تھے جس پر کوئی آپؐ سے سبقت لے جا سکتا؟

رسول اللہؐ کے کردار اور آپؐ کی ذاتی کامیابیوں کو مسلمان جدت پسندوں کے علم معرفت میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ آپؐ کے مثالی محاسن کو بعض اوقات داستان گوئی کی طرز پر رنگ آمیزی کر کے بیان کیا جاتا ہے اور بعض دفعہ سادہ لفظوں میں بیان مجمل کے ذریعے! ماضی میں شاعری اور اب نثر میں حضورؐ کی ذات اقدس کو ہر مثبت اور

خوب صورت چیز کے بے مثال نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، آپؐ رحم دلی، فیاضی، شائستگی اور خوش خلقی، دوستی، خلوص اور صبر و تحمل میں کاملیت کا بہترین نمونہ ہیں۔ آپؐ کو بچوں کے ساتھ جو محبت تھی، اسے مقبول نظموں سے اجاگر کیا گیا ہے چناں چہ سرور نے لکھا ہے:

آپؐ کی حیات طیبہ کی کلیدی روش کیا تھی؟ یہ خدا اور بنی نوع انسان، بچوں، عورتوں، دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ پیار کے سوا کچھ نہیں تھا! (W.C.Smith: Modern Islam in India, p.70)۔

ولفریڈ کینٹ ویل اسمتھ نے ان اوصاف کو "بورژوا طبقے کے آئیڈیل" کے نام سے موسوم کیا ہے اور ممکن ہے کہ یہ درست ہو کیوں کہ جیسا کہ انہوں نے دعویٰ کیا ہے: بہت سے ماڈرن مسلمان آپؐ کی فطرت کے بارے میں ادعائی بیانات، تصوفانہ قیاس آرائیوں یا پیچیدہ مذہبی استدلال پر غور و فکر کرنے کے بجائے ایک انسان کی حیثیت سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ اظہار عقیدت کو آسان سمجھتے ہیں۔

جو لوگ سنت بلکہ قرآن کریم کے احکام کی پاسداری کے ضمن میں بہت زیادہ جدت پسند، بہت زیادہ ذہین یا بہت زیادہ مصروف ہیں، وہ خدا یا سوشلزم سے غفلت برت سکتے ہیں لیکن وہ "نبی کریمؐ کی محبت" سے بہت زیادہ جذباتی اور مذہبی آسودگی حاصل کر سکتے ہیں۔ (W.C.Smith: Modern Islam in India, p.75)۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متعلق لٹریچر میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا اور سرسید کی وفات اور دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کی درمیانی مدت پچاس سال کے دوران حضورؐ کی سیرت طیبہ پر اتنی زیادہ کتابیں لکھی گئیں کہ پچھلی تمام صدیوں میں اتنی تعداد میں کتابیں نہیں لکھی گئی تھیں البتہ تصوف اور عبادات پر مشتمل کتابیں، جو قرون وسطیٰ اور جدید دور سے پہلے کے زمانے میں مذہبی ادب کا بڑا حصہ تھیں، زیادہ نمایاں نہ ہوئیں چناں چہ شاعری میں بھی ایک توانا، سیاسی طور پر سرگرم اور سماجی اعتبار سے ذمے دار پیغمبر کی حیات طیبہ کو موضوع بنانے کی روایت میں ایک نئی دل چسپی پیدا ہوگئی۔ اس صدی کے شروع میں اردو کے ایک شاعر صفی لکھنوی نے سرسید کے اصلاحی نظریے سے متاثر ہو کر حضورؐ کی شان میں یہ نعت لکھی:

سرکش عربوں کا سر جھکایا
حیوانوں کو آدمی بنایا
قائم کیا رشتۂ مواخات
برتاؤ میں شیوۂ مساوات
مصلح سرمایہ داروں کا
حامی محنت شعاریوں کا

ان شعروں سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ''سوشلزم کے امام'' کی حیثیت سے اجاگر کرنے کے نظریے کو تقویت ملتی ہے جو ہمارے عہد میں ایک سے زیادہ مرتبہ پیش کیا گیا ہے۔

رسول کریمؐ کی شخصیت میں نئی دل چسپی صرف ہندوستان تک محدود نہ تھی کیوں کہ دوسرے اسلامی ملکوں کو بھی اسی قسم کے مسئلوں کا سامنا تھا۔ عرب ملکوں، خاص طور پر مصر میں محمد عبدہٗ جیسے اصلاح پسند علما قرآن کریم اور حضورؐ کے رول کے بارے میں نیا انداز فکر اختیار کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ ان کے فہم وادراک اور مطالعے کے نتائج کئی اعتبار سے ان کے ہندوستانی رفقائے کار جیسے تھے اور عام طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ''حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سوانح عمری کو مسیحی یورپ کے مذاق کے مطابق ڈھالنے کے کام سے علمائے اسلام کو شدید پریشانی لاحق تھی۔'' ڈبلیو ایچ ٹیمپل گارڈنر W.H.Temple Gairdner نے بھی لندن کی ووکنگ مسجد میں مسلمانوں کے ایک بین الاقوامی اجتماع کے متعلق، جس کا مقصد ''۱۹۱۷ء میں رسول کریمؐ کے یوم ولادت کی تقریبات کے دوران آپؐ کو آئیڈیل محمدؐ کے طور پر پیش کرنا تھا''، ایک غیر معمولی طنزیہ آرٹیکل لکھا تھا۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ جمال الدین افغانی نے، جنہوں نے سرسید کی ''فطرت پسندی'' کی نہایت شدت کے ساتھ مذمت کی تھی، حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا جو مرقع پیش کیا، وہ کئی اعتبار سے ان کے ہندوستانی ہم عصر کے خیالات سے ملتا جلتا تھا البتہ انہوں نے یہ محسوس کر کے اپنا نقطۂ نظر تبدیل کر لیا کہ (جیسا کہ Alvert Hourani نے خیال ظاہر کیا ہے) ''اب اسلام کو ایک دین کے طور پر نہیں، ایک تہذیب کی حیثیت سے پیش کرنے کی ضرورت ہے اور امتِ مسلمہ جب تک رسول کریمؐ کی تعلیمات پر عمل کرتی رہے گی، اس وقت تک اسے ایک عظیم ملت کا درجہ حاصل رہے گا۔'' (Hourani: Arabic Thought in the Liberal Age, p.129)۔

محمد عبدہٗ نے یہی نظریات اختیار کیے اور سرسید اور ان کے پیروکاروں نے بھی یہی دعویٰ کیا کہ ''حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو انفرادی نجات کا طریقہ سکھانے کے لیے نہیں، ایک صالح معاشرے کی بنیاد رکھنے کی غرض سے مبعوث کیا گیا تھا۔'' (Hourani: Arabic Thought in the Liberal Age,p.136)۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ایک امت کے بانی کی حیثیت سے رول کا یہی مسئلہ مارچ ۱۹۲۴ء میں ترکی میں کمال اتاترک کی طرف سے خلافت کا ادارہ ختم کرنے کے بعد خلافت کے مسئلے پر گرماگرم بحث کے دوران مرکزی نکتے کی حیثیت اختیار کر گیا۔ علی عبدالرزاق نے یہ قرار دیا کہ ''حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک امت پیدا کی لیکن یہ اس اصطلاح میں امت نہیں تھی جسے ریاست کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، یہ ایک ایسی امت تھی جس کا کسی

حکومت یا کسی قوم کے ساتھ لازمی تعلق موجود نہیں تھا۔(Hourani: Arabic Thought in the Liberal Age,pp.186-87)۔

لیکن ان کے نظریاتی حریف شیخ بخت نے شریعت پر عمل درآمد اور ''اسلامی حکومت'' کے قیام کی ضرورت پر زور دیا کیوں کہ ''قانون کو نافذ کرنا حضورؐ کے مشن کا لازمی حصہ تھا۔ لیکن یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ رسول کریمؐ کے پاس سیاسی طاقت موجود تھی نیز یہ کہ ابتدائے اسلام میں امت مسلمہ ایک سیاسی امت تھی۔'' (Hourani: Arabic Thought in the Liberal Age, p.190)۔ یہ مسئلہ مکمل طور پر کبھی حل نہیں ہوا اور جب بھی حقیقی ''اسلامی'' ریاست کے قیام کا تصور پیش کیا جاتا ہے، یہ مسئلہ نمایاں صورت اختیار کر لیتا ہے۔

لیکن دنیائے عرب میں اپنی امت کی تشکیل کے ضمن میں رسول اللہؐ کے رول پر فکر انگیز بحث کا آغاز ۱۹۳۰ء کے عشرے کے وسط سے حضورؐ کے سوانح نگاروں کی کتابوں میں ہوا چناں چہ آپؐ کے عرب سیرت نگاروں نے تاریخی تحقیق کے تمام جدید ذرائع کو بروئے کار لا کر آپؐ کی شخصیت کے ساتھ پورا پورا انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔

مغرب کے جدید نقاد ایک کامل پیغمبرؐ کی حیثیت سے آپؐ کی شخصیت میں ٹھوس تاریخی حقائق کے فقدان کا عندیہ دیتے ہیں جو تمام اعلیٰ خوبیوں ''اسوہ حسنہ'' کے حامل ہیں، مثال کے طور پر Rotrant Wielandt کا دعویٰ ہے کہ محمد عبدہٗ کے نظریے کی رو سے رسول کریمؐ کی شخصیت سے ''ایک عجیب، بے رنگ نور افشانی ہوتی ہے۔ (Wielandt: Offenbarang and Gesehicht, p.53) حضورؐ کی ذات میں ہر اچھا، باعث نجابت، بلند پایہ اور دانش مندانہ کام کرنے کا جوہر موجود ہے اور اس کاملیت کی روشنی میں وہ تمام نقش ونگار ماند پڑ جاتے ہیں جو آپؐ کی شخصیت کو حقیقی زندگی کا دوام بخش سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ محمد عبدہٗ کی جانب سے تاریخی محمدؐ کا مرقع پیش کرنے کی کوشش کے باوجود (جیسا کہ آرتھر جیفرے نے درست کہا ہے) تاریخ کے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، دین اسلام کے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور تاریخی مبلغ اور آں حضرتؐ کی روحانی شخصیت کے درمیان، جو آپؐ کے دین میں مضمر ہے، اب بھی واضح مفارقت موجود ہے۔ (Jaffery: Muhammad and His Religion, p.3)۔

محمد عبدہٗ کے روحانی جانشین محمد رشید رضا نے مترنم نثر میں سیرت کی کتاب خلاصۃ السیرۃ المحمدیہ لکھی جس میں مصر میں سیرت تحریک کے دوران لکھی جانے والی طنطاوی کی کتاب نہایت الاعجاز فی سیرہ ساکن الحجاز (۱۸۶۸ء سے ۱۸۷۴ عیسوی) کی طرح جدید انداز فکر کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن بیسویں صدی کے پہلے نصف حصے میں شاعر حضرات نے بھی قدرے جدید اسلوب میں نبی کریمؐ کی مدح سرائی کی ہے چناں چہ مصر کے نامور شاعر شوقی نے بردہ کی طرز پر (فی نہج البردہ) شاندار نعتیہ شاعری لکھی۔ ان کے ہم عصر محمود سمیع البردی نے ابن ہشام کی سیرت کی بنیاد پر حضورؐ کی منظوم سیرت لکھی جو ۱۹۰۹ عیسوی میں شائع ہوئی۔ شاعری اور تاریخ کے نقطہ نظر سے اس کتاب کی زیادہ اہمیت نہیں اس لیے اس کا

مطالعہ زیادہ فکر انگیز نہیں ہے۔ ان سے خاصی مدت کے بعد احمد محرم نے اسی نوعیت کی تاریخی نظم دیوان مجد الاسلام اوالحیات الاسلامیہ لکھی۔ محمد امین نے، جو اسلام کے لیے معذرت خواہانہ لٹریچر لکھنے والے ان تھک مصری مصنف ہیں، ۱۹۲۷ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیان کئی آرٹیکل لکھے جن میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شخصیت کو نہ صرف ایک سماجی مصلح بلکہ ایک کامل صوفی کی حیثیت سے پیش کیا گیا جس کی بنا پر آپؐ کو بنی نوع انسان کے لیے ایک بے مثل نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ طرزِ عمل قرآن کریم کے اسوہ حسنہ کے منطقی ارتقا کا آئینہ دار ہے۔

عربی بولنے والے ملکوں میں رسول کریمؐ کی تاریخی شخصیت کو نئے انداز میں پیش کرنے کی جانب سب سے اہم قدم محمد حسین ہیکل کی کتاب حیات محمدؐ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۵عیسوی میں شائع ہوئی جس کا دیباچہ جامعہ الازہر کے ریکٹر مصطفیٰ المرغانی نے لکھا تھا۔ کارل بروکلمین Corl Brockelmann نے Geschichte der arabischen Literatur میں لکھا ہے کہ ہیکل ''اپنے ہیرو کی شخصیت کو انسانی دائرے میں قارئین کے قریب لانے میں کامیاب ہو گئے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے حضورؐ کی پوزیشن کو بھی محفوظ رکھا ہے۔'' اپنے بعض ہندوستانی اصلاح پسند پیشروؤں کی طرح ہیکل نے بھی جدید سائنسی دنیا سے متصادم آں حضرتؐ کے بعض معجزوں کی استدلالی تعبیر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ عقل اور وحی کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا ان کی کتاب کا مرکز ومحور ہے۔ اس سلسلے میں ہیکل کی سب سے دل چسپ جسارت یہ ہے کہ انہوں نے رسول اللہؐ کے سفر معراج کی نفسیاتی پیرائے میں تشریح کی ہے چناں چہ انہوں نے حضورؐ کے اس معجزے کو ایسے منفرد انداز میں پیش کیا ہے کہ ایک جدت پسند دماغ اسے آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔ لیکن جدت طرازی کے اس تمام تر رجحان کے باوجود ہیکل نے آں حضرتؐ کو اپنی قوم کے عظیم رہنما اور ایک ایسے شخص کی حیثیت سے ظاہر کیا ہے ''جس میں انسانیت کو روح کی ان بلندیوں پر پہنچانے کی استعداد موجود تھی جہاں زندگی اخوت اور محبت پر محیط ہے اور جس میں دنیا میں موجود ہر چیز کو جاننے کی آرزو اور تڑپ پائی جاتی ہے۔'' ہیکل نے روحانی، سائنسی اور مذہبی ترقی کی شاہراہ پر حضورؐ کی ذات اقدس کو واحد رہنما قرار دیا ہے جو ایک فطری بات ہے۔ مصر کے قارئین فوری طور پر اس کتاب کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس کی اشاعت کے بعد تین مہینوں میں اس کی پہلی دس ہزار کاپیاں فروخت ہو گئیں۔ جامعہ الازہر نے مصنف کی عظمت کا اعتراف کیا، کتاب کے کئی ایڈیشن چھپے اور جلد ہی چینی، ترکی، فارسی اور اردو میں اس کے ترجمے شائع ہو گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہیکل نے رسول کریمؐ سے متعلق افسانوی روایات اور معجزوں کی ماڈرن انداز میں جو تشریح کی، وہ زیادہ راسخ العقیدہ مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں تھی چناں چہ حیات محمدؐ شائع ہونے کے فوراً بعد کٹر عقاید رکھنے والے ایک وہابی نقاد کے قلم سے ایک تردیدی کتاب منظر عام پر آ گئی جس میں آں حضرتؐ کے تمام معجزوں کی

حقیقت کو برقرار رکھا گیا۔ اس کتاب کے مصنف نے بھی اس جانب اشارہ کیا کہ ہیکل نے فوج کے سپہ سالار اور ایک سیاست دان کی حیثیت سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے لیکن ایک پیغمبر کی حیثیت سے آپؐ کے کردار کو صحیح انداز میں پیش نہیں کیا گیا۔ (قاسمی: نقد کتاب حیات محمدؐ)۔ انہوں نے رسول کریمؐ کے ماڈرن سوانح نگاروں کی بڑی تعداد کو درپیش اس مسئلے کی نشان دہی کی کہ یہ مصنف حضورؐ کے حقیقی دینی جوہر کو عام طور پر نظرانداز کر دیتے ہیں جو عقلیت پسندی کے کڑے معیار پر پورا نہیں اترتا اور حال ہی میں آں حضرتؐ کی سوانح حیات کی ''سچی'' تفصیل بیان کرنے میں دل چسپی ظاہر کی گئی ہے، اس کے نتیجے میں آپؐ کی طلسماتی شخصیت کے پہلو کو نظرانداز کرنے کا رجحان فروغ پا رہا ہے۔ رسول اللہؐ کی سوانح عمری کی تفصیلات کو حقائق کے سانچے میں ڈھالنے کا عمل گو کہ یقیناً قابل تحسین نصب العین ہے لیکن مذاہب عالم کے عظیم بانیوں کے اسرار ''خالص'' علمی اور تجزیاتی نقطۂ نظر سے انسانی فہم وادراک سے ماوراء ہیں۔

ہیکل کی حیات محمدؐ کے منظر عام پر آنے کے چند برسوں بعد ۱۹۴۲ء میں مصر میں عباس محمود العقاد کی اہم تصنیف عبقریات محمدؐ شائع ہوگئی جس میں انہوں نے نبی کریمؐ کی اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کی بدولت حاصل ہونے والی کامیابیوں کی تفصیل بیان کی ہے جن کے اسما سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ آپؐ ہر قسم کی اخلاقی کمزوریوں سے مبرّیٰ تھے:

آپؐ ایک ایسی دنیا میں مبعوث ہوئے جو مذہب سے بے نیاز ہوگئی تھی جس کے نتیجے میں وہ داخلی امن وسکون اور خارجی نظم ونسق سے محروم ہو چکی تھی، ایک ایسی دنیا جو غلامی سے نجات پانے کے لیے اسلام کی آواز کی منتظر تھی۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اعلیٰ اوصاف کا بہترین نمونہ تھے اور ایک مبلغ اور ایک سپاہی کی حیثیت سے آپؐ میں یہ خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں، آپؐ فصاحت و بلاغت، قائل کرنے کی قوت، وعظ اور نصیحت کرنے کے سلسلے میں شدت جذبات اور ایک جنگجو کی جرأت، شجاعت، بلند ہمتی اور کامیابی کے اوصاف سے مالا مال تھے۔ آپؐ نے غیر معمولی ذہانت اور کردار کی بدولت اپنے عہد اور بعد میں آنے والے زمانوں پر حکمرانی کی۔ آپؐ سے پہلے اور بعد کی تاریخ مکمل طور پر مختلف ہے۔ (عقاد: عبقریات محمدؐ، تعارف)۔

یہاں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تاریخ کے محور کی حیثیت سے نظر آتے ہیں ـــــ یہ وہ نظریہ ہے جس کا اظہار صوفیہ حضرات اپنے کلام کی بہترین مناجاتوں میں کرتے رہے ہیں۔

اس ضمن میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ جدید عرب کے عظیم ادبی نقاد طٰہٰ حسین نے ۱۹۳۳ عیسوی میں ایک قسم کا تاریخی ناول الی ہامش السیرہ لکھا تھا جس میں انہوں نے حضورؐ کی ابتدائی زندگی سے متعلق روایتی موضوعات پر حد درجہ مرصع لفظوں میں خیال آرائی کی ہے۔ اس کتاب کی دوسری جلد راعی الغنام (گلہ بان) کے نام سے شائع ہوئی جس

میں جناب خدیجہؓ کے ساتھ شادی تک حضورؐ کی زندگی کا احاطہ کیا گیا ہے۔ کتاب کی تیسری جلد ۱۹۴۳عیسوی میں منظر عام پر آئی۔ بروکلمین Brockelmann نے غالباً درست اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ چوں کہ مصنف نے فرانس میں تعلیم پائی تھی اس لیے انہوں نے ارنسٹ رینن Earnest Renan کی رومانوی کتاب Vie de Jesus کو نمونے کے طور پر استعمال کیا ہے۔

جدت طرازیوں اور تصوفانہ بلندیوں سے لبریز رسول اللہؐ کی سوانح عمریاں (جیسا کہ سید حسین نصر کی تصنیف) آج ہر جگہ دست یاب ہیں لیکن بعض مصنفوں نے الگ راہ اپنا کر حضورؐ کی ثنا خوانی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی ہے، مثال کے طور پر حبیب الریاشی نے ۱۹۳۴عیسوی میں السبر مان العالمی الاول (پہلا عالمی سپر مین) کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ اس کے برعکس بعث پارٹی کے بانی مائیکل اخلاق کو حضورؐ کی ذات میں ''عرب روح کا خلاصہ'' دکھائی دیتا ہے۔(Wieldandt: Offenbarung und Geschichte, p.89)۔ آخرالذکر خصوصیت اس اعتبار سے بہت دل چسپ ہے کیوں کہ اس سے عرب عنصر کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے جو ہندوستان کے ابتدائی مسلمانوں میں عموماً نظر آتا تھا۔ لیکن اخلاق کا بیان خالصتاً سیاسی نوعیت کا ہے۔ خود ہمارے زمانے کے چند ایک اسکالرز نے اسلام کی تعلیمات کے حقیقی سوشلسٹ کردار کو ثابت کرنے کی سرتوڑ کوشش کی ہے چناں چہ مصر کے وزیر اعظم جمال عبدالناصر نے ۱۹۶۴عیسوی میں رسول کریمؐ کو ''سوشلزم کا امام'' قرار دیا تھا۔ ان سے دس سال قبل جمال عبدالناصر کی پہلی کابینہ کے وزیر رضوان نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ''عظیم ترین انقلابی'' کہہ کر آپ کی تعریف کی تھی۔ اسی دوران محمد شلابی نے ناصر کے لیے اشتراکیہ محمدؐ کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ ناصر ہی کے عہد حکومت میں معروف ناول نگار عبدالرحمٰن الشرقوی نے، جو اشتراکی نظریات کے علم بردار تھے، محمد رسول الحرمیہ (آزادی کے پیغمبر محمدؐ) نام سے ایک کتاب شائع کی جس میں حضورؐ کو ''مارکس سے پہلے کا مارکس'' ظاہر کیا گیا۔ (Wessels: Modern Biographies of the Life of the Prophet in Arabic, p.102)۔ آں حضرتؐ کے بارے میں اس قسم کے نظریات بعض ابتدائی کتابوں سے آسانی کے ساتھ اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

ہندوستان میں ایف کے درانی نے، جو کچھ عرصے تک محمد اقبالؒ کے زیر اثر لکھتے رہے ہیں، ۱۹۳۱ء میں آں حضرتؐ کو عہد نو کے بانی اور عظیم لیڈر کے نام سے موسوم کیا جنہوں نے دنیا کو سامراج سے نجات دلا کر غلامی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ جدید اصطلاحات میں رسول اللہؐ کے بارے میں اس قسم کے نئے تخمینوں کے ایک حصے کا تعلق ''خدا کی وحدانیت پر مبنی ضابطۂ اخلاق'' سے ہے جس میں عیسائیت کی طرح جسمانی ایذاؤں اور روحانی اور دنیاوی معاملات میں تفریق کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔

آں حضرتؐ کی حیات مقدسہ کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ آپؐ زندگی بھر غربت و افلاس کے خلاف جہاد کرتے

رہے ہیں اور دورِ حاضر میں یہ عنصر یقیناً خاصی دل کشی رکھتا ہے۔(W.C.Smith: Modern Islam in India, pp,136-137)۔

محمد حمید اللہ نے، جن کی سیرت طیبہ کو ایک عابد و زاہد ماڈرن مسلمان اسکالر نے رسالت مآب کی حیات مقدسہ کا غالباً بہترین تعارف قرار دیا ہے، حضورؐ کے متعلق لینن کے نظریات کے موضوع کے لیے ایک آرٹیکل وقف کیا ہے جس میں انہوں نے روسی لیڈر کے بعض مثبت ریمارکس کا حوالہ دیا ہے۔

ہمیں اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ترکی میں ۱۹۵۰ عیسوی کے بعد، جب اسلام کی جانب میلان میں کھلے بندوں اضافہ ہوگیا، رسول کریمؐ کی سیرت یا آپؐ کی شان میں نعتیں اور قصیدے لکھنے کے سلسلے میں خاصا نیا مواد سامنے آنے لگا ہے اور انقرہ میں مذہبی امور کی وزارت نے کئی نصابی کتابیں اور جریدے شائع کرنا شروع کر دیے ہیں اور کئی نیک اور پارسا لوگوں کی مطبوعات بھی منظر عام پر آ رہی ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۵۸ء میں جب ایک مصنف کی کتاب Hazrat-i-Muhammad Turk mi idi? (کیا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک ترک تھے؟) شائع ہوئی تو اس سے ہیجانی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ اس تصنیف کا تمسخر نہیں اڑانا چاہیے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ مصنف نے اس کتاب میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کے محبوب پیغمبر بھی اس کی محبوب ترک قوم کے ایک رکن تھے چناں چہ آپؐ نے ہر ممکن اچھائی اور اعلیٰ خوبی کو دنیا بھر میں یک جا کر دیا ہے۔

جدت پسندوں کی ان تشریحوں کی روشنی میں ہندوستان میں فارسی کے ایک اسکالر نے نعتیہ شاعری کی تعریف کرتے ہوئے اسے کردار سازی کی قوت قرار دیا ہے۔ وہ حضورؐ کی شان میں لکھے جانے والے نعتیہ کلام کو لٹریچر کی ایسی شاخ سے تعبیر کرتے ہیں جو تمام نسلی، جغرافیائی اور طبقاتی سرحدوں کو پھلانگ کر کردار کی تعمیر کے سلسلے میں نمایاں حصہ لیتی ہے۔ (Rasheed: The Development of Natia Poetry, p.68)۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیات طیبہ کو ڈرامے کی شکل میں پیش کرنے کی بھی کوششیں کی گئی ہیں چناں چہ نامور مصری مصنف توفیق الحکیم نے ۱۹۳۶ عیسوی میں ایک ڈراما تشکیل دیا جس کا مقصد وولٹیئر Voltaire کے ڈرامے Mohamet ou le Tanataisme کی مہلک تفصیلات کا سدباب کرنا تھا۔ اس ماڈرن ڈرامے میں مصنف نے مکالموں کے سلسلے میں محمد ابن اسحاق کی سیرت پر انحصار کیا ہے جس کے نتیجے میں یہ ڈراما بہت توانا ہوگیا ہے۔ توفیق الحکیم کے اس ڈرامے کو اگرچہ کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے لیکن اسے کبھی اسٹیج پر پیش نہیں کیا گیا۔ مسلمان اب بھی ڈرامے میں رسول کریمؐ کی شبیہ دکھانے کے سخت خلاف ہیں (بعض علاقوں کے مسلمانوں میں یہ رجحان پوری شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے) جس کا اظہار چند سال پہلے رسول اللہؐ کی حیات طیبہ پر فلمائی گئی ایک موشن پکچر کی نمائش پر شدید ردعمل کی صورت میں سامنے آیا تھا۔ اگرچہ اس فلم میں حضورؐ کا چہرہ مبارک نہیں دکھایا گیا تھا اور حکام نے اس فلم کی نمائش کی اجازت

دے رکھی تھی، اس کے باوجود مسلمانوں نے اس جسارت پر سخت غم و غصے کا اظہار کیا تھا۔

دورِ جدید کا ہر مصنف محبوب پیغمبرؐ میں ان اوصاف کا مشاہدہ کرتا ہے جنہیں وہ خود اعلیٰ ترین محاسن تصور کرتا ہے اور جن کی دنیا کو سخت ضرورت ہے۔ غرض اس طرح نبی کریمؐ کی شخصیت کا جو رنگ برنگا مرقع ذہنوں میں نقش ہوتا ہے، وہ صدیوں پرانی روایت کی کثیر الجہات کڑی اور جدید محاورے کے مطابق ''بنی نوع انسان کی افضل ترین شخصیت'' کا آئینہ دار ہے۔ جدید مسلم دنیا میں آپؐ کے رول کی تشریح کے ضمن میں مختلف رجحانات کا اندازہ ۱۹۷۶ء میں کراچی میں منعقد ہونے والی انٹرنیشنل سیرت کانفرنس کی روداد سے لگایا جا سکتا ہے جس کے موضوعات میں ''حضورؐ کے تصوفانہ نور'' سے لے کر ''بزنس مینجمنٹ کے سلسلے میں آپؐ کے فرمودات'' شامل تھے۔ عالم اسلام میں اصلاح اور ترقی کے زمرے میں جو کچھ بھی رونما ہو، محبوب خداؐ کی ذات اقدس کے ''اسوہ حسنہ'' کے ساتھ اس کا گہرا اور ناگزیر تعلق ایک یقینی امر ہے۔

محمد رسول اللہؐ کا تذکرہ
محمد اقبالؒ کے کلام میں

محمد اقبالؒ کے کلام میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ محبت اور عقیدت کے تمام گوناگوں پہلو سمٹ آئے ہیں جنہوں نے سب سے پہلے برصغیر ہندوستان کے شمال مغرب میں مسلمانوں کی ایک خودمختار ریاست قائم کرنے کا نظریہ پیش کیا تھا اور جنہیں اس مناسبت سے پاکستان کا ''روحانی باپ'' کہا جاتا ہے۔ یہ مملکت ان کی وفات (۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء) کے ۹ سال بعد ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو معرض وجود میں آئی۔

محمد اقبالؒ کی شاعری متنوع تاروپود کا سحر انگیز تانا بانا ہے جو اسلام کے اساسی اصولوں سے لے کر مغرب کے جدید ترین سائنسی نظریات تک اور تصوفانہ پروازوں کے ذریعے بارگاہ خداوندی میں حاضری سے لے کر روحانی مشاہدے کے استدلالی تجزیے تک ان گنت موضوعات پر محیط ہے۔ اس بوقلمونی کا اظہار ان کی انگریزی نثر کی اہم کتاب Reconstruction of Religious Thought in Islam (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ) اور بعض انگریزی مضامین سے ہوتا ہے۔ (اس کتاب کا عنوان غزالی کی احیا علوم الدین کا زیر بار ہے) البتہ اس سے پہلے کی فارسی اور اردو شاعری میں بھی یہ عنصر نمایاں طور پر موجود تھا۔ محمد اقبالؒ نے اپنے کلام میں جو تشبیہیں اور استعارے استعمال کیے ہیں، مسلمان قارئین صدیوں سے ان سے شناسا ہیں۔ انہوں نے ان پرانی تشبیہوں اور استعاروں کو اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے اور انہیں ایک نئے قالب میں ڈھالا ہے، انہیں نئے معانی پہنائے ہیں۔ اس سے پہلے کے ہزاروں شاعروں اور مفکروں کی طرح محمد اقبالؒ کے کلام میں بھی پیغمبر اسلامؐ کو مسلمانوں کی روحانی زندگی میں مرکزی شخصیت کا درجہ حاصل ہے، ایک

ایسی کثیر الجہات شخصیت جس کا تذکرہ محمد اقبالؒ نے جاوید نامے میں (جو شاعر کی اپنی معراج ہے) اس جرأت مندانہ انداز میں کیا ہے:

می توانی منکرِ یزداں شدن
منکر از شانِ نبیؐ نتواں شدن

ترجمہ تم خدا کا انکار کر سکتے ہو
لیکن نبیؐ کی شان کا انکار نہیں کیا جا سکتا

کیمبرج میں فلسفے اور قانون کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد محمد اقبالؒ نے ۱۹۰۷عیسوی میں کوئی چھ ماہ جرمنی میں گزارے۔ اس دوران وہ گوئٹے کے سرگرم مداح بن گئے جن کے کلام میں تخلیقی شاعری کا بھرپور اظہار کیا گیا ہے چناں چہ وہ فاؤسٹ Faust کے کردار میں خاص کشش محسوس کرنے لگے جو اپنے وجود کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اسی طرح انہیں گوئٹے کے West-Ostlicher Divan میں بھی گہری دل چسپی پیدا ہوگئی۔ محمد اقبالؒ نے ۱۹۲۳ء میں West-Ostlicher Divan کے جواب میں فارسی میں پیام مشرق لکھی۔ انہوں نے پیام مشرق کے دیباچے میں لکھا ہے کہ پیام مشرق کی تصنیف کا محرک جرمن ''حکیم حیات'' گوئٹے کا ''مغربی دیوان'' ہے جس کی نسبت جرمنی کا اسرائیلی شاعر ہائنا لکھتا ہے: ''یہ ایک گلدستہ عقیدت ہے جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے......اس دیوان سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینے سے حرارت کا متلاشی ہے۔'' گوئٹے کو شروع سے اسلامی تہذیب وتمدن میں گہری دل چسپی تھی اور وہ اپنے تخیلات میں شیخ عطارؔ، سعدیؔ، فردوسیؔ اور عام اسلامی لٹریچر کا بھی ممنون احسان ہے۔ محمد اقبالؒ نے ''پیام مشرق'' کے دیباچے میں مزید لکھا ہے:

''گوئٹے نے اپنی مشہور نظم Mohomets Gesang ۱۷۷۲عیسوی میں اس وقت لکھی جب نوجوان مصنف پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں ایک ڈراما لکھنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔'' محمد اقبالؒ اس نظم سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے ''پیام مشرق'' میں جوئے آب کے عنوان سے اس نظم کا ترجمہ کر دیا۔ جوئے آب کے زیریں حاشیے میں انہوں نے لکھا:

''جوئے آب'' گوئٹے کی مشہور نظم موسوم بہ ''نغمہ محمدؐ'' کا ایک نہایت آزاد ترجمہ ہے۔ اس نظم میں، جو دیوان مغربی سے بہت پہلے لکھی گئی تھی، المانوی شاعر نے زندگی کے اسلامی تخیل کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ اصل میں یہ ایک مجوزہ اسلامی ڈرامے کا جز و تھی جس کی تکمیل اس سے نہ ہو سکی۔ اس ترجمے سے صرف گوئٹے کا نقطہ نگاہ دکھانا مقصود ہے۔

جوئے آب کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

بنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ می رود
مانندِ کہکشاں بگریبانِ مرغزار

ترجمہ: دیکھو کہ پانی کی ندی کس طرح مستی میں چلی جارہی ہے
مرغزار کے گریبان پر کہکشاں کی طرح

اور اس قدرے طویل نظم کے آخر میں وہ کہتے ہیں:

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

ترجمہ: کیسے مستانہ وار چلی جارہی ہے بے کراں سمندر کی طرف
اپنے آپ میں یگانہ، باقی سب سے بے گانہ

دریا کو پیغمبرانہ فعالیت سے معنوی طور پر منطبق کرنا اسلام کی تصوفانہ فکر سے بہت قریب ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے شیعہ عالم الکلینی (شیخ محمد یعقوب الکلینی۔ مترجم) شیعوں کے پہلے امام حضرت علیؓ ابن طالب سے منسوب ایک قول نقل کرتے ہیں: ''عظیم دریا کون ہے؟ خدا کا پیغمبرؐ اور وہ علم جو آپ کو عطا کیا گیا ہے۔'' اور جب محمد اقبالؒ نے پیامِ مشرق کے ۹ سال بعد جاوید نامے میں اپنے سفرِ افلاک کا تذکرہ لکھا تو انہیں زندہ رود (بہتی ہوئی ندی) کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس نام سے نبی کریمؐ کے ساتھ گہرے تعلق کی عکاسی ہوتی ہے جن کی وہ زندگی کے ہر شعبے میں اتباع کرنے کی کوشش کرتے اور جن کے پیغام کی وہ اس دنیا میں تجدید کرنا چاہتے تھے۔

محمد اقبالؒ نے نبی کریمؐ کی مدح سرائی کے لیے روایتی اسلوب اختیار کیا ہے۔ اردو کی ایک ابتدائی نظم میں، جسے انہوں نے بعد میں اپنے کلام سے حذف کر دیا اور جو ان کی وفات کے طویل عرصے کے بعد ایک مجموعے میں شامل ہوئی، انہوں نے اس روایتی حدیث قدسی کی طرف اشارہ کیا ہے: ''میں بلا میم کے احمد ہوں یعنی احد''۔ اس شعر میں انہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ''میم کا پردہ عاشق کے لیے اٹھا دیا گیا ہے۔'' اس سے مراد یہ ہے کہ عاشق، رسولؐ کے ذریعے خدا کو دیکھتا ہے:

نگاہ عاشق کو دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر
وہ بزمِ یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر

بعد میں انہوں نے احتیاطاً اس حدیث سے گریز کیا کیوں کہ اس سے ہمہ اوست یا وحدت الوجودی نتائج برآمد ہو

سکتے تھے جنہیں وہ اپنی پختہ عمر میں ناپسند کرتے تھے۔

اسلام کی تاریخ کے سیکڑوں شاعروں کی طرح محمد اقبالؒ بھی کہتے ہیں:

سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

وہ کہتے ہیں کہ یورپ کے علم و ہنر کی چمک میری آنکھوں کو خیرہ نہیں کر سکتی۔

یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ محمد اقبالؒ کو حضورؐ سے کس قدر محبت اور آپؐ پر کتنا بھروسا تھا، اس کا اظہار اپنے دوستوں سے ان کی اس نجی خط و کتابت سے ہوتا ہے، جس میں وہ ذاتی اور علمی دل چسپی کے معاملوں پر اظہار خیال کرتے تھے۔ ان کے دوست بتاتے ہیں کہ ان کے سامنے جب نبی کریمؐ کا تذکرہ ہوتا تو وہ آبدیدہ ہو جاتے۔ ۱۹۰۹ عیسوی میں انہوں نے اپنے ایک آرٹیکل میں لکھا: ''جب میں اس بلند مرتبت ہستی کے بارے میں سوچتا ہوں تو میری روح کارواں رواں کانپ اٹھتا ہے، اس عظیم ہستی کا نام جو بنی نوع انسان کے لیے آزادی اور مساوات کا آخری پیغام لے کر آئے تھے۔'' (Islam as a Moral and Political Ideal: Hindustan Review, July-December, 1909)۔ انہیں سیرت تحریک سے ہمدردی تھی جس کا مقصد حضورؐ کی سوانح عمری اور آپؐ کی تاریخی شخصیت کا گہرا ادراک پیدا کرنا تھا۔ ۱۹۲۹ عیسوی کے دوران انہوں نے اس تحریک کے اس وقت کے لیڈر کا لاہور میں اپنے گھر پر خیر مقدم کیا۔ اسی سال انہوں نے ایک خط میں اس بات پر گہرے اطمینان کا اظہار کیا کہ جنوبی ہندوستان میں رسول کریمؐ کا یوم ولادت تزک و احتشام سے منایا گیا ہے۔ انہوں نے ہندوستان کی مسلمان قوموں کو متحد کرنے کے ضمن میں لکھا کہ ہمارے عظیم المرتبت پیغمبرؐ اس سلسلے میں سب سے بڑی اور موثر قوت ثابت ہو سکتے ہیں۔ (اقبال نامہ ۲:۹۳)۔

محمد اقبالؒ نے گو کہ کلاسیکل اسلوب میں لکھا لیکن انہوں نے صرف متذکرہ بالا نعت کو اپنے کلام سے حذف کیا ہے۔ ان کی شاعری میں رسول اللہؐ کی شان میں کئی اشعار کہے گئے ہیں۔ ان کے کلام کا نمایاں موضوع حضور رسالت مآبؐ پر ان کا کامل یقین ہے اور یہ وصف شروع سے آخر تک ان کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے:

مہرِ تو بر عاصیاں افزوں تر است

در خطا بخشی چو مہرِ مادر است

ترجمہ: آپؐ کی محبت گناہ گاروں پر اور زیادہ ہے

خطائیں معاف کرنے میں ماں کی محبت کی طرح

محمد اقبالؒ نے ان محسوسات کو، جنہیں اسلامی تقوے اور پرہیزگاری میں مرکزی حیثیت حاصل ہے، ۱۹۳۶ عیسوی کے لگ بھگ بیان کیا البتہ یہ ایک غور طلب نکتہ ہے کہ انہوں نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے

شافع محشر کے رول کا بہت کم ذکر کیا ہے حالاں کہ کلاسیکل، خاص طور پر لوک شاعروں نے اپنی دعائیہ نظموں میں رسول اللہؐ کے اس منصب پر زیادہ زور دیا ہے۔ لیکن ۱۹۱۵ء میں فارسی میں شائع ہونے والی کتاب اسرار خودی میں، جس میں خودی کے نئے متحرک فلسفے پر پہلی مرتبہ اظہار خیال کیا گیا ہے، محمد اقبالؒ نے کہا ہے:

روزِ محشر اعتبار ماست او
در جہاں ہم پردہ دارِ ماست او

ترجمہ: قیامت کے روز ہماری لاج انہی کے ہاتھ میں ہے
دنیا میں بھی ہمارا پردہ رکھنے والے وہی ہیں

محمد اقبالؒ نے بعد میں حضورؐ کے شافع محشر کے کردار کو کبھی نہیں دہرایا جس کی وجہ یہ ہے کہ اگلے برسوں کے دوران موت، قیامت اور روزِ محشر کے بارے میں ان کے نظریات روایتی علمائے دین اور مقبول مبلغوں کے موت اور آخرت کے نظریات سے بنیادی طور پر مختلف ہو گئے تھے۔ ان کے نزدیک نبی کریمؐ اس زندگی میں زیادہ معاون اور مددگار ہیں چناں چہ فارسی کی دوسری مثنوی رموز بیخودی میں، جو ۱۹۱۷عیسوی میں شائع ہوئی، ایک آئیڈیل اسلامی ریاست میں انسانِ کامل کے کردار پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں آں حضرتؐ سے درخواست کی ہے کہ وہ انہیں عمل کی قوت سے بہرہ مند کریں۔

اس کے باوجود پہلے گزرنے والے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کی طرح رسول کریمؐ کی مافوق الفطرت طاقتوں پر ان کا یقین بے حد پختہ تھا۔ جب وہ شدید علالت کی وجہ سے علاج کی غرض سے بھوپال میں مقیم تھے تو ان کے میزبان سر راس مسعود کے دادا سر سید احمد خان کی خواب میں محمد اقبالؒ سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے محمد اقبالؒ کو مشورہ دیا کہ وہ حضور رسالت مآبؐ سے رجوع کر کے آپ کو اپنی علالت کا حال بتائیں تا کہ وہ شفایاب ہو سکیں چناں چہ محمد اقبالؒ نے نسبتاً ایک طویل نظم لکھی جس میں پہلے تو مسلمانوں کی ابتر سیاسی صورت حال کا ذکر کیا گیا اور پھر اپنی بحالی صحت کے لیے حضورؐ سے امداد کی درخواست کی گئی۔ انہوں نے کہا: آپ مشہور عربی قصیدہ بردہ کے مصنف بصیریؒ کی طرح میری مشکل کو آسان کیجیے! (روایت ہے کہ بصیریؒ کا قصیدہ بارگاہ نبویؐ میں مقبول ہوا اور مصنف کو فالج کی بیماری سے نجات ملی)۔

ایک سال پہلے انہوں نے ایک سید کو لکھا تھا: ''میرے لیے داخلی دوائی صرف یہ ہے کہ میں آپ کے جد امجد (نبی کریمؐ) پر درود بھیجتا ہوں۔'' (اقبال نامہ ا: ۲۴۸: سید محفوظ علی بدایونی کے نام مکتوب)۔ لیکن پچھلی صدیوں کے شاعروں کی طرح وہ اکثر یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مقدس نام زبان پر لانے کے اہل نہیں:

چوں بنامِ مصطفیٰ خوانم درود
از خجالت آب میگردد وجود

عشق می گوید کہ "اے محکومِ غیر
سینۂ تو از بتاں مانندِ دیر
تا نداری از محمدؐ رنگ و بو
از درودِ خود میالا نامِ او"

ترجمہ: جب میں حضرت مصطفےٰؐ پر درود پڑھتا ہوں
تو میرا وجود شرمندگی سے پانی پانی ہو جاتا ہے
عشق کہتا ہے کہ اے غیر کے غلام
تیرا سینہ بتوں کی وجہ سے بت خانہ بنا ہوا ہے
جب تک تجھے حضرت محمدؐ کی اطاعت نصیب نہیں ہوتی
اپنے درود سے اُن کا نام میلا نہ کر

اپنے پیشرو علما اور حضرات صوفیہ کی طرح محمد اقبالؒ بھی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خدا کے سرگرم عمل ہونے کا مرئی پہلو سمجھتے تھے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے: خدا کو انسانی آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ (سورہ الاعراف آیت ۱۴۳) لیکن رسول اکرمؐ نظر آتے اور پوری طرح ظاہر ہیں:

با خدا در پردہ گویم با تو گویم آشکار
یا رسول اللہؐ! او پنہاں و تو پیدائے من

ترجمہ: اے اللہ کے رسولؐ! میں خدا سے در پردہ کہتا ہوں اور آپؐ کی خدمت میں واضح
اللہ میرا باطن ہے اور آپؐ میرا ظاہر ہیں

محمد اقبالؒ امداد مانگنے اور مدح و ثنا کرنے کے دونوں مقاصد کے لیے حضورؐ سے رجوع کرتے ہیں، اس کا اظہار ان کے آخری شعروں میں ہوتا ہے جو ان کی وفات کے بعد ارمغانِ حجاز میں شائع ہوئے تھے۔

ہر مسلمان جانتا ہے کہ وہ اس وقت خدا کا مشاہدہ کر سکتا ہے جب وہ قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے کیوں کہ اس وقت اسے خدا کے اپنے الفاظ سنائی دیتے ہیں۔ اسی طرح متقی اور پرہیز گار مسلمانوں کی نسلوں نے یہ محسوس کیا ہے کہ رسول اللہؐ کی حیات طیبہ سے متعلق موضوعات، احادیث مبارکہ یا آں حضرتؐ کے الفاظ پر مبنی فقہی فیصلوں کے

مطالعے سے وہ آپ کا قرب حاصل کرسکتی ہیں۔محمد اقبالؒ بھی جب اسلامی تاریخ اور اسلامی فقہ پر کام کرتے، خاص طور پر زندگی کے آخری دنوں میں تو وہ بھی اسی انداز سے سوچتے:

فقہی مسائل پر تفریق اور مسلم فقہا کے بحث مباحثے، جن میں خاتم النبیینؐ کی محبت پوشیدہ ہے —— ان تمام چیزوں کے مطالعے سے مجھے بے پایاں روحانی خوشی ہوتی ہے! (اقبال نامہ ۱:۴۰۴)۔

محمد اقبالؒ نے یہ خط ۱۹۳۶ عیسوی میں لکھا تھا لیکن انہیں حضورؐ کی کوئی چیز دیکھ کر کس قدر مسرت حاصل ہوئی ہو گی! ۱۹۳۲ء کے موسم خزاں میں جب وہ چند روز کے لیے افغانستان گئے تو انہوں نے قندھار میں حضورؐ کے خرقہ مبارک کی زیارت کی۔اس سے ان پر اسی طرح مخصوص وجدانی کیفیت طاری ہوگئی جس طرح کئی شاعر آپؐ کے نعلین مبارک یا اس کی تصویروں کو دیکھ کر وجد میں شعر کہتے ہیں۔محمد اقبالؒ نے بھی اس موقعے پر خرقہ شریف پر ایک غزل کہی جس میں وہ اپنے دل کا جبریلؑ کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں جنہوں نے آں حضرت کو زندگی میں دیکھا تھا۔وہ بتاتے ہیں کہ خرقہ شریف کی زیارت کے بعد ان پر کیف و مستی اور سرور چھا گیا اور زورِ جنوں کے باعث وہ رقص کرنے لگے تھے۔اس موقعے پر لکھی جانے والی غزل کے چند شعر یہ ہیں:

خرقۂ آں برزخ لا یبغیان
دیدمش در نکتہ لی خرقتان
دینِ او آئینِ او تفسیرِ کل
در جبینِ او خطِ تقدیرِ کل
کاروانِ شوق را او منزل است
ما ہمہ یک مشتِ خاکیم او دل است

ترجمہ: اس ''کبھی نہ غائب ہونے والے برزخ'' کا خرقہ
مین نے اس نکتے میں دیکھا کہ ''میرے دو خرقے ہیں''
اُس کا دین، اُس کا آئین کُل کی تفسیر ہے
اُس کے ماتھے پر سب کی تقدیر لکھی ہوئی ہے
وہ قافلۂ شوق کی منزل ہے
ہم سب مٹھی بھر مٹی ہیں، وہ دل ہے

(غزل کے پہلے مصرعے میں قرآن کریم کی سورہ الرحمٰن آیت ۲۰، بینھما برزخ لا یبغیان (ان دونوں

میں ایک آڑ ہے کہ اس سے بڑھ نہیں سکتے) اور دوسرے مصرعے میں حدیث مبارکہ لی خرقتان الفقر والجهاد (فقر اور جہاد میرے دو خرقے ہیں) کا حوالہ دیا گیا ہے۔مترجم)۔حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر برزخ، دو دنیاؤں کے درمیان سرحدی لکیر کی تلمیح کا بہت پہلے اطلاق کیا گیا ہے۔جامیؔ کے ایک شعر کے مطابق نبی کریمؐ لازمانی سے پہلے کے بحرِ ذخار اور ناگہانی حوادث زمانہ کے درمیان کھڑے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ احدیت اور انسانی کروں کا مقامِ اتصال ہیں۔آپؐ کے دو خرقے فقر اور جہاد ہیں۔اس روایت کا کہ حضورؐ نے فقر کا خرقہ معراج کے دوران دیکھا تھا،غزل کے دوسرے اور تیسرے مصرعے کے پس منظر میں جائزہ لینا چاہیے۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ محمد اقبالؒ مکہ میں فریضہ حج ادا کرنے کے ساتھ مدینہ منورہ میں رسول کریمؐ کے روضہ مبارک پر حاضری دینے کے شدت سے آرزومند تھے چناں چہ انہوں نے اپنے خطوں اور نظموں میں بار بار اس آرزو کا اظہار کیا ہے۔(اقبال نامہ:۲:۳۶ (۱۹۱۱ء)۔۱۹۰۸ عیسوی میں انہوں نے یثرب (مدینہ) کی تعریف کی جہاں ''شاہ لولاک'' آرام فرمارہے ہیں اور جو انسانی زندگی کا حقیقی مرکز ہے۔بلقان کی جنگ کے دوران انہوں نے مدینہ منورہ میں آسودہ خاک ہونے کا خواب دیکھا کیوں کہ ہر پاکباز مسلمان کی یہ خواہش ہے کہ وہ اپنے محبوب پیغمبرؐ کے قریب دفن ہو۔یہی وجہ ہے کہ محمد اقبالؒ کی رحلت کے بعد ان کے کلام کا جو مجموعہ شائع ہوا،اس کا نام ارمغانِ حجاز ہے۔شاعر جوں جوں بوڑھا ہوتا جاتا ہے،حضورؐ کے روضہ اقدس پر حاضری دینے کی آرزو اسی قدر شدید ہوتی جاتی ہے۔انہیں یقین تھا کہ حجاز مقدس کے سفر سے انہیں روحانی فوائد حاصل ہوں گے۔کیا انہوں نے اپنی ایک ابتدائی نظم ''شفاخانۂ حجاز'' میں یہ نہیں لکھا تھا:

میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں!

ایک مرتبہ لندن میں گول میز کانفرنس کے بعد وطن واپسی پر وہ ایک مسلم کانفرنس میں شرکت کی غرض سے بیت المقدس میں رک گئے۔اس موقعے پر انہوں نے مدینہ منورہ میں روضہ اقدس پر حاضری دینے پر غور کیا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ سیاسی مقاصد کے لیے سفر کو حجاز مقدس کے سفر کے ساتھ یک جا کرنا آداب کے منافی ہے، مجوزہ سفر ملتوی کر دیا۔(اقبال نامہ۲:۳۹۷)۔اسی زمانے میں انہوں نے حضورؐ کی شان میں اردو میں ایک نعتیہ نظم لکھی جس کے آخر میں انہوں نے کہا:

لوح بھی تو قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب!

اس نظم میں انہوں نے اپنے پیشرو صوفی شاعروں کا اسلوب اختیار کیا اور رسول اللہؐ کی تعریف میں حد درجہ مرصع الفاظ استعمال کر کے قدما پر سبقت لے گئے۔

بہت سے مصنفوں کی طرح، خاص طور پر تصوف اور شعری روایت کے مطابق محمد اقبالؒ آں حضرتؐ کو مصطفیٰ کے نام سے پکارنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) انسانی زندگی میں ہر اچھی اور مفید چیز کا منبع و ماخذ ہیں اور انیسویں صدی کے اصلاح پسند شاعروں کی طرح وہ بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے ناگفتہ بہ حالات کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ ''حضورؐ کے حسن و جمال سے بیگانہ ہو گئے ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ صرف آپؐ کا راستہ ہی وہ راستہ ہے جس کا انہیں انتخاب کرنا چاہیے۔'' یہ فکر ان کے آخری شعری مجموعے کی رباعیوں میں پوری طرح جاری و ساری نظر آتی ہے تاہم کئی عشرے پہلے وہ اپنی اردو کی عظیم نظم جواب شکوہ میں اس کا اظہار کر چکے تھے۔ ۱۹۱۶ عیسوی میں لکھی جانے والی اس نظم میں خدا مسلمانوں کے شکوے کا طویل اور توانا جواب دیتے ہوئے آخر میں فرماتا ہے:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

یہ نظم لکھنے کے چند سال بعد اسرار خودی محمد اقبالؒ کی اس فکر کا تسلسل ہے جس میں وہ پہلے گزرنے والے بیشتر صوفی شاعروں کے افکار کے برعکس، جو انسانی وجود کے ذات ربانی کے سمندر میں غرق ہونے کے بعد بارش کے ایک قطرے کی طرح غائب ہو جانے کے وحدت الوجودی فلسفے کے مبلغ تھے، انسانی شخصیت (یا انفرادیت) کو مستحکم کرنے کے نظریے کے علم بردار بن گئے جو ذات خداوندی کا قرب حاصل کرنے کے رجحان کی نشوونما کرتا ہے اور جس کے نتیجے میں وہ سب سے بڑی خودی (خدا) کے ساتھ بالمشافہ ملاقات کرنے کی استعداد حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن انسانی خودی صرف عشق کے ذریعے مستحکم ہو سکتی ہے جس کا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات اقدس سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ محمد اقبالؒ آں حضرتؐ کی طرف رجوع کرتے ہوئے کہتے ہیں:

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیؐ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفیؐ است

ترجمہ: حضرت مصطفیؐ کا مقام مسلمانوں کے دلوں میں ہے
ہماری آبرو حضرت مصطفیؐ کے نام ہی سے ہے

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اسم گرامی کے فیوض و برکات کا تذکرہ، جس کا مشاہدہ ہم اسلامی لٹریچر کے روایتی موضوع میں کر چکے ہیں، جواب شکوہ کے آخر میں اس وقت کیا جاتا ہے جب محمد اقبالؒ خدا کے یہ الفاظ سنتے ہیں:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

اسرارِ خودی کے تیسرے باب میں وہ حضورؐ سے جوشِ عقیدت میں اس سے بھی آگے چلے جاتے ہیں:

طور موجے از غبارِ خانہ اش
کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش
کمتر از آنے ز اوقاتش ابد
کاسبِ افزایش از ذاتش ابد
بوریا ممنونِ خوابِ راحتش
تاجِ کسریٰ زیرِ پائے امتش

ترجمہ: طور آپؐ کے گھر کے غبار کی ایک موج ہے
آپؐ کا کاشانہ کعبے کا کعبہ ہے
ابد آپؐ کے اوقات میں ایک پل سے بھی کم تر ہے
ابد آپ کی ذات سے افزائشِ کسب کرتا ہے
بوریا شکر گزار ہے کہ آپؐ اس پر راحت سے سوئے
کسریٰ کا تاج آپ کی امت کے قدموں تلے ہے

یہاں محمد اقبالؒ نے بہت سے نعت گو شاعروں، خاص طور پر نظیریؔ کی پیروی کرتے ہوئے حضورؐ کے فقر اور بادشاہی کا شانہ بشانہ موازنہ کیا ہے جس سے رسول کریمؐ کا جامع کردار ایک مرتبہ پھر اجاگر ہوتا ہے۔ بیس سال بعد لکھے گئے اس شعر سے ان کے جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے:

فقر و شاہی وارداتِ مصطفیٰؐ ست
ایں تجلیہائے ذاتِ مصطفیٰؐ ست

ترجمہ: فقر اور بادشاہی حضرت مصطفیٰؐ کے واردات ہیں
یہ ذات مصطفیٰؐ کی تجلیات ہیں

اس شعر میں صوفی روایت کی مقبول حدیث مبارکہ ''الفقر فخری'' کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ (فروزانفر: احادیث مثنوی نمبر ۵۴)۔ لیکن اس فقر سے مراد ناداری اور تنگ دستی وعسرت یا ایک بھکاری کی حاجت مندی نہیں بلکہ اس کا مطلب

خدا کی ذات پر مکمل بھروسا کرنا ہے۔ رسول کریمؐ کی فقرو شاہی کی دہری خصوصیات خدا کے جمال اور جلال کی مظہر ہیں جن کی بدولت تخلیق کی گئی زندگی رواں دواں رہتی ہے۔ اور ان دونوں مظاہر کی یک جائی سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک آئیڈیل پیغمبرؐ کے مرتبے پر فائز ہیں جن میں بیک وقت عیسیٰ علیہ السلام کی ملائمت اور قانون کی پاسداری کے حوالے سے حضرت موسیٰ کی سخت گیری پائی جاتی تھی اور اسی خصوصیت کی بنا پر آپؐ سب سے کامل ترین انسان ہیں:

وقت ہیجا تیغ او آہن گداز

دیدۂ او اشکبار اندر نماز

ترجمہ: جنگ کے وقت اُن کی تلوار لوہا پگھلا دینے والی

نماز میں آپؐ کی آنکھیں اشک بار

رسول اللہؐ کی یہی جامع عظمت محمد اقبالؒ کی پوری زندگی کے دوران ان کی شاعری کا محرک رہی۔ زندگی کے آخری برسوں میں وہ حضورؐ کی شخصیت کے اسرار کی پرانی تصوفانہ تشریح اس طرح کرتے ہیں:

معنیٔ جبریل و قرآن است او

فطرۃ اللہ را نگہبان است او

حکمتش برتر ز عقلِ ذو فنوں

از ضمیرش امتے آید بروں

ترجمہ: جبریل اور قرآن کی حقیقت آپؐ ہیں

آپؐ فطرت الٰہی کے محافظ ہیں

آپؐ کی حکمت کئی تدبیروں والی عقل سے برتر ہے

آپؐ کے ضمیر سے ایک اُمت ظاہر ہوتی ہے

رسالت کے منصب کے عملی پہلوؤں کے بارے میں محمد اقبالؒ کے نظریات، جن میں ایک طاقت ور تصوفانہ رنگ اب بھی موجود ہے، رموزِ بیخودی میں زیادہ واضح اور شفاف انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس نظم میں وہ اپنے مثالی سماجی اور سیاسی نظریات پر بحث کرتے ہوئے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شخصیت کو نور سے تشبیہ دیتے ہیں جو مخلوق کی تاریکیوں میں روشن چراغ کی مانند ہے، ایک ایسا چراغ جو اس وقت بھی موجود تھا جب آدمؑ ابھی مٹی اور پانی میں تھے۔

محمد اقبالؒ نے خالص تصوفانہ انداز میں حضورؐ کے جوہر کی تشریح جاوید نامے میں کی ہے۔ یہاں شاعر نے اس

شہید صوفی حلاجؒ کے منہ سے نبی کریمؐ کی مدح میں ایک غزل کہلوائی ہے۔جس نے محمد اقبالؒ سے کوئی ایک ہزار سال قبل ازل سے پہلے کے پیغمبرؐ کی، جو نور اور فہم و ادراک کا سرچشمہ ہیں، شاندار لفظوں میں تشریح کی ہے۔ اس نظم میں محمد اقبالؒ ایک مرتبہ پھر قرآن کریم میں آں حضرتؐ کے متعلق عبدہٗ ''اس کا بندہ'' کے لفظ کی کلاسیکل انداز میں وضاحت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''اس کا بندہ'' وہ اعلیٰ ترین مرتبہ ہے۔جس پر ایک انسان فائز ہو سکتا ہے کیوں کہ سفر معراج کے دوران اللہ تعالیٰ نے رسول اللہؐ کے بارے میں یہی لقب استعمال کیا ہے۔ (پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو رات ہی رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے آس پاس ہم نے برکت دے رکھی ہے اس لیے کہ ہم اسے اپنی قدرت کے بعض نمونے دکھائیں، یقیناً اللہ تعالیٰ ہی خوب سننے دیکھنے والا ہے۔ سورہ بنی اسرائیل آیت ا۔ مترجم)۔ اس کے علاوہ سورہ النجم کی دسویں آیت میں، جس کا ذکر اس سے پہلے معراج کے حوالے سے ہو چکا ہے، کہا گیا ہے: ''پس اس نے اللہ کے بندے کو وحی پہنچائی جو بھی پہنچائی۔'' جاوید نامے میں فلک مشتری میں زندہ رود (محمد اقبالؒ) نے حلاجؒ سے حضورؐ کے جوہر کے متعلق استفسار کیا تو حلاجؒ نے ایک طویل نظم میں اس سوال کا جواب دیا ہے:

عبدہٗ از فہم تو بالاتر است
زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است!
جوہرِ او نے عرب نے اعجم است
آدم است و ہم ز آدم اقدم است!
عبدہٗ صورت گرِ تقدیر ہا
اندر و ویرانہ ہا تعمیر ہا!
عبدہٗ ہم جانفزا ہم جانستاں
عبدہٗ ہم شیشہ ہم سنگِ گراں!
عبد دیگر عبدہٗ چیزے دِگر
ما سراپا انتظار او منتظر!
عبدہٗ دہر است و دہر از عبدہٗ ست
ما ہمہ رنگیم او بے رنگ و بو ست!
عبدہٗ با ابتدا بے انتہا ست
عبدہٗ را صبح و شامِ ما کجاست!

کس ز سرِ عبدہٗ آگاہ نیست
عبدہٗ جز سرِ الا اللہ نیست!
لا الہ تیغ و دمِ او عبدہٗ
فاش تر خواہی بگو ہو عبدہٗ!
عبدہٗ چند و چگونِ کائنات
عبدہٗ رازِ درونِ کائنات!

ترجمہ: عبدہٗ تمہاری سمجھ سے بالاتر ہے
اس لیے کہ آدم بھی وہی ہے اور جوہر بھی وہی!
اُس کا جوہر نہ عربی ہے، نہ عجمی
وہ آدم ہے اور آدم سے بھی پہلے کا ہے
عبدہٗ تقدیروں کی صورت گری کرتا ہے
اس میں ویرانے بھی آباد ہوتے ہیں
عبدہٗ زندگی بڑھانے والا بھی ہے اور زندگی لے لینے والا بھی
عبدہٗ شیشہ بھی ہے اور بھاری پتھر بھی
عبد اور ہے اور عبدہٗ اور ہی چیز ہے
ہم سراپا انتظار ہیں اور اُس کا انتظار کیا جاتا ہے
عبدہٗ زمانہ ہے اور زمانہ عبدہٗ سے ہے
ہم سب رنگ ہیں، وہ بے رنگ و بو ہے
عبدہٗ کی ابتدا ہے، انتہا نہیں
عبدہٗ کے صبح و شام ہماری طرح کے نہیں ہوتے
عبدہٗ کے بھید سے کوئی بھی آگاہ نہیں ہے
عبدہٗ الا اللہ کے بھید کے سوا کچھ نہیں ہے
لا الہ تلوار ہے اور عبدہٗ اس کی دھار ہے
اگر زیادہ کھول کر کہیں تو یہ "عبدہٗ" ہے

عبدہٗ اس کائنات کا چون و چرا ہے

عبدہٗ اس کائنات کا رازِ دروں ہے

اس نظم کے آخری شعر میں اس نظریے کو پھر دہرایا گیا ہے کہ نبی کریمؐ کی ذات خدا کے کامل بندے ہونے کے ناتے خدائی افعال کا ظہور اور وہ واحد راستہ ہیں جس کے ذریعے انسان ''لا الہ الا اللہ'' کے راز کو پا سکتا ہے!

محمد اقبالؒ کے نزدیک ''خدا کے بندے'' کی حیثیت سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا رول خصوصی اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ ان کا آئیڈیل انسان مردِ مومن نیٹشے کے سپرمین سے بالکل مختلف ہے جس کی وجہ سے وہ الجھن کا شکار رہے ہیں۔ سپرمین اس وقت ظاہر ہوتا ہے ''جب خدا مر جاتا ہے'' لیکن مردِ مومن حضورؐ کی اتباع کرتا اور خدا کا کامل بندہ ہے اور اس حیثیت سے اسے خدا کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ قربِ فرائض کے تصوفانہ سلسلوں کا سنجیدہ نظریہ ہے۔ اس طرح مردِ مومن حضورؐ کے اسوہ حسنہ کی تقلید کرتا اور دنیا میں اپنے فرائض انجام دے کر خدا کے قریب آجاتا ہے۔

محمد اقبالؒ یہ سمجھتے ہیں کہ رسول کریمؐ کی ذات روشن و تاباں صوفی شخصیت کے مقابلے میں کہیں زیادہ افضل و برتر ہے، آپؐ کی ذات اس مشتِ خاک انسان کو ایمان کی دولت سے مالا مال کرنے کی غرض سے وسیلے کا کام دیتی ہے، آپؐ کا مرتبہ زمان و مکان کی سرحدوں سے ماورا ''خدا کے بندے'' سے بھی بلند ہے، اس کے باوجود آپؐ معبود نہیں ہیں۔ آپؐ نہ صرف ذاتی بلکہ سیاسی اور سماجی رویے میں بھی اپنی امت کے رہنما اور ''اسوہ حسنہ'' ہیں جو ''دین کی چابی سے اس دنیا کا دروازہ کھولتے ہیں۔''

ایسے شعروں کو، جو اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی میں اکثر پائے جاتے ہیں، ۱۹۳۲ عیسوی میں سید سلیمان ندویؒ کے ساتھ محمد اقبالؒ کی خط و کتابت کی روشنی میں پڑھنا چاہیے۔ محمد اقبالؒ نے اپنے فاضل دوست سے اجتہادِ نبویؐ کے مسئلے کے بارے میں استفسار کیا تھا جس سے مراد رسول کریمؐ کی طرف سے ان فقہی اور دوسرے معاملوں کا خود مختاری سے فیصلہ کرنے کے اختیارات سے ہے جو قرآن مجید میں زیرِ بحث نہیں آئے۔ سید سلیمان ندویؒ نے جواب دیا کہ ''ایک عام آدمی کی ذہانت کے مقابلے میں پیغمبرانہ علم و آگہی بہت بلند ہے اور یہ کہ تمام فیصلوں میں پیغمبر کی صحیح سمت میں رہنمائی کی جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس خدائی رہبری کی بدولت وہ امت کا رہنما بن جاتا ہے۔''

محمد اقبالؒ کے نزدیک حضورؐ کا سیاسی اور سماجی رول تصوفانہ پہلوؤں کی نسبت زیادہ اہم اور مرکزی نوعیت کا ہے اور محمد اقبالؒ یہاں جدت پسندوں کے جانشین نظر آتے ہیں۔ زندگی کے آخری برسوں میں انہوں نے ''نبوت'' کے عنوان سے جو نظم لکھی، اس میں وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اگرچہ وہ علما اور صوفیہ حضرات کی طرح نبوت کے جوہر

پر بحث نہیں کر سکتے لیکن:

وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام!

فلسفی شاعر اس دنیا میں سرگرم پیغمبر کا ولایت کے منصب سے موازنہ کرتے ہوئے کبھی نہیں تھکتے۔ جاوید نامے کے فلک قمر میں شیطان یہ کہہ کر انہیں بہکانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے مکمل طور پر رہبانیت کی زندگی بسر کریں اور جلوت کو ترک کر کے خلوت نشین ہو جائیں۔ محمد اقبالؒ نے Reconstruction of Religious Thought in Islam کے پانچویں لیکچر کے شروع میں معراج کے مشاہدے کی تشریح کرتے ہوئے اس مسئلے کو غیر معمولی صراحت کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے:

''محمد عربی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عرش پر تشریف لے گئے اور واپس آ گئے، خدا کی قسم اگر میں وہاں پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔'' یہ مسلمانوں کے ایک عظیم ولی عبدالقدوس گنگوہیؒ کے الفاظ ہیں۔ صوفیہ حضرات کے پورے لٹریچر میں ایک ہی جملے میں ایسے الفاظ نہیں مل سکتے جس میں شعور کے پیغمبرانہ اور صوفیانہ سطح پر نفسیاتی فرق کو اس قدر ٹھیک قابل فہم تصور میں پیش کیا گیا ہو۔ ایک صوفی وحدانیت کے مشاہدے سے آسودگی پانے کے بعد واپس نہیں آنا چاہتا اور جب وہ واپس آتا ہے، جو ایک بدیہی امر ہے تو اس کی واپسی بنی نوع انسان کے لیے زیادہ کارآمد نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس پیغمبر کی واپسی تخلیقی ہوتی ہے۔ وہ وقت کے دوش پر سوار ہو کر تاریخ کی قوتوں پر قابو پانے اور اعلیٰ تصورات کا جہانِ تازہ تخلیق کرنے کی غرض سے اس دنیا میں واپس آتا ہے۔ ایک صوفی کے لیے ''وحدانیت کے مشاہدے'' سے حاصل ہونے والی آسودگی قطعی ہوتی ہے لیکن ایک پیغمبر کے نزدیک یہ مشاہدہ دنیا کو ہلا دینے والی نفسیاتی قوتوں کو بیدار کرنے کے مترادف ہے جس کا مقصدِ وحید انسانی دنیا کو مکمل طور پر تبدیل کرنا ہے۔ ایک پیغمبر کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ اپنے مذہبی مشاہدے کو ایک زندہ دنیاوی طاقت میں تبدیل کر دے اور یہی اس کا اعلیٰ نصب العین ہے۔ چناں چہ اس کی واپسی اس کے مذہبی مشاہدے کی قدر و قیمت کو پرکھنے کا عملی امتحان ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ معراج کے دوران ذاتِ خداوندی کا مشاہدہ صرف انہیں حاصل ہوتا ہے جو بلند ہمت ہوں، اس کے باوجود یہ ایک لمحاتی کیفیت ہوتی ہے۔

یورپ کی کتابوں میں پیغمبر اسلام کی جو صورت گری کی گئی ہے، ہندوستان کے دوسرے اصلاح پسند علما کی طرح محمد اقبالؒ نے بھی اس پر کراہت کا اظہار کیا ہے۔ حضور کی جو سوانح عمریاں انہیں دست یاب ہوئیں، انہوں نے خصوصی حملے

کے لیے ان میں سے الائیز اسپرنگر Aloys Springer کی کتاب کا انتخاب کیا ہے۔ اسپرنگر آسٹریا کا مستشرق تھا اور اس نے ہندوستان میں رہ کر برسوں کام کیا تھا۔ دوسرے یورپی مصنفوں کے مقابلے میں مجموعی اعتبار سے اسلام، خاص طور پر ہندوستان میں اسلام کے احیا کے بارے میں اس کا رویہ ہمدردانہ تھا۔ لیکن اسپرنگر نے بھی اپنی کتاب میں یہ دعویٰ کیا کہ رسول اللہؐ ذہنی اور جذباتی طور پر ایک ناآسودہ مریض تھے۔ (نعوذ باللہ۔ نقل کفر، کفر نباشد۔ مترجم)۔ چناں چہ محمد اقبالؒ نے Reconstruction of Religious Thought in Islam کے ایک مضمون میں اسپرنگر کے اس دعوے کا تند و تیز جواب دیتے ہوئے کہا:

اگر یہ درست ہے کہ ایک ذہنی مریض میں تاریخ انسانی کو ایک نئی جہت دینے کی طاقت موجود ہے تو یہ ایک بے حد دل چسپ نفسیاتی سوال ہے کہ ہم اس شخص کے اس حقیقی مشاہدے کی روح کا سراغ لگائیں جس نے غلاموں کو انسانوں کا لیڈر بنا دیا اور نوع انسانی کی پوری نسل کے طرز عمل اور کیریئر کو ایک نئی صورت میں ڈھال دیا تھا۔ پیغمبر اسلامؐ کی تحریک کے نتیجے میں جو مختلف قسم کی سرگرمی پیدا ہوئی اور جس روحانی اضطراب اور ردِ عمل نے اس تحریک کی کوکھ سے جنم لیا، اس کا تجزیہ کرنے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ یہ تحریک کسی شخص کے دماغ میں پیدا ہونے والی معروضی صورت حال کا ردِ عمل تھی۔ اگر ہم علم الانسان کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ انسانیت کی سماجی اجتماعیت کی معیشت میں ذہنی اور جذباتی ناآسودگی کو اہم عنصر کی حیثیت حاصل ہے۔ (Reconstruction of Religious Thought in Islam, p.190)

محمد اقبالؒ کی چشم بصیرت نے یہ صحیح تجزیہ کیا تھا کہ پیغمبرانہ پیغام کا امتیازی جوہر قوم کو روایتی دنیاوی تصورات سے آزاد کر کے اسے قدیم سے جدید مذہب کی طرف لانے اور عرب فلسفہ حیات کی ان تعلیمات کی (جیسا کہ گولڈزیہر GoldZiher نے لکھا ہے) پورے استقلال کے ساتھ مخالفت کرنے کی قوت میں مضمر ہے جن کی جڑیں خاندان اور قبیلے کے قدیم ڈھانچے میں پیوست تھیں۔ (GoldZiher: Muhammadan ische studien, 1:23)۔ رسول کریمؐ انہیں تباہ کر کے خون، نسل یا قوم کے رشتوں سے ماورا ایک روحانی برادری تشکیل دے سکتے تھے۔ فلسفی شاعر نے یہ نظریہ جاوید نامے کے ایک سحر انگیز باب میں پیش کیا ہے جس میں مکہ کی اشرافیہ میں رسالت مآبؐ کا شدید ترین دشمن ابوجہل حرم کعبہ میں حضورؐ کی شکایت کرتا ہے۔ ظہور اسلام سے پہلے کے ان مثالی تصورات کا نمائندہ (ابوجہل) حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی انقلابی سرگرمیوں پر نوحہ کناں ہے جو آپؐ سے پہلے بدوی اور مکی معاشرے کا حصہ تھیں:

سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ
از دمِ او کعبہ را گل شد چراغ

از هلاک قیصر و کسریٰ سرود
نوجواناں را ز دستِ ما ربود
پاش پاش از ضربتش لات و منات
انتقام از وے بگیر اے کائنات
مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب
از قریش و منکر از فضلِ عرب
در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بر یک خواں نشست

ترجمہ: ہمارا سینہ محمدؐ سے داغ داغ ہے
اس کے پھونک سے کعبے کا چراغ بجھ گیا
وہ قیصر و کسریٰ کی ہلاکت کی بات کرتا ہے
اس نے ہمارے ہاتھ سے نوجوان چھین لیے
اس کی ضرب سے لات و منات پاش پاش ہو گئے
اے کائنات! اس سے انتقام لے!
اس کا مذہب ملک و نسب کی جڑ کاٹتا ہے
وہ قریش میں سے ہو کر عرب کی فضیلت کا منکر ہے
اس کی نظر میں اونچا نیچا سب برابر ہے
وہ اپنے غلام کے ساتھ ایک ہی دستر خوان پر بیٹھ جاتا ہے

مکہ کا یہ پرانا سردار ابو جہل حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے کئی دوسرے ''جرائم'' کی نشان دہی کر کے اس طویل نظم کے آخر میں حضورؐ کو بددعا دیتا ہے۔ محمد اقبالؒ نے رسول کریمؐ کے ماورائے قوم پہلوؤں کو بجا طور پر کمال مہارت کے ساتھ اجاگر کیا ہے لیکن ہندوستان کے کئی دوسرے شاعروں کی طرح وہ بھی آں حضرتؐ کے ''عربی'' کردار اور اسلام کی عربی جڑوں پر زور دیتے ہیں۔

مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو ابو جہل کی یہ منفی تصویر محمد اقبالؒ کے عمومی رویے پر پورا اترتی ہے۔ بیشتر اصلاح پسندوں کی طرح وہ بھی نسل پرستی کے خلاف اسلام کی ''جمہوری'' تعلیمات پر زور دیتے ہیں، خاص طور پر

ہندوؤں کے ذات پات کے نظام کا موازنہ کرتے ہوئے وہ اسلام کے اس پہلو کو پوری طرح نمایاں کرتے ہیں۔انہوں نے ۱۹۱۰عیسوی کے شروع میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مکہ سے مدینہ ہجرت کا ایک نئے سیاسی نقطہ نظر سے جائزہ لیا تھا۔ مولانا رومیؒ جیسے صوفیوں نے اس واقعے کو انسان کی اس مادی دنیا سے روحانی اقلیم کی جانب مراجعت سے تعبیر کیا ہے لیکن محمد اقبالؒ نے اپنی ڈائری میں یہ دل چسپ نوٹ لکھا ہے:

اسلام کا ظہور بت پرستی کے خلاف احتجاج کے طور پر ہوا۔اور حب الوطنی بھی بت پرستی کی ایک لطیف شکل ہے، ایک مادی شے کی پرستش؟......اسلام نے جس چیز کو گرادیا ہے، اسے ایک سیاسی برادری کے ڈھانچے کا اصول نہیں بنایا جاسکتا۔ یہ حقیقت کہ رسول اللہؐ اس شہر میں پھلے پھولے اور وہیں وفات پائی جو آپؐ کی جائے پیدائش نہیں تھا، اس ضمن میں غالباً ایک تصوفانہ اشارہ ہے۔ (Reconstruction of Religious Thought in Islam, p.146)۔

محمد اقبالؒ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے کیلنڈر میں ہجرت کا انتخاب بے حد معنی خیز ہے۔اگر اہل مکہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیغام کو فوری طور پر قبول کر لیتے تو تاریخ کا دھارا مختلف ہوتا۔حضورؐ خاندان اور کنبے کے رشتوں کو توڑ کر آنے والی نسلوں کے لیے ایک مثال چھوڑنا چاہتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ محمد اقبالؒ نے اردو میں وطنیت کے عنوان سے جو نظم لکھی، اس میں وہ کہتے ہیں:

ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہیؐ

۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸عیسوی تک ایک طالب علم کی حیثیت سے انگلستان اور جرمنی میں قیام کے دوران محمد اقبالؒ نے جن بڑھتی ہوئی کشیدگیوں کا مشاہدہ کیا جو پہلی جنگ عظیم کے بعد مشرق قریب کی سیاست میں ایک خطرناک عنصر کی حیثیت اختیار کر گئیں، ان کی بنا پر وہ ایک ایسا رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے جو محدود سیاسی قومیت سے لگا نہیں کھاتا تھا:

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

غرض محمد اقبالؒ اپنے اس موقف کا بار بار اعادہ کرتے رہے کہ اسلام نسل پرستی کی مخالفت کرتا ہے: ''رسول اللہؐ کا سب سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ آپؐ نے (روحانی طور پر متحد) قوم تشکیل دے دی۔'' (Speeches and Statements, p.120)۔ان لفظوں میں سرسید کے اس بیان کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے کہ اسلام کا سب سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ اس نے ''غارت گر بدوؤں'' کے منتشر گروہوں کو مسلمانوں کی حقیقی برادری میں تبدیل کر دیا۔رموزِ بے خودی کا تمام تر استدلال قوم کی تعمیر سے متعلق حضورؐ کی طاقت پر مبنی ہے۔

محمد اقبالؒ کو یقین تھا کہ انسانیت صرف رسول کریمؐ کے سادہ، واضح اور عملی پیغام کی طرف رجوع کر کے مکمل طور پر ایک نئی زندگی کا آغاز کر سکتی ہے۔ خدا کے فرستادہ پیغمبرؐ پر نازل ہونے والی وحی کے احکام کی پاسداری کے ذریعے افراد کے گروپ میں یک جہتی کا احساس پیدا ہو سکتا ہے ـــــ ایک ایسا احساس جو اس تازہ گروپ کو مہمیز دے کر اسے عمل کی غیر متوقع بلندیوں تک پہنچا دے۔ محمد اقبالؒ کا یہ استدلال ہمیں قرون وسطیٰ میں شمالی افریقا کے تاریخ کے فلسفی ابن خلدون کی تعلیمات کی یاد دلاتا ہے۔ اثابیہ یعنی یک جہتی کے نظریے کو ان کے فلسفے میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ابن خلدون بھی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جس گروپ کی تشکیل کا محرک مذہبی جوش اور ولولہ ہو، اس میں یک جہتی کا عنصر سب سے مضبوط ہوتا ہے۔ (ابن خلدون مقدمہ کتاب ا حصہ ۳)۔

محمد اقبالؒ کے مطابق حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نہ صرف ماورائے قوم ایک امت مسلمہ پیدا کی بلکہ آپؐ کی ذات اقدس اس امت کے غیر متزلزل اتحاد کی بھی علامت ہے۔ اسرارِ خودی میں وہ حضور رسالت مآبؐ کی مدح سرائی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

چوں گلِ صد برگ مارا بو یکیست
اوست جانِ ایں نظام و او یکیست

ترجمہ: سو پنکھڑیوں والے پھول کی طرح ہماری خوشبو ایک ہی ہے
اس نظام کی روح وہ ہیں اور وہ ایک ہی ہیں!

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ''اس مشت خاک میں دل'' کی مانند ہیں جس پر انسان مشتمل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ وہ حیات بخش قوت ہیں جو انسانیت کو ایک زندہ جسم کی صورت میں تبدیل کرتی ہے۔ چناں چہ محمد اقبالؒ انفرادی اور سیاسی بنیاد پر چلائی جانے والی قومی تحریکوں کو نئے بتوں سے تعبیر کرتے ہیں، وطنیت اور قوم پرستی بعل پرستی ہی کی جدید شکل ہے البتہ آئیڈیل مسلمان قوم بعل اور بتوں کی ترغیبات کے سامنے ہرگز نہیں جھکے گی۔ اس کا تذکرہ جاوید نامے (سیارہ زہرا) میں اس طرح کیا گیا ہے کہ مسلمان اپنے دل یعنی حضور علیہ السلام کی وجہ سے ایک پائندہ قوم کی حیثیت سے زندہ رہیں گے۔

مسلمانوں کی برتری کے اس نکتے کی وضاحت کے بعد محمد اقبالؒ مشرق وسطیٰ میں چلائی جانے والی قومی تحریکوں پر سخت نکتہ چینی کرتے ہیں جن میں ایران میں رضا شاہ پہلوی اور ترکی میں مصطفیٰ کمال اتاترک کی قیادت میں چلنے والی تحریکیں شامل ہیں۔ (گو کہ اس سے پہلے انہوں نے ۱۹۲۲عیسوی میں یونانیوں پر فتح حاصل کرنے پر اتاترک کی تعریف کی تھی)۔ ۱۹۲۰ء کے عشرے اور ۱۹۳۰ء کی دہائی کے شروع میں محمد اقبالؒ کے خیال میں افغانستان وہ واحد

ملک تھا جس میں حضورؐ کی تعلیمات خالص شکل میں محفوظ تھیں اور یہی وجہ ہے کہ ضرب کلیم کی نظم ''ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام'' میں وہ کہتے ہیں:

لا کر برہموں کو سیاست کے پیچ میں
زناریوں کو دیرِ کہن سے نکال دو!
وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو!
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو!
افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج
ملاّ کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو!
اہلِ حرم سے ان کی روایات چھین لو
آہو کو مرغزارِ ختن سے نکال دو!
اقبالؔ کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو!

جاوید نامے میں سیارہ عطارد کی سیر کے دوران قومیت کے بارے میں پیغمبر اسلامؐ کے نظریات پر ایک طویل بحث کی گئی ہے۔ چناں چہ زندگی کے آخری دنوں میں انہوں نے سادہ نثر میں لکھا:

رسول کریمؐ کی یہ خاص عظمت ہے کہ آپؐ نے دنیا کی قوموں سے خود ساختہ امتیازات اور احساس تفاخر کو تباہ کر کے ایک ایسی امت پیدا کی جسے اللہ تعالیٰ نے عادل امت بنایا ہے تا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم پر گواہ ہو جائیں۔ (سورہ البقرہ آیت ۱۴۳)۔

محمد اقبالؒ نے جس آئیڈیل امت کا خواب دیکھا تھا، اسے خدا کی وحدانیت کا اقرار کرنا چاہیے جس کی حضورؐ عمر بھر تبلیغ کرتے رہے ہیں، اس کے علاوہ اس امت کو نبی کریمؐ کی اتباع کرنی چاہیے جنہوں نے اپنے عمل سے ہمہ گیر آزادی، مساوات اور اخوت کا سبق سکھایا ہے۔ رموزِ بیخودی میں وہ کہتے ہیں:

از رسالت در جہاں تکوینِ ما
از رسالت دینِ ما آئینِ ما

از رسالت صد ہزارِ ما یک است
جزوِ ما از جزوِ ما لا ینفک است
از رسالت ہم نوا گشتیم ما
ہم نفس، ہم مدعا گشتیم ما

ترجمہ: رسالت ہی سے دنیا میں ہماری بقا اور استحکام ہے
رسالت ہی ہمارا دین ہے، آئین ہے
رسالت ہی کی بدولت ہم لاکھوں ہو کر بھی ایک ہیں
ہمارا کوئی حصہ دوسرے حصے سے الگ نہیں ہو سکتا
رسالت ہی کی بدولت ہم ہم نوا ہوئے ہیں
ہم نفس بنے ہیں اور ہمارا مدعا ایک ہوا ہے

حضور علیہ السلام کی ذات گرامی سے عشق کو ان تمام مثالی اور کامل ترین تصورات کی تشکیل میں سب سے اہم عنصر کی حیثیت حاصل ہے جس کی بنا پر ایک فرد اور ایک ملت ربانی محبت کے تقاضوں کے مطابق ہم آہنگی کے ساتھ زندہ رہ سکتی ہے۔ محمد اقبالؒ حرکی قوت پر مبنی اس عشق کو "المصطفےٰؐ" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں جو ان کی شاعری کا مرکز و محور ہیں۔ آپؐ کے مقابل تنقیدی عقل کو وہ آپؐ کا بدترین دشمن ابولہب قرار دیتے ہیں۔ (یہاں قرونِ وسطیٰ کے صوفیہ حضرات کی طرف سے مجسم عشق حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فلسفیوں کے ساتھ موازنہ کرنے کا رجحان فوری طور پر ذہن میں آ جاتا ہے)۔

محمد اقبالؒ نے ایک اور اہم نظریہ بھی پیش کیا ہے: جس طرح نبی کریمؐ خدا کے فرستادہ پیغمبروں کے قائد و سردار اور خاتم النبیین ہیں، اسی طرح آپؐ کی امت کو بھی دوسری تمام امتوں کی آخری اور ہر لحاظ سے کامل اور مثالی امت ہونا چاہیے جس کا تمام تر دارومدار خدا کی ذات پر ہو:

رونق از ما محفلِ ایام را
او رسل را ختم و ما اقوام را

ترجمہ: زمانے کی محفل کی رونق ہم ہی ہیں
حضورؐ خاتمِ رسول ہیں اور ہم خاتمِ اقوام

چوں کہ حضورؐ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت (رحمت للعالمین) بنا کر بھیجا گیا ہے، اس لیے مسلمانوں کو بھی،

جن کی نسبت آپؐ سے ہے، اقوامِ عالم کے لیے رحمت ہونا چاہیے۔ محمد اقبالؒ نبی کریمؐ اور امت کے درمیان موافقت پیدا کرنے میں بہت آگے چلے گئے ہیں۔ خدا نے آپؐ کو لولاک کہہ کر مخاطب کیا ہے اس لیے ہر مسلمان، جو آں حضرتؐ کی پیروی کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس لفظ میں بھی شامل ہے۔ یہ کائنات اس کے لیے تخلیق کی گئی ہے اور وہ اس میں مصروفِ عمل ہے، اگر ایک مسلمان فرد کے لیے یہ سچ ہے تو مسلمانوں کی مثالی برادری کے لیے بھی اسے درست ہونا چاہیے۔ اس طرح نبی کریمؐ کی وارث ہونے کے ناتے اسے دنیا کی حکمرانی حاصل ہونی چاہیے۔ یہ قائدانہ کردار ادا کرنے کے لیے اس کے پاس قوت کا ہونا لازم ہے۔ یہاں بھی ایک مسلمان فرد اور ملتِ اسلامیہ کو حضورؐ کے فقر کے ساتھ ساتھ آپؐ کی قوت کا بھی ادراک ہونا چاہیے جو خدا کی کامل بادشاہت میں مضمر ہے۔ لیکن محمد اقبالؒ ان خطرات سے یقیناً آگاہ تھے جو رسول کریمؐ کے آئیڈیل کو عملی شکل دینے کے ضمن میں مخالف قوتوں کے ردِعمل کی صورت میں سامنے آسکتے تھے۔ وہ اس بات کو بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ پہلے چار خلفاءؓ کے سنہری دور کی واپسی کے بارے میں انہوں نے جو خواب دیکھا ہے، وہ حقیقی معنوں میں شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا کیوں کہ وہ صاف دیکھ رہے تھے کہ ان کے دور کے مسلمانوں نے حضورؐ کے فقر کو پس پشت ڈال دیا ہے اور دنیاوی فوائد حاصل کرنے کی غرض سے انہوں نے ''طاقت'' کے پہلو کو خلط ملط کر دیا ہے۔

تصوف، مذہب اور سیاست کی دنیاؤں میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مقام کے سلسلے میں محمد اقبالؒ کی تشریح ایک طرف تو اپنے پیشرو صوفی شاعروں کے نقطہ نظر سے ملتی جلتی ہے اور دوسری طرف جدت پسند مصلحوں سے! لیکن انہوں نے اس روایت کے دو بڑے پہلوؤں کو جس سلیقے اور ذہانت سے کسی جوڑ کے بغیر یک جا کیا ہے، اس نے ان کے کلام کو حد درجہ دل کش بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ فلسفی شاعر نے آں حضرتؐ کے ختم نبوت کے منصب کی کمال خوبی کے ساتھ صراحت کی ہے اور رسالت کے شعبے میں ان کا یہ بے مثل کارنامہ ہے۔ چوں کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے: ''آج میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنا انعام بھرپور کر دیا اور تمہارے لیے اسلام کے دین ہونے پر رضامند ہوگیا۔'' (سورہ المائدہ آیت ۳) لہٰذا اس حقیقت کو ہمیشہ تسلیم کیا گیا ہے کہ خدا کی طرف سے وحی کا سلسلہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر، جو خاتم النبیینؐ ہیں، ختم ہوگیا تھا۔ محمد اقبالؒ نے اپنے اس عقیدے کا اظہار رموزِ بیخودی میں کیا ہے:

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
خدمتِ ساقی گری با ما گذاشت
داد مارا آخریں جامے کہ داشت

ترجمہ: پس خدا نے ہم پر شریعت کا خاتمہ کیا
ہمارے رسولؐ پر رسالت کا خاتمہ کیا
خدا نے ساقی گری کی خدمت ہمارے ذمے لگائی
اس کے پاس جو آخری جام تھا، وہ اُس نے ہمیں دے دیا

لیکن محمد اقبالؒ کے نزدیک ختمِ نبوت کے کیا معنی ہیں؟ کیا قرآن حکیم کے پیغام کو ہمارے عہد کی زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے کسی نئے پیغمبر کی ضرورت نہیں ہے؟ محمد اقبالؒ نے ان سوالوں کا نہایت فکر انگیز جواب دیا ہے:

پیغمبر اسلامؐ قدیم اور جدید دنیاؤں کے درمیان کھڑے ہیں۔ جہاں تک آپ کی وحی کے ماخذ کا تعلق ہے، آپؐ کا تعلق قدیم دنیا سے ہے۔ آپؐ کی ذات میں زندگی علم کے دوسرے ذرائع دریافت کرتی ہے جو اس کی نئی جہت کے لیے موزوں ہیں۔ اسلام کا ظہور...... استقرائی اور استدلالی عقل کا ظہور ہے۔ اسلام میں الہام اور وحی اپنی تنسیخ کی ضرورت دریافت ہونے کی صورت میں اپنے نقطہ کمال تک پہنچتی ہے۔ اس سے یہ شعور اور ادراک حاصل ہوتا ہے کہ زندگی کو ہمیشہ کے لیے قید میں نہیں رکھا جا سکتا۔ کامل شعور پیدا کرنے کے لیے انسان کو آخر کار اپنے ہی ذرائع پر انحصار کرنا پڑے گا۔(Reconstruction of Religious Thought in Islam, p.126)۔

قرآن حکیم نے بنی نوع انسان کے لیے سائنسی علم اور اصولوں کے ان گنت شعبے کھولے ہیں کیوں کہ اس میں قدرتی اور نفسیاتی مظاہر کی ٹھیک ٹھیک تحقیق کرنے کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ''آفاقی عالم اور خود ان کی ذات میں'' (سورہ حٰم السجدہ آیت ۵۳) خدا کی نشانیوں پر غور کرنے کی ہدایت کی گئی ہے جو صحیح علمی ریسرچ کا نقطہ آغاز ہے۔ اسی طرح محمد اقبالؒ کے نزدیک خود حضور رسالت مآبؐ نفسی تجزیے کے پہلے مبصر ہیں۔ ایک حدیث شریف کے مطابق حضورؐ نے ایک پاگل یہودی لڑکے (ابن صیاد۔ مترجم) کی حالت دیکھنے میں دل چسپی ظاہر کی تھی۔ علم کے لیے اسی پیاس کے نتیجے میں آں حضرتؐ مطالعے اور ریسرچ کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ (Reconstruction of Religious Thought in Islam, p.17)۔ رسول کریمؐ کے اس رویے کی تشریح تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے شروع میں کر دی گئی ہے:

اسلام میں عقلی بنیادوں پر تحقیق کا آغاز خود نبی کریمؐ کی ذاتِ اقدس سے ہو گیا تھا۔ آپؐ مسلسل یہ دعا کرتے:
''خدایا! مجھے اشیا کی حقیقی ماہیت کا علم عطا کر!''(Reconstruction of Religious Thought in Islam, p.3)۔

محمد اقبالؒ نے پیام مشرق میں شعری زبان میں اپنے اس یقین کا اظہار اس طرح کیا ہے:

سید کل، صاحب ام الکتاب
پردگیہا بر ضمیرش بے حجاب
گرچہ عین ذات را بے پردہ دید
رب زدنی از زبان او چکید

ترجمہ: وہ سب کے آقا، ام الکتاب کے مالک
ان کے باطن پر سب مخفی چیزیں بے حجاب ہیں
اگر چہ حضورؐ نے عین ذات کو بے پردہ دیکھا
پھر بھی آپ کی زبان سے یہی نکلا کہ اے میرے پروردگار اس نعمت میں اضافہ فرما

یہ اشعار افغانستان کے اس وقت کے بادشاہ امان اللہ خان میں علمی تحقیق اور سائنسی سرگرمیوں میں دل چسپی پیدا کرنے کے لیے آتشِ شوق سلگھانے کی غرض سے لکھے گئے تھے۔ تعلیم کے مسئلے کے ضمن میں محمد اقبالؒ کا جواب اس وقت زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے جب ہمیں بیشتر اسلامی ملکوں کے ان ملاؤں کا روایتی رویہ یاد آ جاتا ہے جو ''دنیاوی'' علم حاصل کرنے کے سخت مخالف تھے اور مغرب کے سائنسی طریقوں سے واقفیت کو شیطانی فعل قرار دیتے تھے۔ لیکن محمد اقبالؒ نے اپنے پیشرو جدت پسندوں کے نظریات کی پیروی کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ سائنسی علوم کو قرون وسطیٰ کے دوران مسلمان مفکر اور طبیعیات اور علم ہیئت کے ماہرین ہی یورپ لے گئے تھے، یورپ نے ان علوم کو ترقی دے کر موجودہ سطح پر پہنچایا۔ چناں چہ یہ علوم مسلمانوں کا ورثہ ہیں اور انہیں ملت اسلامیہ کی بہبود کے لیے استعمال کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔

اس کے ساتھ ہی محمد اقبالؒ کہتے ہیں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ختم نبوت سے سائنسی تحقیق اور سائنسی دنیا کے نقطہ نظر کی نئی راہیں وا ہو گئی ہیں۔ اسی بنا پر ان کے حد درجہ انقلابی شارح اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں خاکسار کے عسکریت پسند اسلامی گروہ کے بانی عنایت اللہ مشرقی اس معاملے میں اس قدر آگے چلے گئے ہیں کہ انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ ماڈرن سائنس دان رسول کریمؐ کے سچے وارث ہیں۔ (Beljon: Modern Muslim Koran Interpretation, p.73)۔ ان کے کچھ دیر بعد محمد اقبالؒ کی فکر کے ایک مفسر غلام احمد پرویز نے یہ دعویٰ کیا کہ صرف نبوت کا دروازہ، جو حضورؐ کے کارناموں کا ''ذاتی'' پہلو ہے، بند ہوا تھا جب کہ رسالت یعنی ''نظریے'' کا منصب مسلمانوں کے لیے کھلا چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ وہ اس پر عمل اور اس کی تشریح کر سکیں۔ (Beljon: Modern Muslim Koran Interpretation, p.73)۔
چناں چہ محمد اقبالؒ نے ختم نبوت کی جو تشریح کی، اس کے نتیجے میں بعض ترقی پسند حلقوں نے غیر متوقع نتائج اخذ کر لیے

اور ہندوستان میں بائیں بازو کے کئی لوگوں نے درج بالا پیراگراف سے اس سے بھی زیادہ دوررس نتائج برآمد کر لیے اور اسے غلط معانی پہنا کر زندگی میں کسی پیغمبرانہ رہنمائی سے اغماض برت کر خالصتاً سائنسی نقطۂ نظر اختیار کرنے پر زور دیا۔ اس طرح ایسے مصنفوں نے سائنسی دنیا کا مارکسسٹ نظریہ متعارف کرانے کی حمایت شروع کر دی۔ (Khalid: A Terrorist Looks at Islam)۔ محمد اقبالؒ اپنے لفظوں کی ایسی ملحدانہ تعبیر سے گھبرا گئے کیوں کہ انہوں نے ایک اور اقتباس میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خاتم النبیین کی حیثیت کے سلسلے میں اپنا نقطۂ نظر پوری طرح واضح کر دیا تھا:

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد کسی شخص کے لیے خدا کے سامنے اپنی ذات سے روحانی طور پر دست بردار ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپؐ نے اپنے پیروکاروں کو ایک قانون دے کر، جو انسانی شعور کی گہرائیوں سے ظہور پذیر ہوا ہے، عقل یا اخلاقی محکومیت سے نجات دلائی ہے۔ مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اسلام، جو سماجی اور سیاسی تنظیم کا نام ہے، ہر لحاظ سے کامل اور دائمی ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد کوئی وحی، جس کی تردید الحاد سے مشروط ہو، ممکن نہیں ہے۔

ان الفاظ کا رخ قادیانیوں کی جدت پسند تحریک کی طرف تھا جو انیسویں صدی کے آخر میں پنجاب میں شروع ہوئی تھی اور جس کے بانی مرزا غلام احمد نے رسول کریمؐ کی شان میں بعض گستاخانہ الفاظ کہے تھے یا مسیح ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ محمد اقبالؒ نے پوری قوت کے ساتھ اس تحریک کا مقابلہ کیا کیوں کہ انہیں حضورؐ کے خاتم النبیین ہونے کا پورا یقین تھا:

مجھے کامل یقین ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے آخری پیغام کو اس حقیقی عنصر کی حیثیت حاصل ہے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان حدِ فاصل کھینچتا اور ایک شخص کو یہ فیصلہ کرنے کے قابل بناتا ہے کہ آیا کوئی فرد یا گروپ ملتِ اسلامیہ کا حصہ ہے یا نہیں؟ ...... ہمارے ایمان کے مطابق خدا نے اسلام کو وحی کے ذریعے نازل کیا البتہ ایک معاشرے کی حیثیت سے اسلام کی بقا کا انحصار مکمل طور پر نبی کریمؐ کی شخصیت پر ہے۔

(Open Letter to Pandit Nehru)۔

محمد اقبالؒ کی تمام مطبوعہ تحریروں میں رسول کریمؐ کے سیاسی رول کے بارے میں غالباً یہ سب سے واضح تعریف ہے۔ ان کی طرف سے قادیانیوں اور احمدیوں (یہ گروپ ۱۹۱۴ عیسوی میں ایک زیادہ لبرل فرقے کی صورت میں قادیانیوں سے علیحدہ ہو گیا تھا) کے ساتھ نفرت اور بیزاری کا اظہار ایک نظم میں بھی کیا گیا ہے جس میں وہ ''جہاد'' کے نظریے کو جھٹلانے اور مسیح اور مہدی سے متعلق بے مقصد مسئلوں پر غور و فکر کرنے والوں پر غم و غصہ ظاہر کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں حضورؐ کی ذات پر پورا پورا بھروسا تھا چناں چہ وہ کہتے ہیں:

خراب جرأتِ آں رندِ پاکم
خدا را گفت ما را مصطفیؐ بس

ترجمہ: میں اُس پاک باز رند کی جرأت پر قربان جاؤں
جس نے خدا کو کہا کہ ہمارے لیے مصطفیؐ کافی ہیں

یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ ایک ممتاز قانون دان اور احمدی فرقے کے رکن سر ظفر اللہ خان نے اپنی کتاب Islam میں Muhammad The Excellent Exampler کے عنوان سے ایک باب باندھا ہے جو انہوں نے دلی عقیدت کے ساتھ لکھا ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کٹر عقاید رکھنے والے مسلمانوں کے لیے یہ کتاب کیوں قابلِ قبول نہیں؟ ۱۹۷۵ عیسوی میں جب قادیانیت کو غیر مسلم فرقہ قرار دیا گیا تو محمد اقبالؒ یہ جان کر یقیناً خوش ہوئے ہوں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو محمد اقبالؒ کے افکار اور شاعری میں مرکزی حیثیت حاصل ہے اور انہوں نے اس ضمن میں جو استعارے، تشبیہیں اور کنائے استعمال کیے ہیں، ان کا نئی روشنی میں جائزہ لینا چاہیے۔ چناں چہ انہوں نے اپنی شاعری میں ''عشق'' کا جو لفظ استعمال کیا ہے، اس سے مراد حضورؐ کے ساتھ عشق ہے کیوں کہ آپ عشقِ ربانی کا مظہر ہیں۔ اس سلسلے میں وہ رومیؔ اور دوسرے صوفیہ حضرات کے صحیح جانشین نظر آتے ہیں۔ بالِ جبریل کی پختہ اردو نظم ''مسجدِ قرطبہ'' میں ''عشق'' کا لفظ بار بار دہرایا گیا ہے جس کا مطلب ''عشقِ مصطفیؐ'' ہے:

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیؐ
عشق خدا کا رسولؐ، عشق خدا کا کلام!

ہندوستان کے بہت سے پیشرو شاعروں کی طرح محمد اقبالؒ بھی اپنے کلام میں عرب، نجد اور حجاز کا اکثر ذکر کرتے ہیں جس سے مراد ''عربی دوست'' ہے۔ اس کی ایک مثال ''ترانہ ملی'' ہے جو اس صدی کے ابتدائی برسوں میں لکھا گیا تھا:

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

اس کے بعد وہ یہ الہامی شعر کہتے ہیں:

اقبالؔ کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

یہ الفاظ محمد اقبالؒ کے پہلے شعری مجموعے بانگِ درا سے ماخوذ ہیں جن سے حضور رسالت مآبؐ کے ساتھ شاعر کے گہرے قلبی تعلق کی عکاسی ہوتی ہے، وہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اونٹ کی ٹانگ کے ساتھ بندھی ہوئی گھنٹی کی حیثیت سے خوابیدہ مسلمانوں کو مقدس مقام مکہ معظمہ کی طرف واپس لے جانے کے لیے ان کی رہنمائی کرتے ہیں اور مسلمانوں پر زور دیتے ہیں کہ وہ یورپی زندگی کی چمک دمک اور فارسی کے صوفیانہ خوابوں کے گلاب کے معطر باغوں کو پیچھے چھوڑ کر رسول کریمؐ کے اسوہ حسنہ کی پیروی کریں۔

محمد اقبالؒ کے کلام میں نبی کریمؐ کی حیات مقدسہ کے دینی، سیاسی، سماجی اور تصوفانہ پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ زندگی کے آخری برسوں میں وہ ایک مرتبہ پھر اپنے قابلِ اعتماد، محبوب اور ڈھارس بندھانے والے دوست کی طرف رجوع کرتے اور اپنے آبائی وطن پنجاب کے لوک شاعروں کی طرح سادہ لفظوں میں حضورؐ کے روضہ اقدس پر حاضری دینے کی آرزو ظاہر کرتے ہیں:

باایں پیری رہِ یثرب گرفتم
نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام
کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

ترجمہ: میں اس بڑھاپے میں یثرب کے راستے پر چلا
عاشقانہ سرور میں گیت گاتا
اس پرندے کی طرح جو صحرا میں شام پڑتے ہی
اپنے گھونسلے کے خیال سے پر کھولتا ہے

اور ایک ناقابل فراموش تشبیہ کے ذریعے وہ بھی لاکھوں کروڑوں پاکباز مسلمانوں کی طرح، جو صدیوں سے آں حضرتؐ کے ساتھ دلی عقیدت کا اظہار کرتے چلے آئے ہیں، نبی کریمؐ کی بے مثال شخصیت کے ساتھ بے پناہ عقیدت کو ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

ترجمہ: یثرب کی سرزمین دونوں جہانوں سے زیادہ اچھی ہے
کتنا مبارک ہے وہ شہر جہاں محبوب ہے

اشاریے

شخصیات

اماکن

❁……❁……❁

کتب ورسائل

❋……❋……❋

ادارے

مغربی اسکالرز مسلمانوں کی روزمرہ زندگی میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہم رول کو عموماً نظرانداز کر دیتے ہیں جس کے نتیجے میں مغربی دنیا اس نکتے کا ادراک نہیں کر سکی۔ این میری شمل نے مختلف زبانوں کے اصل ماخذوں کو استعمال کر کے مسلمانوں کی زندگی، تصوفانہ افکار اور شاعری میں رسول کریمؐ کے مرکزی مقام کی وضاحت کی ہے۔

''۱۹۵۰ء کے عشرے میں ترکی میں قیام کے دوران یہ حقیقت مجھ پر آشکار ہوئی کہ ترک مسلمان اپنے پیغمبرؐ کی ذات اقدس کے ساتھ کس قدر محبت کرتے ہیں۔'' فاضل مصنفہ لکھتی ہیں: ''اس مشاہدے کی بنیاد پر میں جہاں بھی گئی، میں نے شاعری اور لوک روایات پر مبنی معلومات اکٹھی کرنے کی کوشش کی چناں چہ یہ کتاب میری چالیس سالہ تحقیق کا ثمر ہے۔''

حضورؐ کے ساتھ مسلمانوں کی محبت اور عقیدت کو سمجھنے کے لیے آپؐ کی ذات سے عقیدت کی طویل تاریخ کو مدنظر رکھنا ضروری ہے جو اپنے آپ کو ''خدا کا بندہ سمجھتے تھے لیکن جن پر وحی نازل ہوتی تھی۔'' قرآن کریم کے مطابق آپؐ کو تمام مسلمانوں کے لیے اسوہ حسنہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر شمل نے آں حضرتؐ کی حیاتِ مقدسہ کے تمام پہلوؤں، ولادت، شادیوں، معجزوں اور سفر معراج پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے جن کا آپؐ سے عقیدت کا گہرا تعلق ہے۔

ایک کامل انسان ہونے کے ناتے حضورؐ کے کردار میں جو اعلیٰ محاسن پائے جاتے تھے، ان کا تذکرہ مسلمانوں کی نعتیہ شاعری میں موجود ہے۔ And Muhammad Is His Messenger میں ان محبت آمیز لوک کہانیوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن سے ترکی اور برصغیر ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے آپؐ کے ساتھ دلی عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح تصوف میں شمالی افریقا اور ایران کے مسلمان آں حضرتؐ کو خوب صورت ناموں سے پکارتے ہیں۔ صوفیہ حضرات کے بعض حلقوں میں آپؐ کو خدا کی ذات سے قرب کا وسیلہ سمجھا جاتا ہے اور مسلمانوں کے ایک بہت بڑے طبقے کے لیے یہ خیال ہی باعث تسکین ہے کہ آپؐ قیامت کے دن ان کی شفاعت کریں گے۔

تاریخی اعتبار سے عیسائی حضورؐ سے خوف زدہ تھے۔ شمل نے لکھا ہے کہ عیسائیوں نے اٹھارویں صدی میں آں حضرتؐ کی شخصیت کے بارے میں سنجیدہ نقطہ نظر اختیار کرنا شروع کیا۔ پچھلی صدی سے اسلام کے بانی اور سماجی اور سیاسی زندگی میں آپؐ کی حیثیت کے متعلق مغرب کا انداز فکر اب خاصا تبدیل ہو گیا ہے۔ این میری شمل نے شعری اقتباسات اور فنی اسلوب کی مدد سے مسلمانوں کی روزمرہ مذہبی عبادات کے تناظر میں اسلامی کلچر کے روشن پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

انگریزی زبان میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے جس میں پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ فاضل مصنفہ نے مثالیں دے کر جدید اسلامی زندگی میں نبی کریمؐ کے رول کی تشریح کی ہے جس سے آپؐ کی کثیر الجہات شخصیت کے متعلق مختلف رویوں کی وضاحت ہوتی ہے۔

ISBN: 978-8835-11-8